افریقہ میں پاکستانی

سابق سفیر **افتخار علی شیخ**

کا سفارت نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے۔ نہ کسی عجمی کو عربی پر۔ نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو گورے پر"

"سرور کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کے آخری خطبے سے اقتباس"

افریقہ میں پاکستانی

افتخار علی شیخ

جنگ پبلشرز

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ
ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے
خوبصورت اور معیاری مطبوعات

جملہ حقوق محفوظ

ناشر ـ میر شکیل الرحمٰن

اشاعت اول : جولائی 1992ء

تعداد : 500

قیمت : 175 روپے

زیر اہتمام و ادارت : مظفر محمد علی

پبلشر : جنگ پبلشرز
(جنگ انٹرپرائزز لمیٹڈ کا ذیلی ادارہ)

پرنٹر : جنگ پبلشرز پریس
13- سر آغا خاں روڈ لاہور

انتساب

اپنے بے حد شفیق و مہربان
مرحوم والدین کے نام

پروڈکشن	:	طاہراصغر
سرورق	:	انیس یعقوب
کاپی پیسٹر	:	سعید ساجد
کمپوزنگ	:	**احمد گرافکس**

فہرست

1-	یہ کتاب —— ڈاکٹر صفدر محمود	9
2-	پیش از گفتار	13
3-	شیخ صاحب آپ کو سفیر بنایا جا رہا ہے	19
4-	گھانا - محدود جمہوریت کا سفر	25
5-	عمدہ رشتوں اور ناطوں کے لئے جنتر منتر	35
6-	جیری رالنگ کے دو انقلابات	43
7-	منکسم کا حاجی احمد زکی	51
8-	غریب ملک - مفت تعلیم	59
9-	ایک سو بیس برس تاریخی مسجد ہم نے بیچ کھائی	69
10-	گھانا میں میرے تین سال	75
11-	ایک معصوم معاہدہ جو پذیرائی سے محروم ہے	97
12-	کماسی - آدم اور حوا سیاہ فام تھے؟	115
13-	اسانتی ہینی - ایک طاقتور سربراہ	125
14-	امام کعبہ کے ساتھ چند روز	137
15-	افغانستان میں آپ امریکہ کی جنگ لڑ رہے ہیں	151
16-	دیوتاؤں کی سرزمین	185
17-	تقریب اسناد سفارت سیرالیون	197
18-	سیرالیون ہماری ہی طرح غریب ہے	207
19-	لائبیریا	215
20-	جمہوریت پاکستانی سٹائل	221
21-	اسناد پیش کئے بغیر سفیر	233

22 - مغربی افریقہ ہمارا سوتیلا بھائی 245
23 - یونیسکو میں ہم کیوں ہار گئے 265
24 - ناکامی کا ہیٹ ٹرک
انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس 277
25 - جنرل ضیاء الحق پر الزام - مرزا طاہر احمد کا استقبالیہ
اور ذرائع ابلاغ 289
26 - وہ بھی تو اپنے بھائی بند ہی ہیں 303
27 - ہر ملکے راہر رسے 317
28 - حرف سپاس 335

یہ کتاب....

ڈاکٹر صفدر محمود

ہمارے یہاں سفارت کاروں کی طرف سے اپنی یادداشتیں تحریر کرنے کی کوئی قابل ذکر روایت بقول شاعر ہرچند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے۔ اب تک اس حوالے سے جو معدودے چند تصانیف سامنے آئی ہیں ان میں ایک آدھ استثنا کے ساتھ کوئی کاوش بھی ایسی نہیں جس میں لکھنے والے نے اپنے موضوع کے ساتھ حقیقی انصاف کیا ہو۔ چنانچہ کہیں تو ایسی تصانیف سفارت کار بہادر کی بزعم خود کامیابیوں کی طویل داستان سرائی کے نتیجے میں قصیدہ در مدح خود کی شکل اختیار کر گئی ہیں اور کہیں مختلف شہروں' سیرگاہوں اور تاریخی مقامات کے غیر ضروری طور پر بالتفصیل تذکروں نے انہیں معمول کے سفرناموں کا رنگ دے دیا ہے۔

افتخار علی شیخ اپنی زیر نظر تصنیف "افریقہ میں پاکستانی" میں اپنے پیشروؤں سے بڑی حد تک اور بعض مقامات پر مکمل طور پر مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ گھانا میں سفیر کے طور پر گزرے ہوئے ایام کا تذکرہ رقم کرتے ہوئے انہوں نے اپنے موضوع کے تقاضوں کی جس دقت نظر' احساس ذمہ داری اور نزاکت اظہار کے ساتھ تکمیل کی ہے اس کی توقع ان جیسے "غیر پیشہ ور ادیب" سے مجھے تو کم از کم نہیں تھی۔ پوری کتاب میں شیخ صاحب کی کسی بھی موضوع پر گرفت کمزور نہیں ہوتی۔ یہ ہنر انہوں نے شاید اپنے پیشہ وکالت سے سیکھا ہے کہ جو بات مخاطب تک پہنچانا چاہو وہی بیان کرو۔ کہیں کہیں ان کے اندر کا سیاح بیدار ہوا ہے۔ مگر سفارت کار نے اسے سلا دیا ہے۔

انداز بیان کی شگفتگی کہیں بوریت پیدا نہیں ہونے دیتی۔ حتیٰ کہ افریقہ کے ممالک کی تاریخ اور جغرافیہ بیان کرتے ہوئے بھی کہانی کہنے کا انداز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر شیخ صاحب کہانی لکھنا شروع کر دیں تو کئی افسانہ نگاروں کی دکانداری خطرے میں پڑ جائے گی۔ شیخ صاحب معلومات کا انبار نہیں لگاتے بلکہ قاری کو اپنا ہمسفر بنا لیتے ہیں۔ مغربی افریقہ میں بسنے والے مسلمان بھی اپنی "عادات حسنہ" میں اپنے پاکستانی بھائیوں سے مختلف نہیں چنانچہ کماسی کے امام کا تذکرہ —— اس امام نے سعودی عرب حکومت سے اسلامی تعلیمی ادارے کے نام پر زرِ خطیر لیا۔ زمین خریدی اور اس پر اپنا شاندار گھر تعمیر کر لیا بعد ازاں گھانا کی حکومت نے امام صاحب کو گرفتار کر لیا۔ مجھے یہ پڑھ کر اپنے کئی امام اور خطیب یاد آئے کہ ہمارے یہاں ایسے

واردا تتے "امام صاحبان" کھلے عام دندناتے پھرتے ہیں۔ افریقہ میں ملنے والا گنی وارم انسان کے جسم میں گھس کر جلد سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کیڑا ڈی جی خان میں بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی ہم گنی وارم کے علاوہ بھی کئی بیماریاں افریقہ کے ساتھ Share کرتے ہیں۔ صرف عوام کی حد تک نہیں حکمرانوں اور انداز حکمرانی میں بھی مضمون واحد ہے۔ لائبیریا کے سربراہ جنرل ڈاکٹر سیموئیل کے ڈو کا قصہ لیں۔ یہ صاحب صدر کے بینڈ میں ماسٹر سارجنٹ تھے۔ یعنی نان کمشنڈ آفیسر۔ صدر صاحب نے چھٹی کی درخواست منظور نہ کی انہوں نے کچھ فوجی اکٹھے کئے اور تختہ الٹ دیا خود کمانڈر انچیف بن گئے جنرل بھی۔ ڈاکٹر کی ڈگری جنوبی کوریا سے مل گئی۔ برسراقتدار آنے کے بعد انتخاب بھی کرائے مگر ایسے کہ سیاسی پارٹیاں رجسٹر ہوں گی قانون اتنا سخت اور پیچیدہ کہ صرف چھ جماعتیں درخواست دے سکیں ان میں سے صرف چار کو رجسٹر کیا گیا ان میں سے بھی دو کو الیکشن سے صرف ایک روز پہلے رجسٹر ہونے کی نوید دی گئی۔ چنانچہ الیکشن میں صدر مملکت کو پچانوے فیصد ووٹ پڑے ویسے وہاں بھی حکومتیں پہلے احتساب اور پھر انتخاب کا پروگرام پیش کرتی ہیں مگر ایسی مثالیں بھی ہیں۔ جن کی ہمارے ہاں روایت نہیں مثلاً برکینافاسو کے صدر کیپٹن سنکارا کی بیوی ان کے اقتدار میں آنے سے پہلے روڈ ٹرانسپورٹ کے محکمے میں ملازم تھی۔ خاوند کے اقتدار میں آنے کے بعد نہ تنخواہ بڑھی اور نہ ہی ترقی ملی۔

افتخار علی شیخ کا یہ سفارت نامہ دراصل ایک سچے پاکستانی کی تحریر ہے۔ وہ اپنا پاکستانی ہونا تو کیا مسلم لیگی ہونا بھی نہیں بھولے۔ اس حوالے سے میرا اور ان کا درد مشترک ہے۔ چنانچہ وہ برکینافاسو کے ڈاک کے ٹکٹ پر قائداعظم کی تصویر شائع کروا کے اور ایک دور افتادہ علاقے کے قبائلی سردار کی گیلری میں بابائے قوم قائداعظم کی تصویر آویزاں کروا کے اتنے خوش نظر آتے ہیں جیسے انہیں اسلام آباد میں کوئی کارنر پلاٹ مل گیا ہو۔

ہر دردمند پاکستانی کی طرح "ارباب اختیار" کی حرکتوں پر وہ بھی کڑھتے ہیں۔ اور صرف یہی مقام ہے جہاں "افریقہ میں پاکستانی" میں تلخی احساس کا ذائقہ ملتا ہے۔ ایسے مواقع عام طور پر دفتر خارجہ کے ذکر کے حوالے سے آئے ہیں۔ شیخ صاحب نے نہایت افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ دفتر خارجہ نے قائداعظم کی تصویر کو ٹکٹ پر شائع کرنے پر برکینا فاسو کا رسمی شکریہ تک بھی ادا نہیں کیا۔ افریقہ کے ممالک خصوصاً مغربی افریقہ میں تجارتی امکانات میں عدم دلچسپی کے رویئے پر وہ بہت تلخ نوا ہیں۔ شیخ صاحب نے یہ کتاب لکھ کر باضابطہ ادیبوں کی فہرست میں نام تو لکھوا لیا ہے۔ لیکن وزارت خارجہ پر تنقید سے ممکنہ سفیروں کی فہرست سے ہمیشہ کے لئے اپنا نام کٹوا لیا ہے۔ یہ تو شیخ صاحب ہی بتا سکیں گے کہ یہ سودا کیسا رہا۔

افتخار علی کی اس تحریر میں مسلمانوں کی تہذیب (خصوصاً مغربی افریقہ میں) کے مٹنے کا نوحہ بھی ہے۔ وہ نہایت درد دل کے ساتھ قارئین کو بتاتے ہیں کہ سیرالیون کے صدر جوزف سیدو موموح دراصل یوسف سعید محمد تھے۔ اور گھانا کے ایک سابق صدر ہل لیمان دراصل ہلال ایمان تھے۔

میری تجویز ہے کہ یہ کتاب ارباب اقتدار کو ضرور پڑھائی جائے تاکہ وہ جان سکیں کہ کس طرح قومی مفادات سے روگردانی کی جاتی ہے۔ اور کیسے اچھے منصوبے فائلوں کے انبار میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً گھانا اور پاکستان کے درمیان تجارتی معاہدہ چودہ برس سے زیرالتوا ہے۔ اور پاکستان کی برآمدات کو فروغ دینے والے اداروں کی فائلوں میں گھانا اور مغربی افریقہ کے دیگر ممالک کے متعلق سرے سے کوئی کوائف موجود نہیں ہیں۔

یہ کتاب اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہے میں اسے ایک نئی صنف کے آغاز کی طرف اشارہ سمجھتا ہوں۔ اور اسے "سفارت نامہ" کا نام دیتا ہوں۔

شیخ صاحب نے اپنی خدمات کا ذکر بھی کیا ہے۔ جو انہوں نے بحیثیت سفیر پاکستان اور پاکستان کے موقف کی پذیرائی کے حوالے سے کیں۔ مگر احساس تفاخر کے ساتھ نہیں بلکہ اظہار امرواقعہ کے طور پر اور اس میں کہیں خودستائی کا پہلو نہیں آیا۔ البتہ یہ احساس ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمیں سب سفارت خانوں میں ایسے سفیر میسر آجائیں تو بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے لئے ناقابل یقین کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

20 جون 1992

پیش از گفتار

افتخار علی شیخ

بعض اوقات کسی آسان سے سوال کا جواب بھی ذہن میں نہیں آتا مجھے جب پوچھا گیا کہ میں نے "افریقہ میں پاکستانی" کیوں لکھی ہے تو مجھ سے اس آسان سوال کا جواب بن نہ پڑا۔ عزیزی طاہر اصغر نے جب مجھے بتایا کہ انہیں اس سوال کا جواب جلد از جلد چاہئے تاکہ وہ اسے زیر نظر کتاب میں شامل کر سکیں تو مجھے اس سوال کے جواب کی اہمیت کا احساس ہوا۔ جواب کے لئے ذہن پر بہت زور ڈالا مسودے کو ایک بار پھر دیکھا لیکن ان عوامل کا کوئی سراغ نہ ملا۔ جنہوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی تحریک دی۔ عزیزی طاہر اصغر کے حکم کے خلاف میں نے جنگ پبلشرز کے انچارج برادرم مظفر محمد علی سے رجوع کیا تو انہوں نے بھی اس بات پر زور دیا کہ قارئین جاننا چاہیں گے کہ "آپ نے یہ کتاب کیوں لکھی ہے" میں نے ان سے بہت معذرت کی کہ میں شاید اس سوال کا شافی جواب نہ دے سکونگا۔ لیکن وہ مصر رہے کہ اس سوال کا جواب کتاب میں شامل کرنا ضروری ہے۔

اس کتاب کے لکھنے کی اصل وجہ تو شاید میرے لاشعور میں کہیں دبی ہوئی ہے اور اگرچہ میں نے اسے بارہا کریدا اور اس سوال کا جواب چاہا لیکن اس نے میرے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

میں 20 جولائی 1986 سے 20 جولائی 1989ء تک گھانا کے صدر مقام عکرہ میں مقیم رہا۔ اس دوران مجھے گھانا کے پانچ ہمسایہ ممالک میں اکثر جانا آنا ہوتا تھا۔ یہ ممالک سیرالیون' لائبیریا' برکینافاسو' ٹوگو اور آیوری کوسٹ افریقہ کے مغربی ساحل کے سب ریجن میں واقع ہیں۔ جب مجھے اس سب ریجن کے ملک گھانا میں سفیر مقرر کیا گیا تو تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے میں ان ممالک سے متعارف نہ تھا۔ صرف گھانا کا نام سنا ہوا تھا۔ وہ بھی کوامے نکروما کے حوالے سے۔ باقی ممالک کے بارے میں میری

معلومات صفر تھیں۔ پاکستان سے روانگی سے پہلے مجھے تاثر دیا گیا تھا کہ یہ ممالک بے حد پس ماندہ ہیں۔ اتنے پس ماندہ کہ انہیں ترقی پذیر بھی نہیں کہا جا سکتا یہ بھی بتایا گیا کہ یہ سب ریجن ڈارک افریقہ (DARK AFRICA) کا ایک حصہ ہے جو روبہ ترقی ہونے کی بجائے روبہ زوال ہے۔ یہاں لوگ غریب اور غیر مہذب ہونے کے علاوہ جرائم پیشہ بھی ہیں پورا علاقہ اقتصادی' معاشی' سیاسی اور اخلاقی زبوں حالی کا شکار ہے۔ اور تقریباً ہر وقت خونی انقلابات کی زد میں رہتے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیا کم ملتی ہیں۔ ملیں تو بے انتہا گراں قیمتوں پر۔ ڈاک تار فون کا نظام دگرگوں ہے۔ پانی اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ عام ہے۔ پانی پینے کے قابل نہیں ہے غرضیکہ یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ بقول ایک انگریز مصنف کے اس سب ریجن کو GOD'S BACK YARD یعنی "اللہ میاں کا پچھواڑا" کہنا زیادہ مناسب اور درست ہے۔ میں یہاں تین سال رہا۔ اس دوران یہاں کے لوگوں سے رابطہ ہوا۔ تو محسوس ہوا کہ یہ بھی اپنے ہی بھائی بند ہیں۔ ہمارے ہاں تو محکومی کا دور تقریباً دو صدیوں پر محیط رہا لیکن اس سب ریجن میں تو ظلم و استبداد کا دور چار صدیوں سے زائد عرصے کا تھا۔ ان لوگوں کی محکومی اور محرومی کی داستاں چار صدی پہلے سے شروع ہوئی تھی۔ اور بیسویں صدی کے وسط میں اس وقت اس کے اختتام کے آثار نظر آنے شروع ہوئے جب 1957ء میں گولڈ کوسٹ (موجودہ گھانا) کی آزادی نے افریقہ پر آزادی کے دروازے کھول دیئے۔ غلامی اور محرومی کی وراثت ان ممالک کے حصے میں تناسب کے لحاظ سے اتنی ہی آئی جتنی کہ ہمیں ملی ہے۔ البتہ جیسا کہ میں نے دیکھا چند ایک معاملات میں یہاں کے لوگ ہم سے بہتر ہیں۔ انہوں نے غربت اور مفلسی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے۔ وسائل کی کمی کو ایک تلخ حقیقت کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ اپنی انفرادی محرومیوں اور افلاس کو دور کرنے کے لئے قومی و ملکی مفاد کو قربان نہیں کرتے۔ قانون کو ہاتھ میں نہیں لیتے۔ قومی املاک کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ قناعت پسند ہیں انہوں نے اپنی ضروریات و خواہشات کو محدود کر لیا ہوا ہے۔ روٹی کپڑا اور مکان ان کے لئے بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنے کہ ہمارے لئے لیکن ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے غیر

قانونی اور ناجائز ذرائع کا استعمال تقریباً مفقود ہے۔

عام طور پر لوگ امن پسند ہیں۔ اس کے باوجود مجھے وطن عزیز اور اس سب ریجن کے لوگوں میں بے حد مماثلت محسوس ہوئی شاید اس وجہ سے اور غلامی کی وراثت میں ملی ہوئی مشکلات کے ادارک نے مجھے تحریک دی کہ میں اپنے ہم وطنوں کو اپنے مشاہدات اور تاثرات میں شامل کروں۔ اس کتاب کے تحریر کرنے میں شاید میرے اس جذبے کو بھی دخل ہے کہ ہم خواہ مخواہ ایک احساس برتری میں مبتلا ہیں۔ وگرنہ ہم بھی تو اتنے ہی پس ماندہ ہیں جتنا کہ افریقہ کا یہ سب ریجن۔ اور اس تحریر کے ذریعے میں نے اپنے ہم وطنوں کو یہ پیغام دینا چاہا ہے کہ ہمارا احساس برتری بے جا اور ناجائز ہے۔

یا پھر میں مختصر مدت پر محیط اپنے تجربے کے دوران دفتر امور خارجہ پاکستان کے اس رویئے سے تلخی کا شکار ہو گیا ہوں جو اسلام آباد میں پالیسی ساز اس سب ریجن سے بالخصوص اور براعظم افریقہ سے بالعموم روا رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ ہمارا ایڈہاک ازم، تجاہل اور قومی مفادات سے بے اعتنائی کے علاوہ کچھ نہیں اور میں نے اپنی تلخی کو ریکارڈ پر لانا ضروری سمجھا ہے۔

میں نے اپنے تئیں ان عوامل کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے جو زیر نظر کتاب کے محرک بنے۔ لیکن شاید میں اب بھی اس سوال کا جواب نہیں دے پایا جو عزیزی طاہر اصغر نے پوچھا تھا۔ بہرحال کتاب لکھنے کے محرکات جو بھی ہوں آپ اس کتاب کو دلچسپ پائیں گے۔

کتاب میں مندرجہ واقعات اور زبان و بیان کی صحت کی ذمہ داری سراسر مجھ پر ہے۔

۲۰ جولائی ۱۹۹۲ء

لاہور

14 اگست 1986 پاکستان کے سفیر افتخار علی شیخ سفیروں کے رجسٹر میں دستخط کر رہے ہیں کوامے نکرومہ کا مجسمہ سامنے نظر آ رہا ہے۔

"شیخ صاحب! آپ کو سفیر بنایا جا رہا ہے"

یہ دسمبر ۱۹۸۶ء کی بات ہے کہ ہمارے رفقائے کار غلام حیدر وائیں' سید سلیم حسین قادری اور میں رات کھانے پر رانا محمد اشرف کے یہاں جمع تھے کہ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی رانا محمد اشرف نے فون وصول کیا اور مجھے ریسیور پکڑا دیا۔ فون پر محمد خان جونیجو وزیراعظم پاکستان مجھے یاد کر رہے تھے ان کے اور میرے درمیان علیک سلیک کے بعد اس طرح گفتگو ہوئی۔

سائیں ۔ اس وقت آپ کیا کر رہے ہیں؟

میں ۔ جی! میں کھانا کھا رہا ہوں۔

سائیں ۔ کیا آپ بیرون ملک پاکستان کی خدمت کے لئے تیار ہیں؟

میں ۔ جی! ہاں! ضرور! کیوں نہیں۔

سائیں ۔ تو پھر ٹھیک ہے ہم آپ سے دو ہفتوں کے بعد پھر بات کریں گے!

میں ۔ شکریہ جناب۔

اس مختصر گفتگو کے بعد میں پھر کھانے کی میز پر بیٹھ گیا اس دوران میرے یہ تینوں احباب متجسس نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے وہ جاننا چاہتے تھے کہ میرے اور محمد خان جونیجو کے درمیان کیا گفتگو ہوئی مگر میں خاموش رہا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب قہوے کا دور چلا تو رانا محمد اشرف سے نہ رہا گیا آخر انہوں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا'

میں نے انہیں بتایا کہ جونیجو صاحب مجھے کسی قومی خدمت پر مقرر کرنا چاہتے ہیں وہ شاید اقوام متحدہ میں پاکستانی مشن کے ہمراہ مجھے کوئی منصب تفویض کریں گے۔

سید سلیم حسین قادری کا خیال تھا کہ مجھے شاید کسی ملک میں پاکستان کا سفیر بنایا جائے گا غلام حیدر وائیں نے بھی ان کے خیال کی تائید کی مگر کوئی حتمی اور یقینی بات نہ سامنے آئی دوسرے روز جب میں اپنے دفتر پہنچا تو میں نے وہاں خفیہ پولیس کے ایک سب انسپکٹر کو اپنے انتظار میں بیٹھے پایا۔

سب انسپکٹر موصوف میرے ایک عزیز دوست خادم حسین ملک کے بہنوئی ہیں۔ میرا خیال تھا۔ کہ وہ شاید اپنے کسی ذاتی کام کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں وہ پہلے بھی کبھی کبھار آتے رہتے تھے۔

اس وقت انکے اور میرے درمیان مختصر گفتگو ہوئی

میں - آیئے ملک صاحب کیسے تشریف لائے ہیں۔

سب انسپکٹر - آج تو میں سرکاری حیثیت میں آیا ہوں وزیراعظم سیکرٹریٹ سے فوری تعمیل کے لئے فون آیا ہے آپ کے کوائف آج ہی ـــــ اسلام آباد بھیجنے ہیں۔

میں - کیوں بھئی ایسی کیا جلدی ہے بیٹھو چائے پیو۔ کوائف بھی مل جاتے ہیں۔

سب انسپکٹر - آپ اپنے کوائف ٹائپ کروا دیں۔ ڈی ایس پی صاحب نے تاکید کی ہوئی ہے۔

اسی اثنا میں فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف ڈی ایس پی بات کر رہے تھے۔

ڈی ایس پی - جناب میرا آدمی آپ کے پاس آیا ہوا ہے اسے جلدی فارغ کر دیں۔

میں - جی آپ کا آدمی میرے پاس ہے پانچ منٹ میں فارغ ہو جائے گا ویسے مجھے یہ بتا دیں کہ یہ معاملہ کیا ہے۔

ڈی ایس پی۔ کمال ہے شیخ صاحب آپ کو سفیر بنایا جا رہا ہے اور آپ کو خبر ہی نہیں۔ آپ اپنے کوائف دیتے ہوئے اپنی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل لکھ دیں لیکن آج ہی یہ تکلیف کریں ہمیں شام تک آپ کا بائیو ڈاٹا اسلام آباد بھیجنا ہے۔

مجھے یاد آیا کہ کچھ برس پہلے وزارت داخلہ نے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں بھی میرے کوائف لئے تھے نتیجتا میرا نام تمام سرکاری نیم سرکاری

محکموں کمپنیوں اور بنکوں کے مشیر کی حیثیت سے خارج کر دیا گیا تھا۔
میں نے ماضی کے اس واقع کا ذکر کیا تو ڈی ایس پی نے ہنس کر کہا۔
نہیں جناب ایسا کوئی واقعہ اب نہ ہو گا آپ واقعی سفیر کے طور پر جا رہے ہیں۔
لیجئے! سید سلیم حسین قادری اور غلام حیدر وائیں کا خیال درست ثابت ہوا۔
مگر سردست یہ علم نہ ہو سکا کہ مجھے کس ملک میں سفیر بنا کر بھیجا جائے گا میں نے جب اپنی تقرری کا ذکر اپنے اہل خانہ سے کیا تو وہ بے حد خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدۂ شکر ادا کیا کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے ملکی اور قومی خدمت کے لئے مجھے سفارت کے منصب پر فائز کیا ہے۔
میرا خیال تھا کہ ضابطے قاعدے پورے کرنے کے لئے ابھی کچھ وقت لگے گا مگر بمشکل ابھی دو تین دن ہی گزرے ہوں گے کہ وزارت خارجہ اسلام آباد سے فون پر ڈائریکٹر جنرل نے مجھ سے پوچھا۔
ڈائریکٹر جنرل ۔ آپ اسلام آباد کب تک آ رہے ہیں؟
میں ۔ خیال ہے کہ جب موسم سرما کی چھٹیاں ہوں گی تب آؤں ۔
ڈائریکٹر جنرل۔ نہیں! آپ ان دنوں ہی تشریف لے آئیں۔ ضابطے قاعدے کے مطابق ابتدائی کاروائی کے لئے آپ کا یہاں موجود ہونا ـــــ ضروری ہے آتے ہوئے اپنی تصویریں اور مکمل کوائف لیتے آئیں
میں نے اسلام آباد پہنچنے کی حامی بھرلی ۔
ڈائریکٹر جنرل سے مل کر خود مجھے بھی سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا تھا کہ مجھے کس ملک میں پاکستان کی سفارت کےجوفرائض انجام دینے ہیں ـــــ وہ فرائض کیا کیا ہیں اور اس کی مراعات کیا کیا ہیں وغیرہ وغیرہ ۔
میں ابھی اسلام آباد جانے کی تیاریوں میں ـــــ تھا کہ حسن اتفاق سے ڈائریکٹر جنرل اسلام آباد سے لاہور آکر اپنے عزیزوں کے یہاں مہمان ہوئے اور چند روز قیام کیا میری دعوت پر ایک روز وہ میرے یہاں بھی تشریف لائے اور انہوں نے ـــ بتایا

کہ مجھے گھانا (مغربی افریقہ) میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا ہے۔ موصوف کے ساتھ میری ملاقات کوئی تین گھنٹے تک جاری رہی گفتگو کے دوران انہوں نے گھانا میں اپنے تجربات، سے بھی مجھے آگاہ کیا اور بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔ موصوف خوش اخلاق، ملنسار، صاف گو اور نہایت شائستہ مزاج آدمی ہیں۔

یہ بھی موصوف ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ میرے پیشرو جناب محمد راول وریامانی ایک مدت سے کوشاں تھے کہ انہیں گھانا سے کسی اور ملک میں سفارت پر مقرر کر دیا جائے چنانچہ انہیں یونان میں سفیر مقرر کیا جا رہا ہے اور ان کی جگہ مجھے گھانا بھیج رہے ہیں۔

گھانا کے بارے میں ڈائریکٹر جنرل موصوف کی رائے کچھ اچھی نہ تھی انہوں نے بلا تامل مجھ سے کہا کہ میں وزیراعظم سے کہہ کر گھانا کے سوا کسی اور ملک میں سفیر ہو جاؤں کیونکہ گھانا کی نہ آب و ہوا اچھی ہے نہ کھانے پینے کی اشیاء باآسانی ملتی ہیں نہ ہی آمدورفت ـــــ کا کوئی معقول انتظام ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ علاقہ انتہائی پسماندہ اور دور افتادہ واقع ہوا ہے حتیٰ کہ پاکستان سے آنے جانے میں ایک ہفتہ لگ جاتا ہے رسل و رسائل اور ڈاک وغیرہ کا انتظام انتہائی ناقص ہے اور محدود ہے حالت یہ ہے کہ جو خط پاکستان سے گھانا بھیجتے ہیں وہ ایک مہینے سے پہلے مکتوب الیہ کو نہیں مل سکتا' رہا ٹیلیفون کا سلسلہ تو وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

الغرض گھانا کے بارے میں موصوف نے جو معلومات مجھے مہیا کیں وہ کسی طرح بھی حوصلہ افزا نہیں تھیں لیکن میں بددل نہ ہوا میں نے مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے تگ و دو شروع کر دی چنانچہ اس سلسلے میں میری ملاقات مس۔ ایس۔ کے جان سے بھی ہوئی جو میرے پیشرو سے بھی پہلے گھانا میں پاکستان کی سفیر تھیں اور انہوں نے وہاں چار سال گزارے تھے۔

محترمہ ایس۔ کے جان صاحبہ نے دو گھنٹے کی ایک طویل ملاقات میں مجھے گھانا اور اس کے گرد و نواح کے حالات سے تفصیلی طور پر آگاہی بخشی۔ ان کے مطابق

پورے مغربی افریقہ میں کوئی سہولت ایسی میسر نہیں آتی جس کے ہم پاکستان میں عادی ہیں آب وہوا گو کم گرم ہے تاہم بے حد مرطوب ہے بارشوں کا سلسلہ سال بھر میں کم و بیش آٹھ مہینے تک جاری رہتا ہے وہاں نہ بجلی کا نظام صحیح ہے' نہ پانی کی ترسیل کا نظام درست جب وہاں بجلی کی سپلائی بند ہو جاتی ہے تو اس کے بعد آب رسانی کے نظام کی اصلاح اور درستگی میں کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ اب اس سے اندازہ کر لیجئے کہ وہاں کیا عالم ہو گا' جہاں بجلی اور پانی کے لئے لوگ اکثر ترستے رہتے ہیں۔

محترمہ ایس کے جان نے رسل و رسائل اور آمدورفت کے ذرائع کا جو نقشہ کھینچا اس کے مطابق سڑکوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سڑکیں کچھ تو مسلسل بارشوں کے پانی میں بہہ گئیں اور کچھ ایک عرصے تک دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث ٹوٹ پھوٹ گئیں جس سے ان پر سفر سخت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ اگرچہ مسافت کے لحاظ سے پاکستان اور گھانا کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا امریکہ اور پاکستان کے درمیان مگر اس کے باوجود امریکہ اور پاکستان کے درمیان سفر بہت آسان لگتا ہے جبکہ گھانا اور پاکستان کے درمیان سفر بہت دشوار اور طرح طرح کی صعوبتوں اور مصیبتوں سے پر ہے۔

ہرچند جغرافیائی اعتبار سے محترمہ ایس کے جان کے تجربات بہت ہی تلخ تھے مگر ذہنی اور نظریاتی لحاظ سے مغربی افریقہ کے ملکوں کی پاکستان سے وابستگی جو موصوفہ کے دور سفارت میں سامنے آئی وہ بڑی حوصلہ افزا تھی۔ انہوں نے بتایا کہ مغربی افریقہ کے ملکوں کے نزدیک پاکستان کی زرعی صنعتی اور اقتصادی ترقی مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے وہ انہی خطوط پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں جن پر چلنے سے پاکستان کو زراعت' صنعت و حرفت اور اقتصادیات و معاشیات میں ترقی کی جانب گامزن ہونے کا موقع میسر آیا ہے موصوفہ نے افریقہ کے مغربی ملکوں کی حکومتوں کی بے حد تعریف کی' کہ یہ ممالک مخدوش اور نامساعد حالات کا نہایت پامردی سے مقابلہ کر رہے ہیں' موصوفہ نے ان کی ہمت اور حوصلے کی دل کھول کر داد دی اور ان کے

خلوص و نیک نیتی کی بھی تعریف کی۔

مزید برآں یہ کہ مغربی افریقہ کے ملکوں میں پاکستان کے لئے جو خیرسگالی کے جذبات پائے جاتے ہیں محترمہ ایس کے جان نے ان کا خاص طور پر ذکر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ گھانا کے چیئرمین جیری جے رالنگ کو پاکستان سے دلی عقیدت اور محبت ہے اور وہ ہمارے وطن کی بڑی عزت و تکریم کرتے ہیں اور اسے برادر ملک قرار دیتے ہیں انہوں نے مزید کہا کہ وہ جب گھانا میں سفارت کی مدت پوری کر کے واپس آ رہی تھیں تو چیئرمین اس وقت اپنے دارالحکومت میں موجود نہیں تھے۔ انہیں جب یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ پاکستان کی سفیر مس ایس کے جان اپنی مدت پوری کر کے اگلی صبح اپنے ملک پاکستان واپس جا رہی ہیں تو وہ اپنا سرکاری دورہ ادھورا چھوڑ کر نہایت برق رفتاری سے دارالحکومت واپس آ گئے تاکہ وہ مس ایس کے جان کو الوداع کہہ سکیں۔ مس جان کو اگلی صبح ساڑھے سات بجے ہوائی جہاز پر سوار ہونا تھا جہاز کی پرواز سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے انہوں نے قلعے Castle میں مس جان کے لئے الوداعی تقریب ترتیب دی اس وقت بہت سے اراکین حکومت بھی ان کے ساتھ موجود تھے۔

گھانا کی حکومت کے مختلف شعبوں کے سربراہوں نے بھی مس جان کے حسن عمل اور عمدہ کارکردگی کو بے حد سراہا اور ان کے اخلاق حمیدہ اور صفات ستودہ کی تعریف کی چیئرمین جے جے رالنگ نے میری ابتدائی ملاقات میں ہی مجھ سے مس جان کی خیریت دریافت کی اور انہیں بہت اچھے لفظوں میں یاد کیا۔ وہ محترمہ کے بہت معترف تھے۔

گھانا۔ محدود جمہوریت کا سفر

۲۰ جولائی ۱۹۸۶ء کو میں اور میری اہلیہ نرگس گھانا کے دارالحکومت پہنچ گئے ایئرپورٹ پر پاکستان کے مشن کا تمام سٹاف گھانا حکومت کے چیف آف پروٹوکول سٹیٹ منسٹر برائے انفارمیشن، پریس رپورٹرز، ٹی وی کا عملہ، چین، لبنان، مصر اور کیوبا کے سفیر صاحبان بھارت کے کونسلر سپین کے چارج ڈی آفیرز اور کے ایل ایم کے مقامی چیف وغیرہ موجود تھے کچھ سفارت کاروں کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہ استقبال کے لئے تشریف لائے تھے لیکن جہاز چونکہ ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ تھا اس لئے انتظار کر کے واپس چلے گئے ہمیں وی آئی پی لاؤنج میں لے جایا گیا۔

ابھی جیٹ لیگ سے نجات بھی نہ ملی تھی کہ چیف آف پروٹوکول نے مجھے خوش آمدید کہا اور اس کے ساتھ ہی ایک تقریر شروع کر دی میرے پیشرو سفیر جناب محمد راول دریامانی ۷ جولائی ۱۹۸۶ء کو اسلام آباد کے لئے روانہ ہوئے تھے اور میں ۲۰ جولائی کو گھانا کے دارالحکومت پہنچا تھا اس حوالے سے چیف آف پروٹوکول نے کہا کہ پاکستان اور گھانا کے درمیان باہمی تعلقات بہت گہرے ہیں اور وہ اس بات سے بخوبی عیاں ہیں کہ حکومت پاکستان نے اپنے پہلے سفیر کے یہاں سے رخصت ہو جانے کے چودہ دن کے اندر اندر اپنا ایک نیا سفیر بھیج دیا ہے۔ پھر اس نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ گھانا کی حکومت اس بات کو بنظر استحصان دیکھتی ہے کہ پاکستان کا نیا سفیر غیر سیاسی فرد نہیں بلکہ سیاست دانوں کے ایک حلقے سے تعلق رکھتا ہے انہوں نے کہا کہ انکے سیاسی تعلق کی وجہ سے گھانا کی حکومت ان کی تقرری کو خصوصی اہمیت دیتی ہے۔

پریس والوں نے گھانا اور پاکستان کے درمیان خیرسگالی کےجذبات کا ذکر اگلے روز جلی سرخیوں میں کیا اس کے علاوہ ٹی وی نے بھی نشریات میں خصوصیت کے ساتھ میرا ذکر کیا اور حکومت پاکستان کے ساتھ میرے مبینہ تعلق پر زور دیا ۲۱ جولائی ۱۹۸۶ء کو میں نے مشن میں اپنے کام کا آغاز کر دیا عملے سے متعارف ہونے کے بعد جو سب سے پہلا اہم کام نظر آیا وہ گھانا حکومت کو اپنی اسناد سفارت کا پیش کرنا تھا میری رہائش گاہ تو گھانا کے دارالحکومت عکرہ ہی میں تھی مگر یہاں سے مجھے ٹوگو' برکینا فاسو' لائبیریا اور سیرا لیون میں پاکستان کے مفادات پر توجہ دینی تھی اسلام آباد سے روانہ ہونے سے پہلے میری اسناد سفارت ان ممالک کو بھیج دینی چاہئے تھیں لیکن میں نے بہتر سمجھا کہ میں یہ ساتھ لے کر عکرہ پہنچوں یہ صرف احتیاط کا تقاضہ تھا۔ سنا ہے کہ میرے پیشرو کو اس ضمن میں ایک لطیفہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ گھانا تو وہ پہنچ گئے گھانا کے چیف آف پروٹوکول نے انہیں اس تاریخ سے بھی مطلع کر دیا تھا جس میں انہیں CASTLE میں اپنی اسناد سفارت پیش کرنا تھیں لیکن مقررہ تاریخ تک انہیں حکومت پاکستان کی جانب سے اسناد سفارت نہ مل سکیں گھانا کے دفتر خارجہ کے اہلکاران اور پروٹوکول کی جانب سے انہیں بڑے تزک و احتشام اور شان و شوکت کے ساتھ CASTLE لے جایا گیا جہاں انہیں اپنی دستاویزات کو پیش کرنا تھا لیکن عین موقع پر موصوف نے پروٹوکول کو یہ بتایا کہ ان کے پاس مطلوبہ دستاویزات نہیں تو سب کے سب لوگ بہت حیران و پریشان ہوئے نتیجتاً کچھ دنوں کے لئے یہ تقریب ملتوی کر دی گئی۔

مجھے اپنے دفتر خارجہ میں اس واقعہ کا پہلے ہی علم ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے گھانا کی جانب روانگی سے پہلے ہی اپنے تمام کاغذات مکمل کروا لئے تھے۔ قاعدے کے مطابق اپنے مشن میں تو میں کام کر سکتا تھا لیکن گھانا اور دیگر آس پاس کے میزبان ملکوں میں بطور سفیر کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔

مشن کی درخواست پر گھانا کے دفتر خارجہ نے ذرا عجلت سے کام لیا۔ میں خود بھی کونسلر کے ہمراہ دفتر خارجہ میں مسٹر جے سی قائم مقام ڈائریکٹر جنرل سے ملاقاتی ہوا۔

گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ ان کے ذہن میں اگست کے مہینے کی کوئی تاریخ ہے مثلاً ۱۸ یا ۱۹ اگست بشرطیکہ وہ چھٹی کا دن نہ ہو میں نے انہیں بتایا کہ ۱۴ اگست ہمارا یوم آزادی بھی ہے اور میری شادی کی سالگرہ کا دن بھی اگر اگست کی کوئی تاریخ رکھنی ہے تو ۱۴ اگست رکھ لی جائے ان کا ردعمل مثبت تھا کہنے لگے اس سے بہتر تو کوئی اور دن ہو ہی نہیں سکتا چنانچہ ۱۴ اگست کو میں نے اپنی اسناد سفارت CASTLE میں مسٹر جسٹس انان کو پیش کیں۔

مسٹر جسٹس انان گھانا سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج ہیں - بے حد ذہین و فطین اور ایک لائق فائق جج تھے۔ جذبہ حب الوطنی سے سرشار اپنی شخصیت کے لحاظ سے نہایت پروقار قانون اور سیاست وغیرہ کے ایک متجر عالم —— اسناد سفارت پیش کرنے کے بعد ان کے اور میرے درمیان ایک رسمی گفتگو ہوئی ان کے جج ہونے کی مناسبت سے میرا وکیل ہونا میرے لئے بہت سود مند ثابت ہوا ذہنی اعتبار سے ایسی ہم آہنگی پیدا ہوئی جس کی بنیاد پر آگے چل کر یہ رسمی علیک سلیک باہم دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ تین برس کی مدت میں ان سے کئی ملاقاتیں رہیں' اور وہ ہمیشہ پاکستان کے لئے مفید ثابت ہوئیں۔

مسٹر جسٹس انان سے جب کبھی گفتگو ہوتی وہ پاکستان کے قوانین کے بارے میں تفصیلات کے لئے اکثر اپنی تشنگی کا اظہار کرتے۔ چنانچہ میں نے ان کی خواہش پر بارہا مختلف موضوعات کے متعلق پاکستان سے کتابیں منگوا کر انہیں پیش کیں۔ ان کی لائبریری میں اب پاکستان کے مختلف دساتیر ان کی ترمیمات اور وقتاً فوقتاً احکامات کی منسوخی کی کتب ۱۹۵۶ء کے دستور پر جناب اے۔ کے بروہی مرحوم —— کی کمنٹری جناب ایس ایم ظفر کی تصانیف پروفیسر ڈاکٹر ایم اے منان کی سپیریر کورٹس آف پاکستان اور جناب پیرزادہ شریف الدین کی تصنیفات موجود ہیں پاکستان میں اسلامائزیشن' وفاقی محتسب پاکستان کے فیصلوں کی رپورٹیں پاکستان شریعت کورٹس کے فیصلے منجملہ قادیانیوں کے بارے میں فیصلے یہ سب کچھ بھی میں نے ان کی

فرمائش پر حاصل کر کے انہیں مہیا کیے۔ ساتھ ہی ساتھ پاکستان سے قائداعظم محمد علی جناح کی سوانح پر کتابیں پاکستان کی سیاسی تاریخ اور مارشل لاء کے بارے میں مختلف النوع لٹریچر بھی مہیا کیا۔

مسٹر انان ۱۹۸۱ء ہی کے فوراً بعد سے حکومت میں شامل ہیں۔ وہ پروویژنل نیشنل ڈیفنس کونسل کے رکن ہیں ملکی حکومت کی باگ ڈور اسی کونسل کے ہاتھ میں ہے۔ یہی کونسل حکومت کی پالیسی ترتیب دیتی ہے۔ اس کونسل کے ارکان کی تعداد عموماً گیارہ تک ہوتی ہے۔ مسٹر جسٹس انان اس کونسل کے رکن ہونے کے علاوہ نیشنل کمیشن فار ڈیماکریسی (قومی مجلس برائے جمہوریت) کے چیئرمین بھی ہیں۔ جب کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ گھانا میں جمہوریت رائج کرنے کے لئے مناسب اقدامات کئے جائیں تو پاکستان کی مثال کونسل کے سامنے تھی۔ کونسل میں طویل بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ گھانا میں فی الحال ڈسٹرکٹ کونسل کی سطح کی جمہوریت قائم ہونا مناسب ہے مسٹر جسٹس انان نے اس سے متعلق پاکستانی قوانین کا مطالعہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کے ساتھ کونسل کے ایک اور اہم رکن کیپٹن کوجوچکاٹا نے جو گھانا میں امور خارجہ اور نیشنل سیکورٹی ڈویژن کے سربراہ ہیں' لوکل کونسلوں کے بارے میں لٹریچر طلب کیا۔ میں نے حسب دستور و قاعدہ دفتر خارجہ کو اس کے متعلق آگاہ کیا۔ اگرچہ اس وزارت کے عمومی ردعمل کا اس وقت تک مجھے علم ہو چکا تھا اور دفتری فائلوں کے بارے میں بھی آگاہی تھی۔ تاہم قاعدے کی میں نے پابندی کی اس کے ساتھ ہی ذاتی طور سے میں نے جناب جسٹس محبوب احمد جج ہائیکورٹ لاہور جسٹس ارشاد حسن خان جو اس وقت لاء سیکرٹری تھے اور موجودہ چیئرمین سینٹ جناب وسیم سجاد کو جو اس وقت وفاقی وزیر انصاف تھے' اس سلسلے میں امداد و تعاون کے لئے لکھا اور ساتھ ہی ساتھ میں نے اپنی ذاتی لائبریری سے BASIC DEMOCRACY (بنیادی جمہوریت) کے بارے میں کتابیں منگوائیں۔ جنہیں میرے صاحبزادے ڈاکٹر اشتر اوصاف علی ایم۔ سی۔ ایل نے بہ تمام عجلت سے مجھے بھجوا دیں۔ اس موقع پر

مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ میرے ذاتی خطوط جو میں نے اپنے کرم فرماؤں کے نام لکھے تھے اور میرے مخلصانہ تعلقات جو احباب کے ساتھ برسوں سے چلے آئے تھے میرے خوب کام آئے جسٹس محبوب احمد اور جسٹس ارشاد حسن' وفاقی وزیر وسیم سجاد اور اشتر وغیرہم نے فوری طور پر مجھے مطلوبہ لٹریچر بھجوا دیا جسے میں نے فوراً ہی جسٹس انان اور کیپٹن کوجوچکاٹا کو پیش کر دیا۔ حکومت گھانا کی جانب سے بھی میرے اس اقدام کو سراہا گیا اور اسے "خیر سگالی" کا نام دیا گیا۔

انہی معلومات کی بنیاد پر جو پاکستانی لٹریچر سے مہیا ہوئی تھیں لوکل کونسل گھانا کے لئے انتخابی قوانین اور قواعد بنائے گئے اور پاکستان ہی کے قواعد و ضوابط کو گھانا حکومت نے اپنے ملکی انتخابات کے قواعد وضوابط کیلئے ماڈل بنایا۔

ہمارے دفتر خارجہ نے لوکل کونسل کے بارے میں کتابوں کی فراہمی سے متعلق کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ جناب جسٹس ارشاد حسین کے دفتر انصاف سے کسی سیکشن افسر نے ۱۹۷۳ء کے پاکستانی دستور کی ایک کاپی مجھے بھیج دی اور لوکل کونسل کے بارے میں جج صاحب موصوف کی ذاتی لائبریری سے بھی مجھے کچھ کتابیں بھجوا دیں بقیہ کتابوں کے بارے میں مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں پنجاب پرنٹنگ پریس لاہور سے رجوع کروں۔

جناب جسٹس محبوب احمد جج ہائیکورٹ لاہور اور وفاقی وزیر انصاف جناب وسیم سجاد نے دو مکمل سیٹ مجھے بھجوا دیئے اس سلسلے میں جتنا لٹریچر بھی مجھے ملا اس سے گھانا حکومت نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اشتر نے میری ذاتی لائبریری سے کتابیں حاصل کیں۔ پھر ان کا بنڈل بنا کر وزارت خارجہ کے لاہور کیمپ آفس کے ساتھ رابطہ قائم کیا تاکہ اس کی وساطت سے کتابوں کا یہ بنڈل مجھے عکرہ بھیج دیا جائے۔ مگر اس آفس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وزارت خارجہ کے بیگ کے ذریعے ذاتی اشیاء بشمول کتب کے بیرون ملک کسی سفارت خانے کو نہیں بھجوائی جا سکتیں۔ اس پر جب اشتر نے اسلام آباد کے دفتر سے رجوع کیا تو اس نے بھی اسی بنیاد پر پہلے تو کتابیں بھجوانے

سے صاف انکار کر دیا لیکن بعد میں وزارت خارجہ کے ایڈیشنل فارن سیکرٹری بختیار علی کی مداخلت سے یہ کتب مجھے بھیج دیں۔ ظاہر ہے یہ میرا کوئی ذاتی کام تو نہیں تھا بلکہ ایک ملکی اور قومی کام تھا۔ لیکن افسر شاہی کے کل پرزوں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ بہرحال بختیار علی کی وساطت سے عکرہ بروقت کتابیں پہنچ جانے سے گھانا کے حکومتی حلقوں میں پاکستان کے حق میں اس سے بہت اچھا اثر قائم ہوا۔

گھانا میں کونسل الیکشن کی شروعات سے پہلے حکومتی حلقوں اور اخباروں میں اس مسئلے پر بحث و تمحیص کا آغاز ہوا کہ یہاں جمہوریت کس سطح پر اور کس حد تک نافذ کی جا سکتی ہے ایک اور مسئلہ بھی درپیش تھا وہ یہ کہ ۱۹۸۱ء کے انقلاب کے بعد مقامی لوگوں پر مشتمل ہر گاؤں اور ہر شہر میں انقلابی کونسلیں تشکیل دی گئیں ان کونسلوں کو دفاعی انقلابی کونسل COUNCIL FOR DEFENCE OF REVOLUTION کا نام دیا گیا تھا۔ مقامی انتظام و انصرام ان کونسلوں کے سپرد تھا۔ اگرچہ ان کونسلوں کے بارے میں اصرار کے ساتھ یہی کہا جاتا ہے کہ یہ خود مختار ادارے ہیں لیکن یہ اہم ادارے مرکزی ہدایات کے لئے گھانا میں مرکزی کونسل برائے دفاع انقلاب کے ہیڈ کوارٹر کے ماتحت تھے۔ ان اداروں میں مناصب پر تقرریاں بھی مرکزی دفتر ہی کی جانب سے ہوتی ہیں اس کے علاوہ اضلاعی دفاتر بھی باقاعدہ طور پر سرکاری عمارتوں ہی میں واقع ہیں۔ یہ ادارے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط ہو گئے تھے۔

یہ ادارے ماضی میں حکومتی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتے تھے ملک بھر میں حکومت کرنے کے لئے حکومت انہی اداروں پر انحصار کرتی تھی عوامی عدالتوں کے اختیارات بھی انہی اداروں کے پاس تھے اور علاقے میں ترقیاتی منصوبوں کا چارج بھی انہی اداروں کے پاس تھا اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ منتخب شدہ اراکین کی جو اسمبلیاں بنیں گی ان کے ـــــ اختیارات کیا ہوں گے؟ اور کیا ملک بھر میں انتخابات ہو جانے کے بعد یہاں دو عملی رائج نہ ہو جائے گی ایک طرف تو یہاں یہ مسئلہ توجہ طلب تھا دوسری طرف پروویژنل نیشنل ڈیفنس کونسل کے اراکین میں اس بات پر شدید

اختلاف تھا کہ انتخابات کس سطح تک محیط ہوں پھر یہ بھی مسئلہ تھا۔ کہ اگر پارلیمنٹ کے لئے انتخابات کرائے جائیں۔ تو پروویژنل نیشنل ڈیفنس کونسل کا کیا بنے گا اور کیا یہ کونسل انتخابات کے بعد حکومت منتخب نمائندوں کے حوالے کرنے کی پابند ہو گی وغیرہ وغیرہ۔

یہاں پر یہ سوال بھی زیر غور تھا کہ منتخب شدہ پارلیمنٹ کیا دستور سازی بھی کر سکے گی؟ مختصراً یہ کہ ایسے وہ تمام مسائل اٹھے جن سے ہم پاکستان میں بخوبی آشنا ہیں۔ جسٹس انان اور کیپٹن کوجوچکاٹا مذکورہ کونسل میں مختلف رائے رکھتے تھے بہرحال پاکستان میں صدر جنرل ضیاء کے دور میں لوکل کونسلوں کے جو انتخابات کروائے گئے وہی ان کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے اور آخرکار یہ طے پایا کہ ڈسٹرکٹ کی سطح تک انتخابات کروا لئے جائیں۔ پارلیمنٹ اور دستور کا معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ یہ فیصلہ کچھ اتنا آسان اور سہل نہیں تھا کہ فوراً قبول کر لیا جاتا کیونکہ جسٹس انان تو مکمل اور سرتاپا جمہوریت کے قائل تھے اس کے برعکس کیپٹن کوجوچکاٹا ایسی جمہوریت کے قائل تھے جس پر مکمل کنٹرول کیا جا سکے۔ آخرکار مختلف طرز ہائے حکومت پر نگاہ ڈالنے کے بعد صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان کے عہد کے بنیادی جمہوریت کے نظام سے رہنمائی حاصل کر لی گئی۔

لوکل کونسل کے انتخابات سے پہلے گھانا کو مختلف انتخابی اضلاع میں بانٹ دیا گیا۔ پھر اس کے بعد ان پر اعتراضات کی دعوت دی گئی اور انتخابی اضلاع کو جو ہمارے یہاں انتخابی حلقے کہلاتے ہیں آخری شکل دے دی گئی۔ پھر رائے دہندگان کے ناموں کے رجسٹر کھولے گئے ہر گلی کوچے اور ہر محلے اور موڑ پر، سکولوں، مدرسوں، عبادت گاہوں اور مارکیٹوں میں رائے دہندگان کے لئے رجسٹر رکھے گئے ابتداء میں شہریوں کا رویہ مایوس کن تھا حکومتی سطح پر انتخابی مہم کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔ اس سلسلے میں چیئرمین جے جے رالنگ نے بہت طویل دورے کئے اس کے ساتھ ساتھ پروویژنل ڈیفنس کونسل کے اراکین نے بھی ملک گیر مہم چلائی۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں نے

بھی اس مہم میں خاص طور سے بھرپور حصہ لیا ابتداء میں لوگ اس نظام سے نابلد اور سسٹم سے ناآشنا تھے اور انہیں اعتماد اور بھروسہ بھی نہیں تھا کہ گھانا حکومت آٹھ سال کے بعد انتخابات کروانے میں چاہے وہ ضلع کی سطح تک ہی کیوں نہ ہوں مخلص اور سنجیدہ ہے سفارتی حلقوں نے بھی اس موقع پر اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ میں نے اس مرحلہ پر گھانا حکومت کے ساتھ مکمل رابطہ رکھا اور پاکستان میں ضیاء دور کے لوکل کونسلوں کے انتخابات کے بارے میں آگاہ کئے رکھا۔

گھانا حکومت کے ان اقدامات کی رہنمائی کیلئے جو وہ جمہوریت کی بحالی کے لئے کر رہی تھی میں پاکستان کا تجرباتی لٹریچر گھانا حکومت کو پیش کرتا رہا۔ چیئرمین جے جے رالنگ نے پاکستان میں لوکل کونسلوں کے قوانین کے بارے میں ایک سمری بنانے کے لئے کہا۔ جو میں نے جلد ہی بنا کر پیش کر دی۔ امیدواروں کی چھان بین کے لئے سکریننگ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ کاغذات نامزدگی کے داخل کئے جانے کے بعد ان سکریننگ کمیٹیوں نے امیدواروں کا انٹرویو لیا۔ صرف ان لوگوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی جنہیں سکریننگ کمیٹیوں نے انتخاب کیلئے موزوں سمجھا۔

گھانا کے تین زون بنائے گئے اور ہر زون میں مختلف تاریخوں پر ووٹنگ کا پروگرام طے پایا امیدواروں کا ذاتی طور سے اپنی پبلسٹی کرنا قانوناً ممنوع قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ اپنے حمائتیوں کے ذریعے بھی اپنا پروپیگنڈہ کرنے کی قانونی طور پر ممانعت تھی اپنے بارے میں پوسٹر اور بینر لگانے پر بھی پابندی تھی البتہ سٹریٹ کارنر میٹنگیں ہو سکتی تھیں صرف گلی کوچے اور محلے میں چھوٹے بڑے ایسے اجتماع کی اجازت تھی جس میں باہمی تبادلہ خیال ہو سکے امیدوار اور رائے دہندگان کے درمیان کوئی مفید بات چیت ہو سکے لیکن ان کا انتظام بھی سرکاری طور سے کیا جاتا تھا ہر الیکشن ڈسٹرکٹ میں کونسل فار ڈیفنس آف ریولیوشن (دفاعی انقلابی کونسل) کے زیر اہتمام سٹریٹ کارنر میٹنگ کا انتظام ہوتا تھا۔ اس میٹنگ کی صدارت کونسل کا چیئرمین کرتا تھا تمام امیدواروں کو ان' اجتماعات میں عوام سے خطاب کرنے کی دعوت دی جاتی تھی ہر امیدوار سے رائے دہندگان کو سوالات پوچھنے کی اجازت تھی اور اس طرح

بغیر کسی جھجک کے امیدواروں سے سوالات کرنے کی اجازت دے کر رائے دہندگان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ میرے استفسار کرنے پر مجھے بتایا گیا کہ اس طریقہ کار سے امیر کبیر امیدواروں کو غریب امیدواروں پر فوقیت پانے یا سبقت لے جانے سے روک دیا گیا ہے ہر امیدوار کو رائے دہندگان کے سامنے یکساں طور پر لایا گیا اور یہ کہ تمام رائے دہندگان اپنی پسند کے امیدوار کو ووٹ دینے کے لئے ہر طرح سے آزاد تھے درحقیقت یہ انتخابات بے حد سلیقے اور قرینے سے منعقد کرائے گئے حکومت نے کسی طور پر بھی رائے دہندگان پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی رائے دہندگان نے بھی اپنا حق رائے دہی نہایت پرسکون اور آزادانہ فضا میں پرامن طریقے سے استعمال کیا تقریباً چار مہینے کے درمیان انتخابات کے تمام مراحل طے ہو گئے۔

چونکہ انتخابی قوانین کے تحت ایک تہائی اراکین کو نامزد کرنے کا حکومت کو حق حاصل تھا اس لئے ڈسٹرکٹ اسمبلیوں کو مکمل کرنے کے لئے یہ نامزدگیاں بھی کر دی گئیں البتہ اس مرحلے پر نامزدگیاں سی۔ ڈی۔ آر کی سفارشات پر کی گئیں۔ اس طرح سی ڈی آر اور نوزائیدہ ڈسٹرکٹ اسمبلیوں کے درمیان جو رقابت کا آغاز اور اختیارات کے بارے میں تنازعات پیدا ہونے کے خطرات اور خدشات تھے وہ اگرچہ مکمل طور پر دور تو نہ ہو سکے تاہم دونوں اداروں میں ہم آہنگی کے امکانات ضرور پیدا ہو گئے۔

ایک مرحلہ پر یہ اندیشہ بھی ہوا کہ حالات اور واقعات سے بدظن ہو کر شاید عوام اپنے ملک کے انتخابات میں دلچسپی نہ لیں۔ بالخصوص گھانا کے شمال میں مسلم حلقوں کے بارے میں یہ تاثر عام تھا لیکن مسلم ممالک کے سفیر صاحبان کے ذریعے اور ان کی ترغیب سے علماء کونسل کو اس طرف راغب کیا گیا اور حکومت نے اس سلسلے میں چند ایک سرکردہ اور مسلم شخصیات کی مدد بھی حاصل کی تو گھانا کے شہریوں نے اپنے دل و دماغ میں تبدیلی پیدا کرتے ہوئے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ حکومتی حلقوں کی رائے کے مطابق پینتالیس فی صد رائے دہندگان نے ووٹ ڈالے۔ ایک

محتاط اندازے کے مطابق کسی بھی انتخابی حلقے میں رائے دہندگان کی جس تعداد نے ووٹ ڈالے وہ ۲۵ فیصد سے زیادہ نہیں تھے۔

حکومتی حلقے اس بات پر بجا طور پر خوش تھے کہ انتخابات کا کٹھن مرحلہ بخیر و خوبی تمام ہوا۔ نہ کہیں رائے دہندگان کو خوفزدہ اور ہراساں کیا گیا نہ قبائل کی عصبیت کی بنیاد پر ووٹ مانگے گئے نہ رائے دہندگان کو مختلف ذریعوں اور طریقوں سے خریدنے کی کوشش کی گئی نہ اغوا کی وارداتیں ہوئیں نہ رائے دہندگان پر اخلاقی دباؤ ڈالنے کے لئے ان کے کھانے پینے اور آنے جانے کے لئے ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا گیا۔ رائے دہندگان اپنی رضا و رغبت اور مرضی سے خود چل کر آئے اور اپنی پسند کے امیدوار کو ووٹ دے کر انہی قدموں سے واپس چلے گئے۔

جنگ و جدل' فتنہ و فساد سے پاک اور مبرا یہ انتخابات نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور اپنی مثال آپ تھے۔ جمہوری قدروں کا خیال رکھتے ہوئے یہ انتخابات اس قدر پرامن اور پرسکون ماحول میں منعقد ہوئے کہ ناحق خونریزی اور قتل و غارت گری تو درکنار کسی ایک فرد کی انتخابی مرحلے میں نکسیر تک نہیں پھوٹی۔

"عمدہ رشتوں اور ناطوں کے لئے جنتر منتر"

۱۴ اگست کی صبح آٹھ بجے مجھے اپنے گھر سے CASTLE کے لئے روانہ ہونا تھا حکومت کے تمام دفاتر یہیں پر واقع ہیں چیئرمین اور پرووژنل نیشنل ڈیفنس کونسل کے دفاتر بھی یہیں پر ہیں یہ CASTLE کیا ہے' واقعی ایک قلعہ ہے جسے اپنے دور میں پرتگیزوں نے تعمیر کیا تھا کالے غلام برآمد کے لئے اسی قلعے کے تہہ خانوں میں قید رکھے جاتے تھے ان تہہ خانوں کے ساتھ ساتھ عقوبت خانے بھی تھے جن میں ان کالے قیدیوں کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں جو باآسانی برآمد ہونے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ ان عقوبت خانوں کو دیکھ کر آج بھی دل و دماغ پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔

مقام عبرت ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں پر' ذاتی منفعت کیلئے کیا کیا ظلم و ستم ڈھاتا رہا ہے اور آج بھی ڈھا رہا ہے قلعہ کے تہہ خانوں سے قیدیوں کو جہازوں میں سوار کرنے کا براہ راست انتظام تھا یہ راستے ابھی تک اپنی اصل حالت میں مضبوط و مستحکم موجود ہیں یہ قلعہ باقاعدہ طور پر ایک ایسی عمارت ہے جو دفاع کے لئے بھی استعمال ہو سکتی ہے آجکل یہی قلعہ حکومت کا سیکرٹریٹ ہے یہیں پر مجھے اپنی دستاویزات سفارت کو پیش کرنا تھا۔

گھانا میں پرووژنل نیشنل ڈیفنس کونسل حکمران ہے اس کونسل کے چیئرمین فلائٹ لیفٹننٹ جے جے رالنگ ہیں یہ کونسل مشترکہ قیادت کے تصور پر عمل کرتی ہے اس کے گیارہ ارکان ہیں جو مجموعی طور سے ہمہ مقتدر ہیں ۱۹۸۱ء کے انقلاب کے بعد سے

اس کونسل نے ملک کی باگ ڈور سنبھال رکھی ہے حکومت کے کاغذات میں تمام اراکین مساوی اختیارات کے مالک ہیں مگر حکومت کے نظم و نسق کو عمدگی سے چلانے کے لئے کونسل کے ہر رکن کو الگ الگ محکمہ دیا گیا ہے۔

مشترکہ حکمرانی کے تصور کے تحت چونکہ کوئی رکن ملک پر حکمران نہیں اس لئے غیر ممالک کے سفیروں کی تقرری کے کاغذات وصول کرنے کے لئے ہر تین سال بعد کونسل کے ایک رکن کو نامزد کر دیا جاتا ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء کو میں نے جسٹس انان کے روبرو اپنی اسناد سفارت پیش کیں۔

اس روز عین صبح آٹھ بجے دو موٹر سائیکل ہوٹر بجاتے میری رہائش گاہ پر آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے دو مرسڈیز کاریں بھی آئیں میں پہلے ہی سے اپنا قومی لباس پہنے تیار ان کا منتظر تھا چند روز پہلے میری اہلیہ نرگس نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اسناد سفارت پیش کرنے کی تقریب وہ بھی دیکھنا چاہتی ہیں چنانچہ مشن کی جانب سے ان کے لئے اجازت مانگی گئی جو ایک رات پہلے مل گئی پھر بھی وہ تقریب میں شامل نہ ہو سکتی تھیں کہ ایسی کوئی روایت موجود نہ تھی وہ ایک الگ گیلری میں بیٹھ کر تقریب کا نظارہ کر سکتی تھیں۔

میں اور چیف آف پروٹوکول اگلی کار میں سوار ہوئے نرگس اور لیڈی پروٹوکول افسر پچھلی کار میں سوار ہوئیں۔ میری رہائش گاہ سے قلعہ تک تمام ٹریفک بند تھی لیکن ہمارا کارواں اس تیزی کے ساتھ اس راہ سے گزرا کہ عام ٹریفک میں کوئی خلل واقع نہیں ہونے پایا قلعہ پہنچے تو بچھے ہوئے سرخ قالین کے ساتھ کار کھڑی ہوئی میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو چیف آف پروٹوکول نے چپکے سے مجھے روک دیا۔ اسی دوران ایک افسر آگے بڑھا اور اس نے ہم دونوں کے لئے کار کے دروازے کھول دیئے کار کا دروازہ خود کھولنا پروٹوکول کے مطابق جائز نہ تھا۔

میں اور چیف آف پروٹوکول کار سے اتر کر قلعے میں داخل ہوئے ایک سکوائر میں سٹیج بنی ہوئی تھی اس کے اوپر ایک مرصع شامیانہ لگا ہوا تھا اس سٹیج پر کھڑے ہو کر

میں نے ایک فوجی دستے سے سلامی لی فوجی بینڈ نے پاکستان اور گھانا کے قومی ترانے بجائے اب مجھے یہاں سے اس ہال میں جانا تھا جہاں اسناد سفارت پیش کرنا تھیں یہ ہال کمرہ قلعے کے اندر واقع ہے میرے ہمراہ مشن کے عملے میں سے کونسلر شیر محمد خاں اور سیکنڈ سیکرٹری سلطان احمد شامل تھے قلعہ میں داخل ہوئے تو بالکل سامنے سیڑھیاں تھیں جو قلعہ کی دوسری منزل تک چلی جاتی ہیں ان پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا دوسری منزل پر پہنچے تو وہاں دو افریقی با آواز بلند جنتر منتر پڑھ رہے تھے میرے استفسار پر مجھے بتایا گیا کہ یہ دونوں سرکاری طور پر اسی کام کے لئے مقرر کئے گئے ہیں اور ہر آنے والے سفیر اور اس کے ملک اور گھانا کے درمیان خوشگوار تعلقات اور عمدہ رشتوں ناطوں کے لئے دعا کرتے ہیں اور دیوتاؤں سے درخواست کرتے ہیں کہ سفیر اپنے دوران قیام سفلی قوتوں سے بہ تمام و کمال محفوظ رہے اس رسم کو یہاں LIBATION کہتے ہیں جنتر منتر پڑھنے کے دوران وہ فرش پر الکحل سے بنا ہوا کوئی مشروب بھی چھڑکتے رہتے ہیں اس کے بعد ہم ایک غلام گردش سے ہوتے ہوئے ایک ہال میں داخل ہوئے وہاں پر جسٹس انان پروریژنل نیشنل ڈیفنس کونسل کے رکن گھانا کے وزیر تجارت' پروٹوکول کے افسر وردیوں میں ملبوس (باڈی گارڈ) ہاتھوں میں نیزے لئے اپنے مقام پر استادہ تھے چیف آف پروٹوکول نے مجھے جسٹس انان کے روبرو پیش کیا اور میں نے انہیں اسناد سفارت پیش کیں جن کو انہوں نے اسی طرح چیف آف پروٹوکول کے سپرد کر دیا۔

اس کے بعد میں نے اپنی جگہ سے چند قدم پیچھے ہٹ کر پہلے سے تیار کی ہوئی ایک تقریر پڑھی پھر اس کے جواب میں جسٹس انان نے بھی ایک تقریر پڑھ کر سنائی ہم دونوں کی تقاریر میں گھانا اور پاکستان کا ذکر بار بار آیا تیسری دنیا میں اتحاد نمیبیا کی آزادی' جنوبی افریقہ میں جلد کی رنگت کی بنیاد پر جابرانہ حکمرانی وغیرہ کے مسائل تقریر کے موضوعات تھے گھانا نے افغانستان کے مسئلے میں پچھلے کئی برسوں سے ہمارا جو ساتھ دیا ہے اس کا میں نے خاص طور پر ذکر کیا پاکستان اور گھانا کے درمیان تعلقات کو مزید

مضبوط اور مستحکم بنانے کی ضرورت پر بھی بات کی۔

بعد ازاں میں نے اپنے کونسلر اور سیکنڈ سیکرٹری سے جسٹس' انان کا تعارف کرایا۔ اس کے جواب میں انہوں نے وزارتی عملے سے میرا تعارف کرایا۔ اگرچہ جسٹس انان کی اور میری یہ پہلی ملاقات تھی لیکن قانون کے پیشے سے وابستہ ہونے کے باعث جسٹس انان کا مجھ سے خصوصی طور سے رابطہ قائم ہو گیا یہ رابطہ جب تک میں سفارت کے منصب پر فائز رہا برابر قائم رہا ہے۔

جسٹس انان بے حد لائق فائق' ذہین سنجیدہ اور متین شخصیت کے مالک ہیں وہ جمہوریت اور جمہوری عمل پر نہایت پختہ یقین و اعتماد رکھتے ہیں ایک ملاقات میں ان سے میں نے پوچھا کہ وہ موجودہ انقلابی حکومت میں کیسے شامل ہوئے؟ انہوں نے کہا کہ انقلابی حکومت نے فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ کی قیادت میں ۱۹۷۹ء میں بھی گھانا کی حکومت کو برطرف کر کے جمہوریت کے نام پر ملک کی باگ ڈور سنبھالی تھی کیونکہ منتخب حکومت کے دور میں بدعنوانی اور بددیانتی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی عوام کے حقوق سلب کئے جا چکے تھے حکومت سے اختلاف رکھنے والے سیاست دانوں کو جبرو تشدد سے دبا دیا گیا یا ملک بدر ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا الغرض نالائق اور نااہل سیاست دانوں نے اور افسر شاہی کے عہدیداروں نے ملک و قوم کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس وقت فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ ہی ایک ایسا فرد تھا جو ملک و قوم اور جمہوریت کو بچانے کے لئے میدان عمل میں نکل آیا اور اس نے انقلاب برپا کر کے بدعنوان منتخب حکومت کو برطرف کر دیا اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی جناب جیری جے رالنگ نے صدر مملکت کی حیثیت سے اسی تاریخ کے مطابق عام ملکی انتخابات بھی منعقد کروا دیئے جو اس سے پہلے معزول حکومت کے صدر نے مقرر کی تھی اور حکومت کو اپنے وعدے کے مطابق منتخب اراکین کے حوالے کر دیا وہ اور ان کے ساتھی حکومت سے دستبردار ہو گئے۔

لیکن یہ صورتحال صرف دو سال تک قائم رہ سکی۔ ناعاقبت اندیش سیاستدانوں

اور افسر شاہی نے ملک کی روز بروز گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالا دینے کی بجائے نظر انداز کر دیا اور ملک و قوم کی تکالیف کی کوئی پرواہ نہ کی آخر کار عوام کی قوت خرید روز بروز کم ہوتی چلی گئی مہنگائی بیروزگاری اور بیکاری نے ہر شخص کی زندگی اجیرن کر دی نیز بین الاقوامی سطح پر گھانا کا وقار بھی نہایت بری طرح سے مجروح ہو رہا تھا۔ یہ ملک جو صرف چوبیس برس پہلے افریقہ اور تیسری دنیا کا مسلمہ رہنما تھا اب اس کا شمار دنیا کے نہایت غریب اور پسماندہ ملکوں میں ہونے لگا ملکی معیشت کے وسائل اور پیداوار کے ذرائع پر قبضہ و تصرف کرنے کے لئے طاقتور اور استحصالی قوتوں نے بیوروکریسی اور ارباب سیاست کو نہایت بدقماش اور بد دیانت بنا دیا۔ استحصالی قوتیں ملک کے اندر اور باہر گھانا کے خلاف سازشوں میں مصروف تھیں یہ صورتحال فلائٹ لیفٹیننٹ جیری رالنگ کے دل و دماغ پر نہایت گراں گزری چنانچہ ۳۱ دسمبر۸۱ء کی شب کو جب ارکان حکومت نئے سال کی تقریبات میں مصروف تھے جیری جے رالنگ نے آگے بڑھ کر حکومت پر قبضہ کر لیا۔ جسٹس انان کو جب جیری جے رالنگ نے حکومت میں شمولیت کی دعوت دی تو وہ اس انقلاب کے رہنماؤں کے خلوص اور ایمانداری سے متاثر تھے' اس لئے حکومت میں شامل ہو گئے۔

۱۹۷۹ء کے انقلاب کے بعد انقلابی حکومت کو جو واقعات پیش آئے اور جو تجربات ہوئے ان کی بنیاد پر اب حکومت بہت محتاط ہو گئی تھی اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگی۔ اگرچہ اس نئی حکومت نے ۱۹۸۱ء کی آخر شب سے اب تک اپنا نام پروویژنل ڈیفنس کونسل ہی رکھا ہے یعنی عارضی قومی دفاعی کونسل تاہم صورتحال سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کونسل بلاشبہ دفاعی اور قومی کونسل تو ہے مگر عارضی ہرگز نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس ملک میں اس مرتبہ جمہوریت کی بحالی کونسل کی اولیں ترجیح نہ تھی بلکہ چیئرمین جیری جے رالنگ اور ان کے ساتھیوں کی نظر میں بد دیانت سیاستدانوں اور افسر شاہی کے عہدیداروں کا احتساب گھانا کی معاشی اور اقتصادی زبوں

حالی کا سد باب ایسے امور اہمیت رکھتے ہیں اور ایسے اقدامات ان کی ترجیحات میں شامل تھے جن سے گھانا ایک مرتبہ پھر اقوام عالم میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکے۔

رشوت ستانی اور بد دیانتی نے ملکی معیشت کو کھوکھلا کر دیا تھا مہنگائی نے عوام کو کمر توڑ کر رکھ دی تھی حکومت کا کوئی منصوبہ گذشتہ جمہوری دور میں پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا تھا اور انتظامیہ میں اپنی ذمہ داریوں کا کوئی احساس تک نہ تھا ایسے حالات میں غیر قانونی کاروبار سے نجات پانے کی بھی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی مختصراً یہ جمہوری حکومت استحصالی قوتوں کے سامنے بالکل بے بس ہو چکی تھی ایسے مخدوش اور نامساعد حالات میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالنا یقیناً جان جوکھوں کا کام تھا لیکن چیئرمین جیری جے رالنگ نے اپنے بیان کے مطابق صرف اور صرف جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر قوم کی ہدایت رہنمائی اور قیادت کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔

پروویژنل نیشنل ڈیفنس کونسل کے ارکان کل نو تھے جو بعد میں گیارہ ہو گئے اس کے ارکان کی تعداد کبھی گیارہ سے آگے نہیں بڑھی اس کے ارکان کو صرف ممبر MEMBER کہا جاتا ہے۔ جسٹس انان ابتداء ہی سے اس کے MEMBER چلے آتے تھے۔

ان کے علاوہ کیپٹن کو جو چکاٹا اور مسٹر پی وی اوہنگ بھی اس کے بنیادی اراکین ہیں۔ جسٹس انان کا فطری طور پر ذہنی رجحان دائیں بازو کی طرف ہے جبکہ کیپٹن کو جو چکاٹا کی رغبت بائیں بازو کی جانب ہے مگر بایں ہمہ دونوں کے درمیان کوئی آویزش اور چپقلش نہیں نہ ہی وہ کوئی دھڑے بازی کرتے ہیں۔ بلکہ قومی مفادات کے معاملے میں وہ ایک توازن قائم رکھنے میں کوشاں ہیں۔ اور کامیاب ہیں۔

مسٹر پی وی اوہنگ کونسل کے ایک مقتدر اور معزز رکن ہیں وہ ممبر ہونے کے علاوہ کونسل آف سیکرٹریز کے چیئرمین بھی ہیں اس لحاظ سے ان کا درجہ ہمارے ملکی وزیر اعظم کے برابر ہے گھانا میں وزارتوں کے سربراہ وزیر نہیں کہلاتے بلکہ انہیں سیکرٹری ہی کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کیبنٹ کو کونسل آف سیکرٹریز کہتے ہیں۔

پروویژنل ڈیفنس کونسل کے اراکین مشترکہ حکمرانی کے نظریئے پر عمل کرتے ہیں اس لئے ہر ممبر یکساں طور پر حکومت میں حصہ دار ہے کونسل کے چیئرمین فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ سربراہ حکومت یا صدر مملکت نہیں کہلاتے تھے۔ پروویژنل نیشنل ڈیفنس کونسل کے چیئرمین کے طور پر سربراہ ملک ہیں ۱۹۸۸ء تک یہی صورتحال تھی مگر اس کے بعد ہیڈ آف سٹیٹ HEAD OF STATE اور مسلح افواج کے سربراہ کے الفاظ بھی ان کے نام کے ساتھ لکھے جانے لگے۔

جیری رالنگ کے دو انقلابات

گھانا اور دیگر مغربی افریقی ممالک کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے میں نے لاہور کے مختلف اداروں اور کتابوں کی بیشتر دکانوں کے کئی چکر لگائے کہ مجھے کہیں سے گھانا کے بارے میں تھوڑا بہت کچھ اور علم ہو جائے مگر بے سود اس پر مستزاد یہ کہ خود گھانا ہی کی وزارت خارجہ نے بچت کے لئے جو اپنے پچیّس مشن بند کر دیئے تھے انہی میں سے ایک مشن وہ بھی تھا جو پاکستان میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا اگر یہ مشن پاکستان میں ہوتا تو مجھے گھانا کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل ہو جاتیں۔

گھانا سے متعلق یہ صورتحال میرے سامنے آئی تو میں نے اپنے مسئلے کو حل کرنے کے لئے وزارت خارجہ پاکستان کو لکھا مگر اسلام آباد سے بھی کوئی حوصلہ افزاء جواب نہ آیا وہاں تو متعلقہ سیکشن میں گھانا کے بارے میں کوئی رپورٹ تک موجود نہ تھی آخر کار جب کوئی رپورٹ کہیں سے بھی دستیاب نہ ہوئی تو متعلقہ ڈیسک نے گھانا کے دارالحکومت عکرہ سے مجھے ایک رپورٹ منگوا کر لاہور بھجوائی یہ رپورٹ ۱۹۸۴ء میں لکھی گئی تھی اس رپورٹ کے دیکھنے سے پتہ چلا کہ گھانا کوئی ایسا مقام نہیں جس کا سفر اختیار کیا جائے۔ وہ تو انتہائی پسماندہ علاقہ ہے جو سخت زبوں حالی میں مبتلا ہے بیکاری، بیروزگاری اور بیماری نے وہاں اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ صحت اور تعلیم کی سہولتوں کی وہاں انتہائی کمی ہے جرائم عام ہیں۔ آب و ہوا بیماریوں سے بھرپور ہے پینے کا پانی بھی دستیاب نہیں ہوتا مہنگائی یورپی ممالک سے بھی بڑھ رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

انہی ایام میں دفتر خارجہ اسلام آباد میں جمشید مارکر سابق سفیر پاکستان متعینہ گھانا سے میری ملاقات ہو گئی ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی وہ اس زمانے میں سفیر مقرر ہوئے تھے جب گھانا انگریزوں سے نیا نیا آزاد ہوا تھا وہ گھانا کی خوشحالی کا دور تھا قائد انقلاب اور صدر مملکت ڈاکٹر کوامے نکرومہ اس وقت ایک مسلمہ افریقی رہنما بھی تھے اور وزیر اعظم بھی پاکستان کے لئے ان کے دل میں بڑی جگہ تھی یہی سبب ہے کہ پاکستانی ڈاکٹروں' پروفیسروں' استادوں اور تاجروں کی بہت بڑی تعداد وہاں رہائش پذیر تھی اس کے علاوہ بہت سے پاکستانی وہاں کے سرکاری اور نجی اداروں میں ملازمت بھی کرتے تھے۔

جمشید مارکر وہاں بہت کامیاب سفیر ثابت ہوئے اور بعد میں دوسرے ملکوں میں بھی پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے تو وہاں بھی خوب کامیاب رہے انہوں نے مجھ سے گھانا کی بہت تعریف کی جس سے میرا حوصلہ بڑھا انہوں نے آب وہوا کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ وہاں موسم "کبھی گرم ہوتا ہے اور کبھی گرم تر" اقتصادی طور پر گھانا جمشید مارکر کی سفارت کے زمانے میں مضبوط اور مستحکم تھا اور بین الاقوامی کرنسی میں ایک ڈالر کی قیمت مقامی کرنسی کے ایک سی ڈی سے بھی کم تھی یعنی ایک ڈالر کے بدلے میں اعشاریہ پچاسی سی ڈی ملتے تھے سی ڈی مقامی کرنسی کا نام ہے انگریزی میں اسے CEDI لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر کوامے نکرومہ ۱۹۵۷ء میں آزادی کے موقع پر برسراقتدار آئے تھے وہ حکومتی پارٹی کے صدر تھے ملک کے وزیراعظم تھے پھر انہوں نے گھانا کو عوامی جمہوریہ بنایا اور اس کے پہلے صدر بنے ان کے عہد حکومت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے ان سے گھانا کو بین الاقوامی سطح پر ایک اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔

ڈاکٹر نکرومہ کے زیر قیادت جو آزادی کی جدوجہد کامیاب ہوئی تھی اس نے دوسرے افریقی ملکوں پر بھی آزادی کے دروازے کھول دیئے ڈاکٹر صاحب ایک مشنری رہنما تھے انہوں نے ذاتی مفادات کو نظرانداز کر کے ملک کی ترقی اور استحکام کے لئے

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ انہی نے غیر جانبدار ممالک کی تحریک کا تصور پیش کیا اور ان کی رہنمائی میں گھانا' بھارت' ہنگری' مصر اور انڈونیشیا اس تحریک کے بنیادی ممبر بنے۔ پاکستان نمعلوم کن وجوہ کی بناء پر اس تحریک کا ممبر اس وقت نہ بنا۔ یہ واقعہ بھی ہماری خارجہ پالیسی کا ایسا شاہکار ہے جس کے دور رس منفی نتائج مرتب ہوئے۔

ڈاکٹر نکرومہ نے افریقی ملکوں کو اتحاد و یگانگت کا تصور بھی دیا جو بعد میں آرگنائزیشن آف افریقین یونٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ ڈاکٹر صاحب قومی جذبے سے بہت سرشار تھے اور گھانا کو صحیح معنوں میں ایک خود مختار اور خوشحال ملک بنانا چاہتے تھے ان کے خیال کے مطابق کسی ملک کی صحیح معنوں میں سیاسی آزادی' اقتصادی آزادی اور خود مختاری کے بغیر قائم رہنا ممکن نہیں وہ گھانا کو غیر ملکی اقتصادی تسلط سے نجات دلانا چاہتے تھے لیکن استحصالی قوتوں سے گلو خلاصی ہونا آسان بات نہیں۔

ڈاکٹر نکرومہ کے دور میں گھانا خوشحالی کی جانب گامزن تھا تیسری دنیا اور غیر جانبدار ممالک میں گھانا مستقبل کے رہنما کی طرح ابھرتا جا رہا تھا کہ یکایک حالات نے پلٹ کھایا اور گھانا کو ادبار وفلاکت نے آ لیا رفتہ رفتہ گھانا کی خوشحالی ایک پرانا خواب بن گئی۔

ڈاکٹر نکرومہ کوئی انقلابی رہنما نہ تھے وہ صرف ترقی پسند نظریات رکھتے تھے انہیں گھانا میں جس کسی نے متعارف کرایا وہ امریکی ہاتھ ہی تھا نہ معلوم انہوں نے سی آئی اے کی ناراضگی کیسے مول لے لی اور وہ اس ایجنسی کے ریکارڈ میں ایک ناپسندیدہ شخصیت قرار دیئے گئے اب یہ ایجنسی ڈاکٹر نکرومہ کو گھانا کی حکومت سے محروم کرنے کے درپے تھی دریں اثنا کمبوڈیا میں خانہ جنگی شدت اختیار کر گئی اور سازشیوں نے ڈاکٹر نکرومہ کے خلاف ایک چال چلی انہیں یہ باور کرایا گیا کہ وہ اس جنگ کو ختم کرانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکتے ہیں اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو وہ نہ صرف افریقہ بلکہ تمام تیسری دنیا کے ہیرو بن جائیں گے۔

اگرچہ ڈاکٹر نکرومہ کو اندورن ملک حالات کا احساس تھا وہ سمجھتے تھے کہ ملک

چھوڑ کر جانا ان کے حق میں نہیں اس سے انہیں ضرور نقصان پہنچے گا مگر وہ اپنے مشیروں کی باتوں میں آ گئے جنھوں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ سب اچھا ہے نیز ستارہ شناسوں اور افریقی جادوگروں نے بھی ان سے یہی کہا کہ ان کے علم و فن کے مطابق ان کا ملک سے باہر چلے جانا بے سود ثابت نہیں ہو گا۔ اور ان کی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

آخر کار ڈاکٹر نکرومہ کمبوڈیا کی جنگ کو ختم کرانے کے لئے اپنے ملک سے باہر چلے گئے وہ ابھی چین ہی میں تھے کہ مشترکہ پولیس اور فوجی ایکشن کے ذریعے ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور اس طرح سے جن لوگوں نے عکرہ میں ان کے خلاف ڈرامہ کیا تھا' ستارہ شناسوں اور جادوگروں کو ان کے پیش کیا تھا وہ گھانا کی حکومت سے ڈاکٹر نکرومہ کو علیحدہ کرنے میں بخوبی کامیاب ہو گئے۔

میرے نزدیک یہ ڈاکٹر نکرومہ کا زوال نہیں بلکہ گھانا کا زوال تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر نکرومہ کے خلاف انقلاب لانے کو درست اقدام ثابت کرنے کے لئے ان پر مختلف الزامات لگائے گئے کبھی انہیں مارکسٹ اور سوشلسٹ کہا گیا کبھی ظالم استحصال پسند ڈکیٹٹر کے نام سے موسوم کیا گیا۔ کوئی گالی ایسی نہ تھی جو انہیں نہ دی گئی ہو مبینہ طور پر ان کے گھر سے سونے کا ایک پلنگ برآمد ہوا جس پر مادام نکرومہ آرام کرتی تھیں میاں بیوی دونوں پر مال و دولت جمع کرنے کا الزام بھی آیا غرضیکہ نئی حکومت نے اپنے اقدامات کا جواز تلاش کرتے ہوئے ڈاکٹر نکرومہ کو ایک ہیرو کی بجائے ولین کے طور پر پیش کیا۔

قدرت خدا یہ انقلاب بھی چند روزہ ہی کا تھا اگرچہ امریکہ کی کوشش تو یہی تھی کہ گھانا میں اس کی پسند کی حکومت آئے لیکن ایسا نہ ہو سکا ایک انقلاب کے بعد دوسرا پھر تیسرا انقلاب آیا جیسے جیسے انقلابات برپا ہوتے رہے ملکی نظام حکومت اور قومی سیاست کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی مہنگائی' بیکاری اور بے روزگاری نے وہ رنگ جمایا کہ پورا ملک جرائم کی آماجگاہ بن گیا مفلسی اور بیماری اس

پر مستزاد تھی ایسے ناگفتہ بہ اور مخدوش حالات میں ۱۹۷۹ء کو فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ایک کونسل کے ذریعے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی پھر دو ماہ میں عام انتخابات منعقد کروا کے زمام حکومت اکثریتی پارٹی کو سونپ دی۔ لیکن افسوس یہ دور بھی رشوت ستانی' مہنگائی اور انتہائی بد نظمی کا شکار ہو گیا چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کی رات کو فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ نے پھر ایک انقلاب برپا کیا اور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی جس پر تمام لوگوں نے چین اور سکھ کا سانس لیا اب گھانا ایک نئے دور میں داخل ہوا اور امید پیدا ہوئی کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی بین الاقوامی ساکھ کو پھر بحال کر لے گا اور اپنے وقار گم گشتہ اور پر شکوہ عہد رفتہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک گھانا کی زندگی میں جو موثر اور خوشگوار تبدیلیاں آئیں وہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں ان کی بناء پر میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ چیئرمین رالنگ کی قیادت میں اب گھانا ایک مضبوط اور مستحکم مملکت بن جائے گا۔

خستہ حال اور شکستہ ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کی تعمیر کا کام جاری ہے ٹیلیفون کا نظام بھی درست ہو چکا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ٹیلیفون کا نظام بالکل نیا اور مکمل ہے تو زیادہ صحیح ہو گا گھانا کی فضائی پرواز بھی اب انٹرنیشنل سطح پر ہے ڈاک کا نظام بھی اب نہایت عمدہ ہے اور کام کو برق رفتاری سے انجام دینے کے لئے بسوں اور گاڑیوں وغیرہ کا معقول انتظام کر دیا گیا ہے۔

۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک تین سال کی مدت کے دوران گھانا میں تین عمدہ اور فیشن ایبل نئے ہوٹل بنے درآمدی پوزیشن پہلے کے مقابلے میں نسبتاً بہتر ہے زرمبادلہ کی درآمد و برآمد قانونی ہے بجلی کی پیداوار میں بھی خوب اضافہ ہوا ہے اور زراعت کے شعبے نے بھی خاصی ترقی کی ہے۔

مغربی ذرائع ابلاغ اب گھانا کے شب و روز کا تواتر سے ذکر کرتے اور اس کو

سراہتے رہتے ہیں اب گھانا پر مغربی امداد و نوازشات کا نیا در کھلا ہے اب اس کی حکومت نہ تو سوشلسٹ ہے نہ مارکسٹ ہے مغربی ممالک گھانا کو ایک ماڈل ملک بتاتے ہیں اور ہر شعبے میں اس کے ممد و معاون بن گئے ہیں کوریا' جاپان' جرمنی' فرانس' امریکہ' ورلڈ بنک' انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ اور تمام امداد دینے والی ایجنسیوں کے نزدیک گھانا ایک مثالی افریقی ملک ہے۔

یہ مغربی دنیا کا کرشمہ ہے کہ کل تک جو ملک ناپسندیدہ تھا۔ آج وہ مقبول و محبوب ہے۔

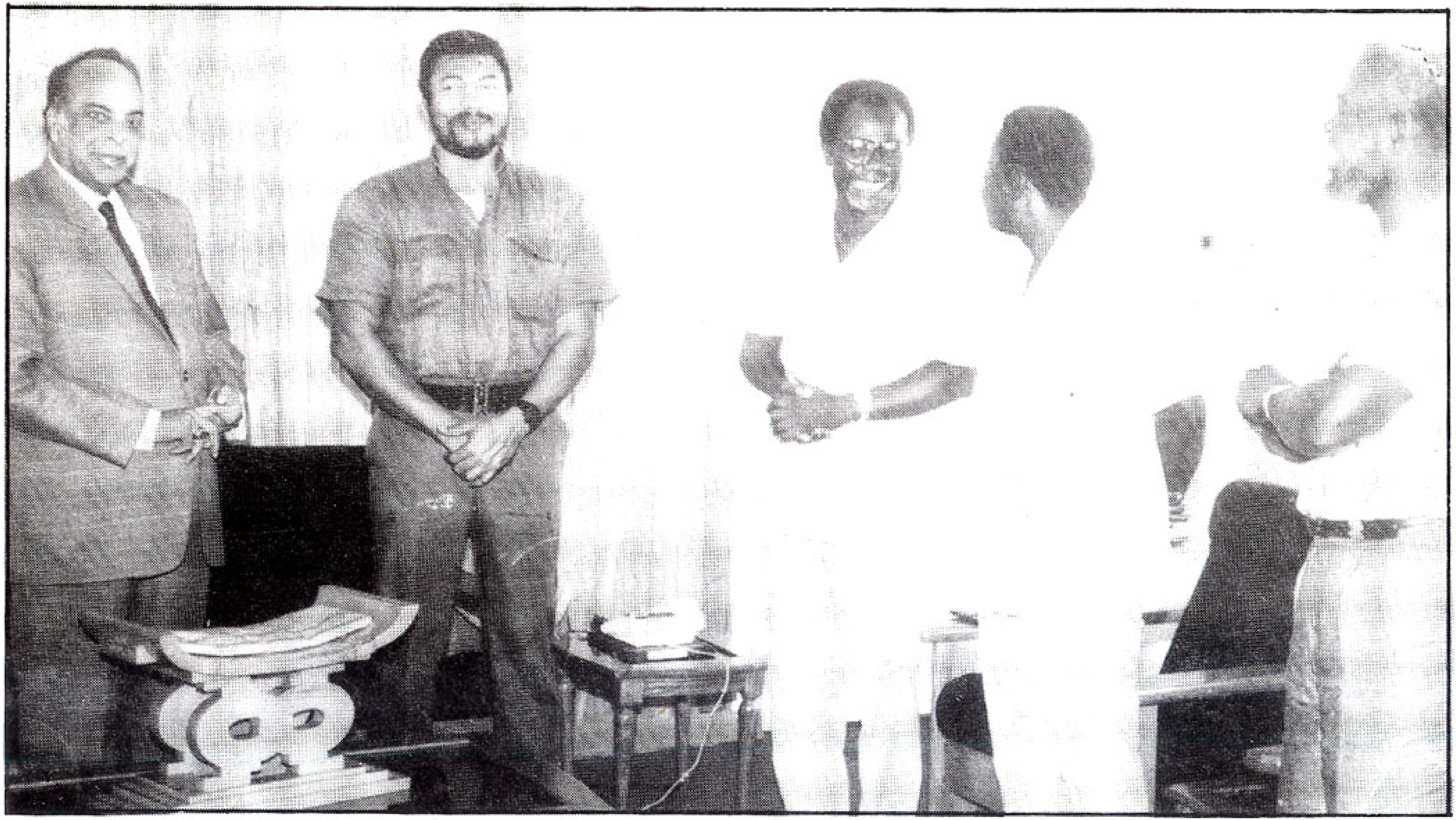

سیکرٹری خزانہ ڈاکٹر یا چوے' پی وی اوبنگ' مسٹر اینکوا چیف آف پروٹوکول' صدر مملکت' سفیر پاکستان
صدر مملکت سے الوداعی ملاقات 22 اپریل 1989

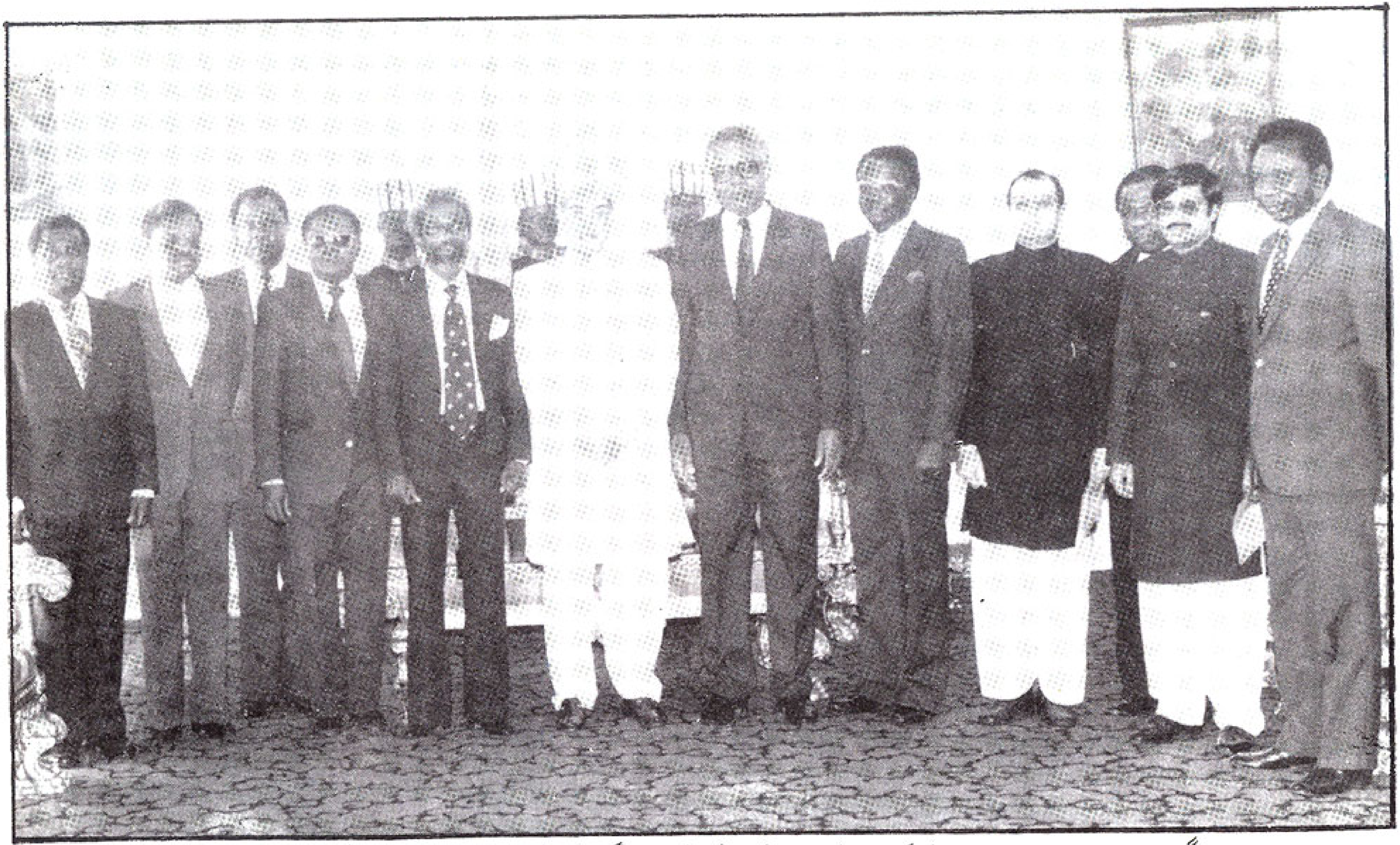

14 اگست 1986 اسناد سفارت پیش کرنے کے بعد پاکستانی مشن اور گھانا کی حکومت کے ارکان کا گروپ فوٹو
پاکستان کے سفیر اور مسٹر جسٹس انان ساتھ ساتھ کھڑے ہیں

منکسم کا حاجی احمد ذکی

گھانا کے دارلحکومت عکرہ سے کوٹ ڈی وار (آئیوری کوسٹ) کے دارالحکومت (ABIDJAN) عابد جان جاتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹا سا قصبہ آتا ہے جس کا نام منکسم MENKASSEM ہے۔ یہ قصبہ آس پاس کے اکثر دیہات کے لئے اہم مرکزی منڈی' کی حیثیت رکھتا ہے۔ سڑک کے بالکل کنارے پر واقع ہے بلکہ سڑک کے بائیں اور دائیں دونوں طرف پھیلا ہوا ہے۔

عکرہ سے منکسم کی مسافت کوئی اڑھائی گھنٹے کی ہے۔ اس سڑک پر دنوں جانب زراعتی اور پولٹری فارم بھی ہیں۔ زیادہ تر فارم لبنانی اور سندھی ہندوؤں کے پاس ہیں جو اپنی ضرورت کے مطابق ان فارموں کو چلاتے ہیں مویشیوں کے فارموں میں صرف چند ایک گائیں بھی نظر آتی ہیں۔ ڈیری فارم خشک ہی رہتے ہیں۔ البتہ زراعتی اور پولٹری فارم صحیح حالت میں ہیں اور ٹھیک چلتے ہیں۔

منکسم اور اس کے اردگرد کے دیہات میں اکثریت مسلمان آبادی کی ہے یہ قصبہ اگرچہ محمد بن قاسم کے نام سے موسوم ہے تاہم مقامی طور پر اس کا تلفظ منکسم ہے یہاں قصبے کے ایک معزز شخص حاجی عبد الحمید نے اپنی زمین پر اپنی گرہ سے ایک مسجد تعمیر کی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک مدرسہ بھی بنایا ہے مدرسے میں ایک معلم بچوں کو ناظرہ قرآن شریف پڑھاتا ہے حاجی عبد الحمید اپنے قبیلے کے چیف بھی ہیں نیحد شریف اللہ اور اسلام کے شیدائی حافظ قرآن بھی ہیں۔ وہ اپنی بنا کردہ مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں۔ یہ مسجد اور مدرسہ ایک بڑا سا کمرہ ہے جسے پختہ سیمنٹ کے بڑے

بڑے بلاکوں سے بنایا گیا ہے اس مدرسہ میں طلبا کے لئے میں نے قرآن شریف کے ۵۰ نسخے مشن کی جانب سے مہیا کیے یہاں لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کرتی ہیں انہیں لکھنے اور پڑھنے کے علاوہ سینے پرونے اور کڑھائی کرنے کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ مدرسہ کا یہ حصہ جو اس کے ساتھ ہی واقع ہے دوکیشنل سکول کہلاتا ہے ۱۹۸۷ء میں یہاں سترہ طالبات زیر تعلیم تھیں اگرچہ سلائی کی مشینیں کم تھیں۔ تاہم جوں توں کر کے کام چلایا جا رہا تھا۔ اس تمام کمپلیکس کو جس کا ایک بھی کمرہ مکمل نہ تھا من کسم مسلم سکول کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ سکول کمیٹی چند افراد پر مشتمل ہونے کے باوجود صرف ایک فرد تک محدود تھی۔ اس کا نام حاجی احمد ذکی تھا یہ شخص ایک مصری معلم تھا جو مدرسے میں بچوں کو قرآن شریف کی ناظرہ تعلیم دیتا رہا تھا۔ اس مدرسے میں چار سال سے چلا آتا تھا جیسا کہ اس سے پہلے مسجد کی تعمیر کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس کی بنا حاجی عبد الحمید نے رکھی اور اسے تعمیر کیا۔ اسی طرح سے ہمت کر کے حاجی احمد ذکی نے مسجد سے ملحق مسلم سکول کی بناء اور تعمیر کی خدمت انجام دی حالت یہ تھی کہ سیمنٹ کے بلاک باہم جوڑ کر ایک جگہ کا احاطہ کر لیا گیا تھا جہاں بیٹھ کر درس و تدریس کا کام کیا جا سکے۔ بے سروسامانی کے باعث مدرسے کی مکمل چاردیواری بھی تعمیر نہ کی جا سکی تھی۔ ایسی صورت میں تو چھت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بچے نیلگوں آسمان کے نیچے دھوپ سے تپتی ہوئی زمین پر ننگے پاؤں بیٹھ کر لکھتے پڑھتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے اس مدرسے میں بچوں کی تعداد تین سو سے اوپر تھی قرآن مجید کے ساتھ ساتھ گھانا کے تعلیمی سلیبس کے مطابق دیگر مضامین منجملہ انگریزی فرانسیسی اور سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی

حاجی احمد ذکی بے حد محنتی اور مخلص آدمی تھا اس سے میری ملاقات ۱۹۸۷ء میں ہوئی تھی وہ مجھے میرے دفتر میں ایک تقریب کا دعوت نامہ پہنچانے آیا تھا۔ چھوٹے سے قد کا ایک محنتی سا شخص سر کے بال بکھرے ہوئے پاؤں میں ہوائی چپل پہنے ہوئے داڑھی بڑھی ہوئی اور پاؤں گھسیٹتے میرے دفتر میں داخل ہوا کہ جیسے پاؤں میں چپل

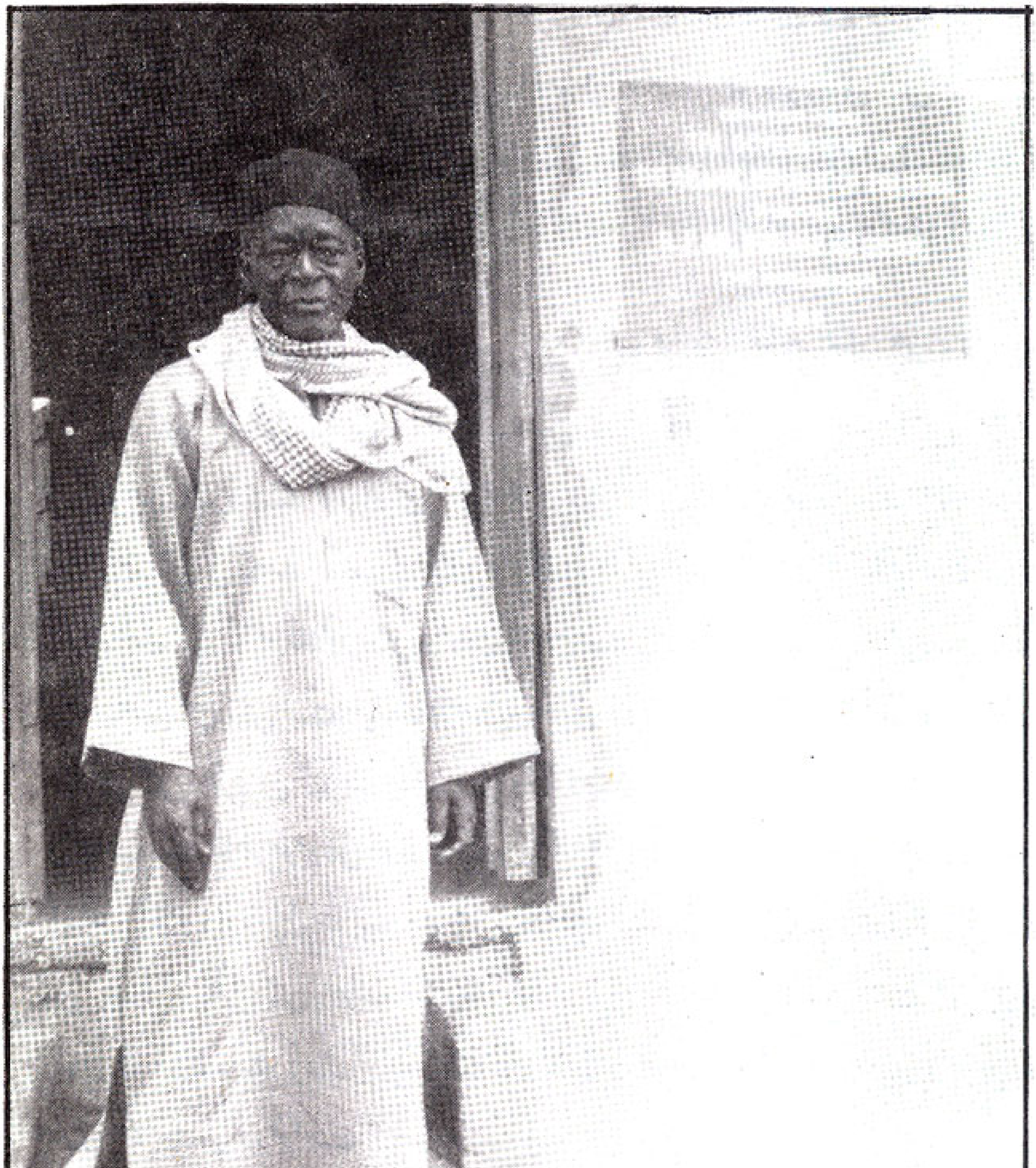

حاجی عبدالحمید جس نے منکم میں مسجد اور مدرسے کی بنیاد رکھی

پہننے کے باعث اسے چلنے میں دشواری پیش آ رہی ہو۔ اس نے عربی لہجے میں لیکن انگریزی زبان میں مجھ سے اپنا تعارف کرایا اور دعوت نامہ میری طرف بڑھا دیا۔

حاجی احمد ذکی کو میرے دفتر میں شیخ محمد انور عبد الروحو ABDUL RUHU MOHAMMAD ANWER سعودی عرب کے سفارت خانے کے چارج ڈی افیرز نے بھیجا تھا۔ ان دنوں منکسم میں ایک اسلامی کانفرنس ہو رہی تھی جس کا مقصد مدرسے کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ میں نے سعودی چارج ڈی افیرز سے صلاح و مشورہ کر کے اسلامی کانفرنس میں شریک ہونے کا وعدہ کر لیا۔ یہ دعوت نامہ اس کانفرنس کے لئے تھا۔

کانفرنس کے مقررہ دن سعودی چارج ڈی افیرز محمد انور مصری سفیر شلبایا اور میں من کسم پہنچ گئے کھلے آسمان کے نیچے ناریل کی ٹہنیوں کی چھاؤں میں مسلمان عورت مرد بچے بوڑھے اور جوان سبھی لکڑی کے تختوں پر بیٹھے ہوئے تھے معزز مہانوں کے لئے ٹین کی چھت کے نیچے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ مصر سے دو عالم آئے ہوئے تھے جو گھانا کے مسلم علاقوں میں دعوت اسلام کے لئے دورہ کرنے کی غرض سے یہاں پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک عالم دین حاجی ذکی اور ہم تینوں سفیروں نے اس کانفرنس میں تقریریں کیں۔ چندے کی درخواست پر سعودی عرب اور مصر کے مشن کی جانب سے خاطر خواہ مالی امداد کا وعدہ کیا گیا اس کے ساتھ ہی مصری سفیر نے سلائی کی چھ مشینیں اور کپڑے کے چند تھان طالبات کے لئے ہدیے کے طور پر پیش کئے میں نے اپنی تقریر میں صرف اتنا وعدہ کیا کہ اپنی حکومت سے اس سلسلے میں رجوع کروں گا کہ مدرسے کی امداد کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کیا جائے اور امید ظاہر کی کہ ہماری حکومت یہ درخواست منظور کر لے گی۔

عکرہ واپس آتے ہی میں نے مدرسے کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کی اور حاجی احمد ذکی کے بارے میں لکھا کہ وہ ایک درد مند اور مخلص شخص ہے میں نے اپنی زندگی میں اتنا پرخلوص اور بے لوث شخص کبھی نہیں دیکھا معمولی سی تنخواہ پر یہ شخص اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک جنگل بیابان میں بیٹھا درس و تدریس کے

فرائض انجام دے رہا ہے یہاں ایک ناتمام چھوٹا سا کمرہ ہے جس سے مدرسے کا کام لیا جا رہا ہے جہاں نہ روشنی ہے اور نہ ہوا کا گذر اس کمرے کے فرش کو اس شخص نے اپنا بستر بنا رکھا ہے اسی پر سوتا جاگتا ہے اور یہیں طلبہ کو لکھاتا پڑھاتا ہے یہ بھی لکھا کہ وہ یہاں چار سال سے مقیم ہے۔ اس عزم و استقامت کے ساتھ اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ اسے منکسم میں ایک مدرسے کی تعمیر کو مکمل کرنا ہے وہ دن رات کام کر رہا ہے۔

حاجی احمد ذکی کے لئے مقامی لوگوں نے بھی ایسے ہی محبت آمیز اور عمدہ خیالات و جذبات کا اظہار کیا تھا۔ ان کی راست بازی دیانت داری اور مخلصانہ خدمات کو بیحد سراہا تھا حاجی ذکی قاہرہ میں ایک سکول ٹیچر تھا وہیں بودوباش رکھتا تھا۔ وزارت تعلیم نے ڈیپوٹیشن پر افریقہ جانے کے لئے اساتذہ سے درخواستیں مانگیں تو اس نے بھی نہایت اصرار سے درخواست پیش کی اور کوشش کر کے اپنی تعیناتی بطور مدرس عکرہ کروا لی۔ قاہرہ اور من کسم کے درمیان تہذیبی اور ثقافتی فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا کراچی اور چوہڑکانے میں یہ شخص درس و تدریس میں اتنا شغف رکھتا ہے کہ اپنے وطن قاہرہ کو بھول گیا ابتدائی تعیناتی کے تین سال کے دوران وہ ایک دفعہ بھی قاہرہ نہ گیا تھا بلکہ سکول میں مقیم رہا۔

حاجی احمد ذکی نے بڑی معصوم طبیعت پائی ہے اس کی گفتگو نہایت شائستہ اور شستہ تھی مزاج میں تمکنت ذرا نہیں انکسار اتنا ہے کہ کوئی بات کرنے سے پہلے کئی کئی بار معافی مانگتا ہے اور یہ طرز عمل اس کی فطرت ثانیہ بن چکا ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مدرسے کی تعمیر اور توسیع کا جنون کی حد تک متمنی ہے اور اس کے لئے شاید بھیک مانگنے میں بھی عار محسوس نہ کرے گا۔

میں نے مدرسے کے بارے میں تفصیلی رپورٹ اپنی حکومت کو بھیج دی اس کی ایک نقل وزارت مذہبی امور کو بھی ارسال کر دی ایک ذاتی خط کے ذریعے وزارت مذہبی امور پاکستان کے وفاقی وزیر سے پر زور سفارش کی کہ اس مدرسے کے

لئے معقول رقم مختص کی جائے الحمد و للہ کہ وزیر موصوف نے فوری طور پر ایک لاکھ روپیہ مدرسے کے لئے بھیجدیا جہاں تک مجھے یاد ہے مذکورہ رقم میری رپورٹ کے موصول ہو جانے کے پندرہ دن کے اندر اندر بھجوا دی گئی تھی اور میں نے یہ رقم سعودی عرب کے چارج ڈی افیرز کے ذریعے حاجی عبد الحمید اور حاجی احمد ذکی کے حوالے کر دی مجھے خوشی ہے کہ یہ رقم بالکل صحیح مدات میں خرچ ہوئی اور مدرسے کے کمرے بڑی سرعت کے ساتھ تعمیر ہونے لگے۔ اگلے بجٹ میں پچاس ہزار کی مزید گرانٹ آگئی پھر دوبارہ ایک لاکھ روپے کی گرانٹ اور آئی جس سے مدرسے کی تعمیر تقریباً مکمل ہو گئی۔

۱۹۸۷ء میں مدرسے کی تعمیر ہو رہی تھی کہ حاجی احمد ذکی کو حکومت مصر نے واپس بلا لیا۔ اس پر گھانا کی حکومت نے درخواست کی کہ حاجی احمد ذکی کا تبادلہ روک دیا جائے جسے مصر کی حکومت نے منظور کر لیا اور حاجی احمد ذکی کو مزید ایک سال کے لئے گھانا میں رہنے دیا محنت دیانت خلوص اور لگن بجائے خود سفارش تھیں مگر یہ سفارش کچھ زیادہ عرصے تک نہ چل سکی۔ ۱۹۸۸ء میں مصری حکومت نے حاجی احمد ذکی کو پھر واپس بلا لیا۔ اگرچہ انہوں نے مدرسے کی تعمیر کو مکمل ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھا مگر روشنی کے لئے بجلی لگانے کا کام ابھی باقی تھا جس کی حسرت لے کر وہ واپس مصر چلے گئے۔

میں نے مشن کی جانب سے حکومت مصر سے درخواست کی کہ حاجی احمد ذکی کو ایک سال اور دے دیا جائے مگر مصر کی حکومت نے یہ سفارش نامنظور کر دی دوبارہ سہ بارہ گھانا کے محکمہ تعلیم نے بھی اس سلسلے میں سفارش کی لیکن مصری حکومت نے اسے بھی پذیرائی نہیں بخشی۔ نوکر شاہی کا اپنا ہی ایک انداز ہے۔

حاجی احمد ذکی کے مصر چلے جانے سے کچھ کام ادھورا ہی پڑا رہ گیا بجلی مدرسے کے کمروں میں نصب ہوتے ہوتے رہ گئی اس پر ستم یہ ہوا کہ شدید برسات شروع ہو جانے سے مدرسے کی عمارت سخت متاثر ہوئی نشیب میں واقع ہونے سے وہاں بارش کا

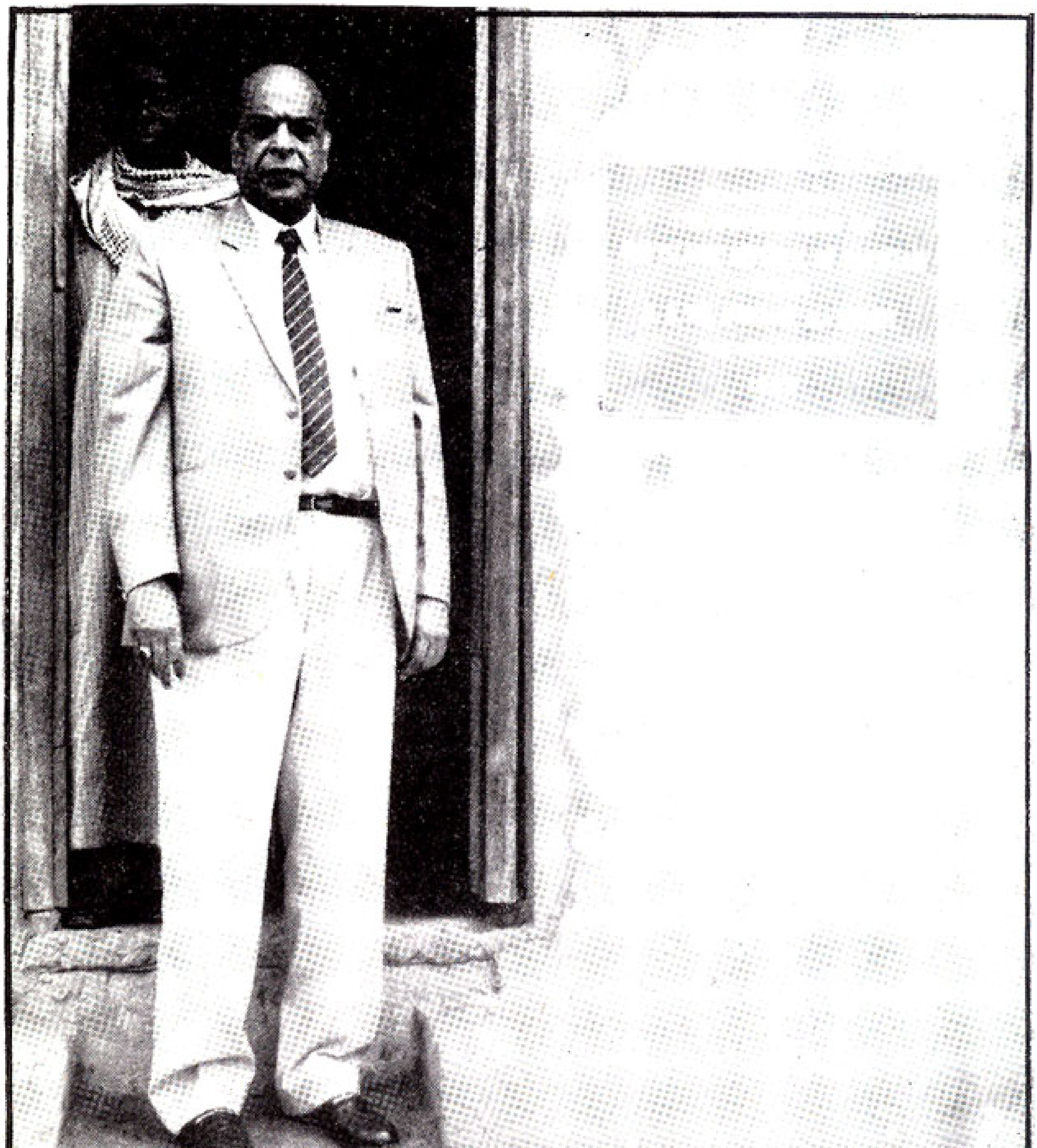

منکم مسلم سکول دفتر کے باہر

پانی بھر گیا۔ اگرچہ مدرسے کی عمارت سے خدا خدا کر کے پانی کا نکاس ہو گیا اور تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا مگر حاجی احمد ذکی کی عدم موجودگی کے باعث تین چار ماہ ناحق ضائع ہو گئے اور کام کی رفتار بھی متاثر ہوئی۔

مدرسے کی نگرانی کے لئے ہفتے میں کم از کم ایک بار مجھے من کسم جانا پڑتا تھا جب گھانا کے محکمہ تعلیم نے اس میں بذات خود گہری دلچسپی لینی شروع کی تو ہماری بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ محکمہ تعلیم کے افسران بھی مدرسے کا معائنہ کرتے رہتے۔ وہاں کم سے کم معیار کا سکول جونیئر سیکنڈری سکول ہے۔ پرائمری مڈل اور ہائی سکول کو رجسٹر نہیں کیا جاتا۔ منکسم سکول کو جونیئر سیکنڈری سکول تک پہنچنے میں ابھی مزید کچھ وقت لگے گا۔ جب میں ۱۹۸۹ء میں واپس آیا تو میں مطمئن تھا کہ سکول کو جونیئر سیکنڈری سکول کی سطح تک لے جانے کے لوازمات پورے ہو چکے تھے۔ یعنی پاکستان کی مدد سے ایک ہال کمرہ بھی بن گیا تھا۔

غریب ملک ۔ مفت تعلیم

گھانا میں تعلیم پر بہت زور دیا جاتا ہے وہاں تعلیم عام بھی ہے اور مفت بھی۔ ۴۷ فیصد شہری آبادی تعلیم یافتہ ہے۔ جونیئر سیکنڈری سکول میں تعلیمی نصاب کے ساتھ ساتھ طالب علم کو کوئی مفید فن اور ہنر بھی سکھایا جاتا ہے تاکہ وہ جب فارغ التحصیل ہوں تو اپنی روزی آسانی سے کما سکے اور گھانا کی سوسائٹی میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکے۔ نیز معاشی لحاظ سے ملک و قوم کو مضبوط کرنے میں مدد بہم پہنچا سکے۔

عکرہ کے قریب ایک یونیورسٹی ہے جس کا نام لیگان یونیورسٹی ہے یہاں عمرانی علوم پڑھائے جاتے ہیں یہ یونیورسٹی صرف انہی علوم کی درس و تدریس کے لئے مخصوص ہے اس کے علاوہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی یونیورسٹی کماسی میں ہے۔ جو عکرہ سے کوئی تین گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ اور تیسری یونیورسٹی کیپ کوسٹ کے نام سے یاد کی جاتی ہے یہ تینوں یونیورسٹیاں درس و تدریس اور نظم و نسق کی خوبیوں کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں ان یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبہ کو امریکہ برطانیہ ور فرانس غرضیکہ بین الاقوامی سطح پر کسی بھی یونیورسٹی میں مزید تعلیم کے لئے داخلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ انہیں بڑی آسانی سے داخلہ مل جاتا ہے۔ اور سکالر شپ بھی۔ گھانا کی یونیورسٹیوں کی ڈگریاں بیرون ملک ملازمت کے لئے بھی قابل قبول ہوتی ہیں۔

طلبہ کی یونین ہر یونیورسٹی میں موجود ہے لیکن یہ صرف طلبہ کے مسائل کی نشاندہی کرنے کے لئے آواز بلند کرتی ہے ملک کے سیاسی معاملات میں داخل نہیں دیتی ذریعہ

تعلیم اگرچہ انگریزی ہے تاہم فرانسیسی بھی پڑھائی جاتی ہے تعلیم کے اوقات میں کبھی کبھار اور شاذ ونادر ہی کوئی طالب علم کلاس سے باہر نظر آتا ہے ورنہ طلبہ اپنی اپنی کلاسوں میں موجود ہوتے ہیں برآمدوں میں گھومتے نظر نہیں آتے۔ نہ ہی لان میں ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے ہوتے ہیں۔

گھانا میں اگرچہ سگریٹ پینا عام ہے مگر یونیورسٹی کے طلبہ پر سگریٹ پینے کی پابندی نہ ہونے کے باوجود لڑکے کیمپس میں سگریٹ بالکل نہیں پیتے تمام یونیورسٹیوں میں سڑکیں بے حد ہموار روشیں صاف ستھری اور سبزہ زار خوشنما گھاس کے خوبصورت وسیع و عریض تختے جو رنگا رنگ پھولوں کی کیاریوں سے آراستہ اور پیراستہ ہوتے ہیں۔

یونیورسٹیوں کی فضا نہایت خوشگوار ہے طلبہ عام طور پر پیدل آتے جاتے ہیں ان کے پاس کاریں نہیں ہوتی ہیں اگر کوئی ہوتی بھی ہے تو یونیورسٹی کی حدود سے باہر پارکنگ ایریا میں کھڑی کی جاتی ہے۔ آب وہوا کے لحاظ سے بھی یونیورسٹیوں کا محل و قوع بہت خوب ہے پورا ماحول ہر طرح کی گندگی آلودگی اور کثافت سے پاک ہے۔

طلبہ میں اتفاق ہے۔ وہ باہم متحد رہتے ہیں اور ان کی کبھی کوئی باہمی رقابت نظر نہیں آتی۔ اور نہ ہی ان میں کسی گروہ بندی کا نشان ہے ۸۸۔۱۹۸۷ء میں حکومت نے بچت کے پیش نظر اعلان کیا کہ آئندہ سال سے طلبہ کو رعائتی نرخوں پر کھانا مہیا نہ کیا جا سکے گا اس پر طلبہ نے تینوں یونیورسٹیوں میں بیک وقت ہڑتال کر دی جو نہایت پر امن رہی۔ وہاں نہ کوئی لاٹھی چارج ہوا نہ آنسو گیس پھینکی گئی نہ کسی کا سر پھوٹا نہ ہاتھ ٹوٹا اور نہ کوئی طالب علم زخمی ہوا انتہائی تہذیب و شائستگی کا مظاہرہ کیا گیا۔ حکومت کی جانب سے پورے صبر و تحمل کا مظاہرہ ہوا۔ اور غور و خوض کے بعد طلبہ کا مطالبہ مان لیا گیا۔

گھانا میں تعلیمی اداروں میں حکومت کی سرپرستی میں طلبہ کے لئے کھانے پینے کی چیزوں کی کینٹین قائم ہیں۔ اگرچہ کھانے پینے کی چیزوں کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے تاہم قیمت بہت کم ہوتی ہے بلکہ نصف نرخوں سے بھی کم قیمت پر کھانا مہیا کر دیا جاتا ہے باقی قیمت حکومت خود ادا کرتی ہے اور کھانے کی قیمت بھی خود حکومت ہی نے مقرر کر رکھی ہے۔ اس سے زیادہ قیمت کوئی نہیں لے سکتا۔ مہنگائی بڑھنے کے باعث کینٹین والوں نے جب اشیاء کے نرخ بڑھا دینے کی درخواست کی تو حکومت نے بازاری قیمتوں کا جائزہ لے کر اشیاء کے نرخوں میں اضافہ کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ لیکن جب طلبہ کو معمول کے خلاف اشیاء کی قیمت کچھ زیادہ ادا کرنا پڑی تو انھوں نے اس کے خلاف احتجاج کر دیا۔ آخر کار دو ہی روز میں یہ معاملہ اس طرح طے کر دیا گیا کہ قیمت جوں کی توں وہی رہی البتہ کینٹین والوں کو ادائیگی کرتے ہوئے حکومت نے اپنا حصہ زیادہ کر دیا جس سے طلبہ کو زیادہ قیمت ادا نہ کرنا پڑی۔

طلبہ کے پرامن احتجاج کی بات چلی ہے تو بر سبیل تذکرہ ایک بات اور بھی سن لیجئے جب لیبیا پر امریکہ کا فضائی حملہ ہوا تو اس کے خلاف گھانا کے طلبہ نے احتجاج کے طور پر ایک جلوس نکالا جو بیحد پرامن رہا جلوس نکالنے سے پہلے جلوس کا راستہ متعین ہوا۔ پھر تاریخ وقت اور دورانیہ بھی طے کیا گیا۔ پھر ایک ضابطے' قاعدے اور حد میں رہتے ہوئے جلوس نکالا گیا جو امریکی سفارت خانے کے باہر پہنچ کر پرامن طریقے سے ختم ہو گیا۔ جلوس کے دوران سواریوں' پیدل چلنے والوں اور گاڑیوں کی آمدورفت برابر جاری رہی کہیں سڑک کو روکا یا بند نہیں کیا گیا۔ سڑک کے ایک طرف جلوس کے مظاہرین چلتے رہے جن کے ہاتھوں میں گتے کے بڑے بڑے کتبوں پر مختلف نعرے اور مطالبے لکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف راہگیر' پیدل اور سوار بڑے اطمینان کے ساتھ چلتے رہے۔ اس جلوس نے کوئی توڑ پھوڑ کی نہ کسی کو آگ لگائی نہ کسی کو مارا پیٹا اور زخمی کیا اور نہ ٹائر جلا کر سڑک خراب کی نہ راستہ روکا۔

جلوس جب امریکی سفارت خانے کے قریب پہنچا تو باہر کھڑے ہو کر لیبیا کے سفیر برادر عبداللہ نے امریکی حملے کی مذمت کی جس کے بعد جلوس بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔

گھانا کے طلبہ تعلیم کا بیحد شوق رکھتے ہیں اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہاں لائبریریوں کا استعمال عام ہے مقامی طور پر کتابوں کی اشاعت کا کوئی انتظام نہیں۔ جملہ مضامین کی تمام کتابیں باہر سے منگوائی جاتی ہیں اور چونکہ ایک عام طالب علم درآمدی اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے محکمہ تعلیم کی برابر یہ کوشش ہوتی ہے کہ یونیورسٹی اور کالج کی لائبریری میں ہر موضوع کی زیادہ سے زیادہ کتابیں موجود ہوں تاکہ طلبہ ان کا بخوبی مطالعہ کر سکیں اور مطلوبہ کتاب کے حصول کے سلسلے میں انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

گھانا میں کتابوں کے جمع کرنے کی مہم سارا سال چلتی رہتی ہے۔ طلبہ اپنے طور پر کتابیں اکٹھی کرتے ہیں۔ اساتذہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے کتابوں کا ذخیرہ الگ مہیا کرتے ہیں کہیں سفارت خانوں کو خط لکھے جاتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے ملک کی طرف سے گھانا کو کتابوں کا عطیہ دیں۔ تو کہیں ــ صاحبان ثروت سے کتابیں مہیا کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔ گھانا میں کتابوں کی درآمد کے لئے اگرچہ بجٹ نہ ہونے کے برابر ہے تاہم حیرانگی کی بات ہے کہ یونیورسٹیوں میں ہر موضوع اور ہر مضمون پر قدیم و جدید، نئی اور پرانی کتابیں مل جاتی ہیں۔ وہاں کتابیں گھر لے جانے کا رواج نہیں نہ ہی اجازت لوگ لائبریریوں ہی میں بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہیں ریڈنگ روم نہایت صاف ستھرے اور ہوا دار ہیں۔ کتابوں کے ورق پھاڑ کر لے جانے کا کوئی رواج نہیں ہے فوٹو سٹیٹ مشین نہ ہونے کے باوجود کتابیں چوری کرنے کا کسی کو خیال تک نہیں آتا۔ طلبہ یونیورسٹی اور اس کی عمارت کو قوم کی ملکیت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح دیگر املاک کو بھی قوم کی امانت خیال کرتے ہیں۔ اس لئے کبھی اور کسی حال میں بھی انہیں نقصان پہنچانے کی ہرگز کوشش نہیں کرتے۔

یہ ۱۹۸۸ء کا ذکر ہے کہ کیپ کوسٹ یونیورسٹی کے طلبہ نے حکومت سے احتجاج

کیا کہ اس نے مبینہ طور پر تعلیم کے لئے مختص کئے ہوئے بجٹ میں تخفیف کر دی ہے جو صحیح اقدام نہیں۔ یہ احتجاج تحریری طور پر تھا جو طلبہ یونین کی طرف سے بھیجا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی یونین نے ایک خط کے ذریعے سربراہ مملکت سے ملاقات کے لئے وقت بھی مانگا تھا مگر صدر مملکت فلائٹ لیفٹیننٹ جے جے رالنگ نے طلبہ کے وفد کو عکرہ بلانے کی بجائے ان سے یونیورسٹی میں خود جا کر ملنے کے لئے ایک تقریب کا اہتمام کیا۔

اس تقریب میں سفیر صاحبان بھی بلائے گئے یونیورسٹی آڈیٹوریم میں ایک ہزار سے زیادہ طلبا جمع تھے۔ یونین کے رہنماؤں نے بغیر کسی جھجک کے بلا خوف و خطر غیر مبہم انداز میں اپنا مانی الضمیر سربراہ مملکت سے بیان کر دیا طلبہ کی تکالیف کا ذکر کیا اور بہت سے گلے شکوے کئے اور بعض طلبہ نے گستاخی کے لہجے میں حکومت کی تعلیمی پالیسی پر نقطہ چینی بھی کی۔ یونین کے صدر نے بجٹ کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے گرانٹ میں اضافے کا مطالبہ کیا۔ اور نہایت بے رحمی سے حکمت عملی کا تجزیہ بھی کیا اور کہا کہ گھانا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر طلبہ کی تعداد کے تناسب سے دفاعی اور فوجی اخراجات میں کمی کی جائے اور تعلیم کے بجٹ میں اضافہ کیا جائے جو ناگزیر ہے یونین کے صدر نے ملک میں سیاسی عمل کے تعطل اور جمود کے خلاف بھی آواز بلند کی اور مطالبہ کیا کہ لوکل کونسلوں کے انتخابات فوراً کرا دیئے جائیں۔

سربراہ مملکت نے ان سب تقریروں کو بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سنا پھر جب خود تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک ایک کر کے سب کا جواب دیتے چلے گئے۔ انہوں نے تعلیمی بجٹ کے بارے میں مثبت انداز میں گفتگو کی اور گھانا کے محدود وسائل کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ”تعلیمی گرانٹ میں اضافے کے لئے طلبہ اگلے سال تک انتظار کریں اور یہ کہ دفاعی بجٹ میں کمی کرنا قوم کے مفاد میں نہیں۔“ سربراہ مملکت نے کہا ”طلبہ کو کتابوں کی ضرورت ہے اور قومی دفاع کے لئے بندوقوں کی اب طلبہ خود فیصلہ کریں کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟“ انہوں نے طلبہ سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ ”کیا آپ

کتابوں اور صرف کتابوں سے قومی سلامتی کا کام کر سکتے ہیں کیا ان سے دفاع ہو سکتا ہے۔" انہوں نے دلائل دے کر طلبہ کر بتایا کے ان کی حکومت ملک کے محدود وسائل کے پیش نظر قومی سلامتی' دفاع اور تعلیم کے بجٹ کو متوازن رکھنے میں مصروف ہے اور دفاع کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے فکر مند بھی ہے۔ تعلیم اور قومی دفاع ایک ہی بات ہے اور دونوں لازم وملزوم ہیں۔

تقریر خاصی طویل تھی مگر جب سربراہ مملکت آڈیٹوریم سے باہر نکلے تو سب کے سب طلبہ ان کے خیالات سے متفق ہو کر ان کے ہمنوا بن چکے تھے کانفرنس کے اختتام کے بعد سربراہ مملکت بلا تامل طلبہ میں گھل مل گئے اور ان سے بے تکلفانہ گفتگو کرتے رہے طلبہ نے اپنے مسائل کے حق میں نہ تو نعرے لگائے نہ بیجا خوشامد کر کے داد کے ڈونگرے برسائے دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوتی رہی وہ مثبت انداز ہی میں ہوتی رہی ۔ اسی شام ٹی۔ وی پر اس تقریب کو مکمل کوریج دی گئی جس میں طلبہ کے مطالبات اور ان کے احتجاج کے مناظر اور اس کے جواب میں حکومت کا مثبت جواب اور مناسب طرز عمل متوازن انداز میں پیش کیا گیا۔ اگلے روز اخبارات نے بھی اس تمام کاروائی کو موثر طریقے سے شائع کیا۔ سمجھ سوچ کر اداریئے لکھے گئے۔ ذرائع ابلاغ نے بھی کیپ کوسٹ یونیورسٹی کے طلبہ اور سربراہ مملکت کے درمیان ہونے والی گفتگو کے کسی بھی پہلو کو نظرانداز کئے بغیر لفظ بلفظ نشر کیا اور کوئی پہلو تشنہ نہ چھوڑا تقریب کے بعد مہمانوں کی تواضع چائے سے کی گئی صدر مملکت مہمانوں اور طلبا میں گھل مل گئے۔ طلبا ان کے گرد کافی دیر تک جمع رہے مہمان اور میزبان دونوں خوش تھے۔ کہ تقریب بخیرو خوبی اختتام کو پہنچی ہے طلبا اور صدر مملکت کے درمیان نہ تو پروٹوکول حائل ہو سکا۔ نہ ہی سیکورٹی والے بندوق برداروں نے ہٹو بچو کی صدا بلند کی۔ میں چائے پی رہا تھا۔ جب صدر مملکت میرے پاس سے گذرے۔ میں نے بڑھ کر سلام کیا تو میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا۔

صدر۔ امبسڈر علی شیخ کیا احوال ہیں

منکم مسلم سکول میں ووکیشنل تعلیم پانے والی طالبات

میں۔ جی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔
صدر۔ میں نے گذرتے ہوئے راستے میں منکسم سکول پر ایک نظر ڈالی ہے اپنی حکومت کا میری طرف سے شکریہ ادا کریں۔ یہ پاکستان کی خیر سگالی کا ثبوت ہے۔
میں۔ جی ضرور۔ میں انشا اللہ عکرہ واپس جا کر ہی وزارت خارجہ کو آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔
صدر۔ صرف شکریہ کہنا کافی نہیں ہو گا میں اور میری حکومت پاکستان کی جانب سے شعبہ تعلیم میں آپ کے تعاون کے مشکور ہیں۔
میں۔ یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے گھانا اور پاکستان کے درمیان جو تاریخی اور روائتی دوستانہ تعلقات چلے آ رہے ہیں ان کے پیش نظر یہ ایک بہت ہی محدود قسم کا تعاون ہے۔ ہماری حکومت تو چاہتی ہے۔ کہ دونوں دوست ممالک کے درمیان قریبی اور نزدیکی تعلقات زیادہ گہرے ہوتے جائیں۔
صدر۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے پاکستان سے بجلی کے پنکھے اور سلائی کی مشینیں درآمد کر کے سکول کو عطیہ کے طور پر دیں۔
میں۔ جی ہاں۔ یہ کار خیر ہے۔ اور ہماری وزارت مذہبی امور کے سربراہ نے سکول کی تعمیر کے لئے پاکستان سے گھانا پہنچائی ہیں۔ ہماری حکومت اور عوام گھانا کا احترام کرتے ہیں۔
صدر۔ ہمارے محکمہ تعلیم کی رائے میں آپ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اس دور دراز گاؤں میں ایک اچھے سکول کی شروعات ہوئی ہے مجھے قوی امید ہے کہ مستقبل میں یہ سکول یونیورسٹی بن جائے گا۔

میں نے صدر مملکت کا شکریہ ادا کیا۔ اس گفتگو کے دوران وہ میرا ہاتھ تھامے رہے گفتگو کی خبر شام تک عکرہ کے تمام سفارت خانوں میں پہنچ گئی۔ اگرچہ موضوع سخن کا کسی کو علم نہ ہوا۔ لیکن باخبر حلقوں نے کھوج نکال لیا۔ اور دوست سفیروں نے مجھے مبارک دی۔

میرے لئے ذاتی طور پر یہ بات بہت خوشی اور اطمینان کا باعث تھی کہ ہماری کوشش اور کاوش صدر مملکت کے علم میں مثبت انداز میں پہنچی تھی۔

من کسم اسکول کے لئے چار کمرے تو پاکستان کے خرچ پر بن گئے تھے۔ لیکن ان کمروں میں بجلی کی ضرورت ابھی باقی تھی۔ مقامی طور پر اسکول کے لئے جو پنکھے بازار سے لئے گئے تھے وہ ناقص تھے اور مہنگے بھی۔ اسی طرح ووکیشنل اسکول کے لئے مقامی طور پر جو سلائی کی مشینیں لی گئی تھیں۔ وہ ساخت کے اعتبار سے ناقص اور غیر معیاری تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ بجلی کے پنکھے اور سلائی مشینیں پاکستان سے منگوائی جائیں تاکہ گھانا میں ساختہ پاکستان اشیاء کا تعارف بھی ہو جائے اور ضرورت بھی پوری ہو میں نے اس سلسلے میں پاکستان کی ایک فرم نقش کارپوریشن سے رابطہ قائم کیا۔ یہ فرم افریقہ کے ملکوں میں ہونے والی بین الاقوامی نمائشوں میں باقاعدہ طور پر حصہ لیتی ہے۔ اس کے سربراہ ایک ڈاکٹر صاحب ہیں جو تجارتی کاموں میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے ادارے کی تیار کردہ مصنوعات کا معیار بھی بین الاقوامی معیار سے کہیں بہتر ہے اور قیمتیں بھی مناسب ہوتی ہیں۔ میں نے نقش کارپوریشین کو ذاتی طور پر ایک خط لکھا کہ اگر وہ عکرہ میں ہونے والی نمائش میں شریک ہونے کے لئے اپنی مصنوعات بھیج رہے ہوں تو ان کے ساتھ بجلی کے چار پنکھے اور سلائی کی چھ مشینیں بھی بھجوا دیں۔ ساتھ ہی ان سے میں نے یہ بھی کہا کہ ان کی ارسال کردہ تمام اشیاء کی بار برداری کا کرایہ ہم ادا نہیں کریں گے کہ یہ تو کارخیر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بے حد خوش دلی سے اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا۔

نقش کارپوریشن نے فروری اور مارچ ۱۹۸۷ء میں منعقد ہونے والی نمائش میں حصہ لیا اور پاکستانی قیمتوں کے مطابق مطلوبہ اشیاء جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ہمیں مہیا کر دیں۔ جو مقامی اشیاء کے مقابلے میں بہت سستی تھیں اگر ان اشیاء کی قیمتوں میں لاہور عکرہ تک کا کرایہ بھی شامل ہو جاتا تو قیمتیں ناقابل برداشت ہو جاتیں۔ گھانا کے محکمہ تعلیم نے اپنی حکومت کو اسکول کے بارے میں جو نوٹ لکھا تھا

اس میں مذکورہ بالا اشیاء کی قیمت ' ساخت اور کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا میری درخواست پر حکومت گھانا نے ان اشیا کو کسٹم ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔

مذکورہ بالا اسکول میں ابھی ایک لائبریری کی بھی ضرورت ہے اور مزید کمروں کے تعمیر کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس وقت اسکول کے بچوں کو پینے کا پانی میسر نہیں آتا۔ وہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے دریا کا گدلا پانی پینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اسکول سے دو میل کے فاصلے پر ایک دریا بہتا ہے لوگ وہیں سے سکول کے بچوں کے لئے پانی لے کر آتے ہیں۔ یہ ایک عارضی انتظام ہے اور مقامی لوگ اسے کارخیر سمجھ کر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس اسکول میں جتنا بھی کام اب تک ہوا ہے وہ پاکستان کی وزارت مذہبی امور ہی کے تعاون سے پایہ تکمیل تک پہنچا ہے۔ میری سفارت کے زمانے میں تین برس کے دوران اس وزارت کے تین الگ الگ وزیر مقرر ہوئے اور ان تینوں اصحاب نے بروقت اور سرعت کے ساتھ اس اسکول کے لئے گرانٹ منظور کرنے کے احکامات جاری کئے اور اس طرح سے پاکستان اور گھانا کے درمیان خیر سگالی کے جذبات کو تقویت پہنچائی اور باہمی تعلقات کو مضبوط کیا۔ میری رائے میں گھانا میں تعلیم کے شعبے میں پاکستان کی امداد کی ضرورت ہے۔ بالخصوص شمالی حصہ میں جو مسلمان اکثریتی علاقہ ہے اور حکومتی وسائل مقامی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے۔

"ایک سو بیس برس تاریخی مسجد ہم نے بیچ کھائی"

دارالحکومت عکرہ کے عین وسط میں مستطیل شکل کا ایک وسیع و عریض میدان ہے۔ اس میدان کے ارگرد بڑی بڑی دکانیں، تجارتی پلازہ اور بلند و بالا رہائشی عمارتیں ہیں۔ یہ میدان صرف کار پارکنگ کیلئے مخصوص تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں پرچون فروشوں کے لکڑی کے کھوکھے نمودار ہوتے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ یہ مقام انارکلی لاہور کے بانو بازار کی صورت اختیار کر گیا۔ اس طرح یہ پارکنگ ایریا زبردست مارکیٹ بن گیا۔ اس مارکیٹ سے جہاں مقامی تجارت متاثر ہوئی وہاں گھانا کی معیشت پر بھی برا اثر پڑا۔ یہاں بلیک مارکیٹ ہر قسم کی روا تھی۔ کرنسی کا کاروبار بھی یہاں ہوتا تھا۔ مقامی کرنسی کا کاریٹ تھوک و خوردہ مال کی قیمت سمگل شدہ مال کی ترسیل و قیمت یہیں مقرر ہوتی تھیں۔ مارکیٹ کا نام مکولا مارکیٹ تھا۔ اور اس کا انتظام بزرگ خواتین کے ہاتھ میں تھا۔ ان خواتین کو مکولا ممیز کیا جاتا تھا۔ صدر مملکت سے ان کا براہ راست رابطہ تھا وہ نڈر بے باک اور من مانی کرنے والی عورتیں تھیں۔ ایک مرتبہ جب عکرہ لوکل کونسل نے یہ جگہ خالی کرانے کی کوشش کی۔ تو ان مکولا ممیز کا اثر و رسوخ اتنا تھا کہ یہ جگہ خالی نہ ہوسکی ۔ یہ بھی پتہ چلا کہ عظیم تر عکرہ ٹاؤن کے منصوبہ کے مطابق اس جگہ ایک کثیر المنازل کار پارک بنایا جانا منظور ہو چکا تھا۔ مگر رقم مہیا نہ ہو سکنے کے باعث اس منصوبے پر فوری عمل نہ ہو سکا۔

کارپردازان میکولا مارکیٹ اور حکومت کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ انہیں کوئی متبادل جگہ دے دی جائے تو وہ اپنے کھوکھے وہاں سے اٹھا کر لے جائیں گے لیکن

فریقین کے باہم تعاون کرنے کے اعلانات کے باوجود کچھ بھی نہ ہوا۔ بات جوں کی توں وہیں رہی بلکہ ایک مسئلہ درمیان میں اور پیدا ہو گیا۔

اس مکولا مارکیٹ میں ایک مسجد تھی تقریباً ایک سو بیس برس پرانی عظیم تر عکرہ ٹاؤن کے منصوبہ ساز کے مطابق اسے بھی گرایا جانا ضروری تھا یہ مختصراور بے آباد سی مسجد تھی حتی کہ وضو تک کرنے کا اس میں خاطر خواہ انتظام بھی نہ تھا۔ وقتاً فوقتاً مسلم ممالک کے سفارت خانوں سے چندہ اکٹھا کر کے نمازیوں کے لئے چٹائیوں کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ چھت بھی نہایت بوسیدہ تھی اس لئے کم ہی نمازی اس طرف رخ کرتے تھے۔ حکومت نے اس مسجد کے گرائے جانے کے لئے معزز مسلمانوں سے گفتگو کی۔ ان کی ایک انجمن کے علماء نے مطالبہ کیا کہ ان کی مرضی کے مطابق مسجد کے لئے متبادل جگہ مہیا کر دی جائے۔ تو مسجد گرا دی جائے انہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ حکومت نے یہ وعدہ کر لیا مگر نمعلوم بعد میں علماء پھر کیوں مطمئن نہ ہوئے۔ انہوں نے اب مسجد کے عوض نقد معاوضے کا مطالبہ کیا جو حکومت نے باقاعدہ کاروائی کر کے ادا کر دیا۔ اس پر علماء متبادل جگہ حاصل کرنے کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے۔ یہ تمام کاروائی ۱۹۷۷ء تک مکمل ہو گئی۔ مگر موقع پر مسجد موجود رہی اور اسے مسمار نہ کیا گیا۔ کیونکہ مجوزہ منصوبہ شروع کرنے کے لئے حکومت کے پاس رقم نہ تھی۔ جب ۱۹۸۶ء میں موجودہ حکومت کے پاس کہیں سے فنڈز کا بندوبست ہو گیا تو عظیم عکرہ کونسل نے مکولا مارکیٹ کو خالی کرانے کے لئے کاروائی کا آغاز کیا اور وہاں پر موجود ناجائز تجاوزات کو ہٹانے کے لئے اپنا عملہ اور بلڈوزر بھیج دیئے۔ کھوکھوں۔ دکانوں اور دیگر تجاوزات کو گرانے کے بعد بلڈوزر نے جب مسجد کا رخ کیا تو مسلمانوں کی غیرت ایمانی جوش میں آ گئی اور چند ایک مسلمان بلڈوزر کے سامنے آ کر لیٹ گئے۔ اس دوران گھانا کی ایک مسلم انجمن کے ارکان بھی موقع پر آ گئے۔ مسجد شہید کئے جانے کے خلاف احتجاج کی صدا جنگل کی آگ کی طرح آناً فاناً دور و نزدیک پھیل گئی۔ مسلمان اس وقت بہت جوش میں تھے اور خدشہ تھا کہ کوئی سنگین واقعہ پیش آ جائے لیکن عظیم عکرہ ٹاؤن

کی انتظامیہ نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے اس روز کی کاروائی روک دی۔ خبر جب مسلم ممالک کے سفیروں تک پہنچی تو وہ بہت مضطرب ہوئے چنانچہ یہ معاملہ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سب کے سب سفارت کار اس واقعہ سے بہت ملول اور افسردہ تھے سوائے نائیجیریا اور مالی کے سفیروں کے کہ وہ عیسائی تھے اور مصر کے چارج ڈی افیرز کے کہ وہ اپنے ملک کے سفیر کی غیر حاضری میں اس کا قائم مقام تھا اور وہ بھی عیسائی تھا باقی سب سفیر صاحبان اس معاملے میں بہت سنجیدہ تھے۔ میری رہائش گاہ پر فوری میٹنگ ہوئی۔ اور فیصلہ ہوا کہ اگلے روز چیئرمین فلائٹ لیفٹیننٹ جے جے رالنگ سے اس مسئلے پر بات کی جائے لیبیا کے سفیر نے اسی وقت چیئرمین سے رابطہ قائم کیا اور اگلے روز شام کے پانچ بجے ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا۔ رات کو گھانا ٹی وی نے اور اگلے روز کے تمام اخبارات نے اس معاملے کو خوب اچھالا مگر مسلمانوں کے موقف سے ابلاغ کے کسی بھی ذریعے کو ہمدردی نہیں تھی۔ انہوں نے مسلمانوں ہی کے خلاف لکھا اور انہیں تنگ دل ' تنگ نظر اور متعصب قرار دیا۔ صورتحال میں ایک اور تبدیلی بھی آئی جب چیئرمین نے شام کو وفد کی بجائے صرف لیبیا کے سفیر سے ملاقات کی۔ چیئرمین نے نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اسلام میں مسجد کا مقام اور اسے کن حالات میں شہید کر جا سکتا ہے۔ مسجد کے لئے معاوضہ یا جگہ مہیا کرنے ایسے اہم موضوعات پر تبادلہ خیالات ہوا۔ سفیر نے ہمیں بتایا کہ اگلے روز گیارہ بجے دن کو علماء کا ایک وفد بھی چیئرمین سے بات چیت کرنے کے لئے آ رہا ہے۔ اس معاملے کا کوئی آخری اور حتمی فیصلہ اس ملاقات کے بعد ہی متوقع ہے۔

علماء کا وفد گیارہ بجے صبح چیئرمین سے ملا اور بارہ بجے مسجد شہید کر دی گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ علماء کے وفد میں اکثریت ان علماء کی تھی جنہوں نے دس برس پہلے متبادل جگہ حاصل کرنے کی بجائے اصرار کر کے نقد معاوضہ بھی وصول کیا تھا۔ اس سے متعلق ایک تحریر پر ان کے دستخط موجود تھے۔ جو بیک وقت معاہدہ بھی تھا۔ اور معاوضے کی وصولی کی رسید بھی۔ دوسرے یہ کہ چیئرمین نے اب انہیں مسجد کی تعمیر

کے لئے جگہ کی دوبارہ پیشکش کی تو انہوں نے اسے بھی قبول کر لیا۔ اور انہیں یہ اختیار بھی مل گیا کہ وہ عکرہ یا اس کے گرد و نواح میں جہاں کہیں بھی مناسب سمجھیں مسجد کی تعمیر کے لئے کوئی موزوں رقبہ چن لیں یہ جگہ بھی بغیر کسی قیمت کے ان کی انجمن کو مفت مہیا کر دی جائے گی۔ یہ نیا سمجھوتہ چیئرمین کے دفتر میں طے ہوا اور اسی وقت عظیم عکرہ ٹاؤن کے کار پردازوں کو حکم دے دیا گیا کہ وہ مذکورہ مسجد کو مسمار کر دیں۔ اس ہدایت کی تعمیل فوری طور پر ہوئی۔ جو لوگ اس وقت یہ ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بلڈوزر کو مسجد کی طرف آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر تالیاں بجائیں۔ تماشائیوں کی اکثریت نے ہاتھ کی دو انگلیوں سے وی (فتح) کا نشان بناتے ہوئے اپنی کامیابی پر خوشی کا اظہار بھی کیا۔

یہ مظاہرہ مسلمانوں کے جذبات کے خلاف بہت عبرت انگیز تھا۔ گھانا ٹی وی نے اپنی نشریات میں اس کاروائی کے مناظر بھی پیش کئے اور اس سے متعلق خبریں بھی نشر

کھانا میں مسلمانوں کی کئی جماعتیں ہیں بلکہ یوں سمجھیں کہ وہاں ہر مسجد کے
ساتھ لازماً ایک انجمن وجود میں آ جاتی ہے۔ اجتماعی طور پر وہاں دو متحارب انجمنیں ہیں
جن میں سے ایک کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اس انجمن کا اثر و نفوذ بھی ہے
اس انجمن کے رہنما جو امام کہلاتے ہیں اپنے قبیلے کے سردار بھی ہیں۔ ان کے لئے

عوام کے دلوں میں بیحد احترام ہے۔ حتیٰ کہ عیدین پر جب تک امام صاحب نہ آئیں اقامت نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ ان کی کار ٹریفک میں پھنس گئی اور وہ دو گھنٹے کی تاخیر سے مسجد میں پہنچے تو اس دوران برابر انتظار ہوتا رہا۔ جب وہ آئے تب کہیں جا کر نماز ادا ہوئی۔

گھانا کی یہ علماء کونسل مساجد کی دیکھ بھال کرتی ہے اور ان کے جملہ امور کی ذمہ دار بھی ہے۔ یہ کونسل مسجدوں کے ساتھ کتب خانے بھی قائم کرتی ہے رمضان اور عیدین کے چاند کا اعلان بھی اسی کونسل کے ذمے ہے۔ تمام مسلمان سفیروں سے اس کونسل کا رابطہ برابر قائم رہتا ہے۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود یہ ایک المیہ ہے کہ یہ کونسل بھی مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یک جہتی پیدا نہیں کر سکی۔ رمضان المبارک کے مہینے کے پہلے روزے کا اعلان متنازعہ مسئلہ رہا ہے۔ اسی طرح سے عیدین کی تاریخوں کا تعین بھی متنازعہ ہی رہا ہے۔ اور اسے کسی طور بھی نمٹایا نہ جا سکا یہ مسئلہ مسلمانوں کیلئے باعث رنجیدگی اور غیر مسلموں کیلئے وجہ طنز و مزاح بنا رہتا ہے۔

گھانا میں عام طور پر عیدین کے موقع پر سبھی عالموں اور مسلمان قبیلوں کے سرداروں کو سٹیج پر جگہ دی جاتی ہے اور صلوۃ کے لئے انہیں صف اول میں جگہ بھی مل جاتی ہے اسلئے عیدین پر ان کا آپس میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوتا۔ مسجد کے انتظام و انصرام کے لئے یہاں کی طرح وہاں بھی چندہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علماء کونسل کی طرف سے سال بھر چندے کی اپیل پر مشتمل خطوط برابر آتے رہتے ہیں اور انفرادی طور پر مسلمان مسجد کے لئے امداد کے طالب رہتے ہیں۔

مکولا کی مسجد کے لئے بھی چندہ کی مہم کافی عرصے تک چلتی رہی۔ پاکستان کے مشن نے کافی عرصہ پہلے اس مسجد کی مرمت اور تزئین و آرائش کے لئے حکومت پاکستان سے تحریری طور سے کچھ رقم مختص کرنے کی سفارش کی تھی۔ جو قبول ہوئی اور حکومت پاکستان نے اس مسجد کے لئے تقریباً ایک ہزار ڈالر کی رقم مخصوص کر دی۔ لیکن یہ رقم مسجد کے شہید ہونے کے بعد مشن کو ملی یہ رقم کسی اور مسجد کو نہیں دی

جا سکتی تھی اور نہ ہی کسی دوسرے رفاہی کام میں خرچ کی جا سکتی تھی لہٰذا میں نے رقم حکومت ہی کو واپس کر دی جب مسجد ہی نہ رہی تو اس رقم کو صرف کہاں کرنا تھا۔ لیکن اس مسجد کے شہید ہونے کے باوجود آئے دن مختلف وفود مشن میں آتے رہے اور مطالبہ کرتے رہے کہ مذکورہ رقم ان کے حوالے کر دی جائے۔ باقاعدہ طور سے تحریری درخواستوں میں سے کم ازکم دس درخواستیں تو اس ضمن میں اب بھی ریکارڈ پر موجود ہیں۔ جن میں مختلف لوگوں نے مذکورہ رقم کے وارث ہونے کا دعوی کیا۔

ایک تو مسجد شہید ہو چکی تھی۔ دوسرے مختلف عہدیداروں کے درمیان اس سلسلے میں تکرار تھی' اصرار تھا۔ میرے نزدیک یہی مناسب تھا کہ یہ رقم حکومت پاکستان ہی کو واپس کر دی جائے۔ مکولا مسجد کی بازگشت پاکستان نیشنل اسمبلی میں بھی سنی گئی۔ اسمبلی میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب علی خان نے اسمبلی کو بتایا کہ دفتر خارجہ اور پاکستان سفیر کا آپس میں مکمل رابطہ قائم ہے۔ مزید یہ کہ پاکستانی سفیر حکومت گھانا اور مسلمان سفیروں کے ساتھ مسلسل رابطہ قائم رکھے ہوئے ہے۔ اور یہ بات درست بھی تھی۔ میں اس تمام واقعے سے دفتر خارجہ پاکستان کو ایک ایک لمحے کی خبر دیتا رہا تھا۔ یہ ایک سو بیس برس پرانی تاریخی مسجد ہم مسلمانوں ہی نے بیچ کھائی تھی جو شاید ہماری روایات سے ہم آہنگ عمل ہے۔ یوں ایک تاریخی مسجد ہمارے ہی ہاتھوں مٹ گئی اور ہم متبادل جگہ تاحال حاصل نہ کر سکے ہیں۔

میں ۲۰ جولائی ۱۹۸۹ء کو پاکستان واپس آیا تھا۔ اس وقت تک یہی صورت حال قائم تھی۔

گھانا میں میرے تین سال

۲۰ جولائی ۱۹۸۹ء میں مغربی افریقہ کے ممالک گھانا۔ ٹوگو۔ برکینا فاسو۔ لائبیریا اور سیرالیون میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے جب میں نے اپنا چارج چھوڑا تو میرا دل مطمئن تھا کہ میں نے ۲۰ جولائی ۱۹۸۶ء سے اب تک سفارت کے منصب پر فائز ہو کر اپنے ملک و قوم کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ سفارتی منصب کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔

وزارت خارجہ پاکستان کے اعلیٰ افسران کا میری خدمات سے متعلق کیا تاثر ہے۔ یعنی ان کے خیال کے مطابق میں اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برآں ہوا ہوں کہ نہیں، ذاتی حیثیت سے یہ معلوم کرنے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ البتہ گاہے گاہے وزارت خارجہ پاکستان اسلام آباد سے میرے نام ایسے خطوط آتے رہے جن میں میری سفارتی خدمات کو سراہا گیا۔ ۲۰ جولائی ۱۹۸۶ء میں جب میں نے اپنا عہدہ سنبھالا تو اس کے تین ماہ بعد ہی میری عمدہ کارکردگی کا تحریری طور پر اعتراف کیا گیا اور میرا حوصلہ بڑھایا گیا۔ میری خدمات کے ضمن میں یہ اس سلسلے کا میرے نام پہلا خط تھا۔

۱۹۷۳ء میں جب اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا تو اس جارحیت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تمام افریقی ممالک نے اسرائیل سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے تھے مگر اسرائیل برابر کوشش کرتا رہا کہ سفارتی روابط اور تعلقات از سر نو بحال ہو

جائیں لیکن افریقی ممالک نے اس پر مطلق توجہ نہ دی۔ ان کے نزدیک یہ بات جذباتی نہیں اصولی تھی۔ اس لئے انہوں نے کسی حکمت یا مصلحت کی بالکل کوئی پرواہ نہیں کی چنانچہ تمام حربوں اور کوششوں کے باوجود اسرائیل اپنا مقصد حاصل کرنے میں یکسر ناکام رہا۔

بلا استثناء تمام افریقی ممالک دنیا کے نہایت پسماندہ اور غریب ملکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ سامراجی قوتوں کے انخلاء کے بعد بھی ان ملکوں سے سامراجی اثرات ابھی تک زائل نہیں ہوئے۔ مزید برآں سامراج ہنوز افریقی ممالک کو اپنے قبضہ و تصرف میں رکھنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔ اسرائیل بھی امریکی سامراج اور اس کے دوست ممالک کی جارحانہ پالیسیوں کو آگے بڑھانے میں اس کا ممد و معاون ہے۔

براعظم افریقہ براہ راست تو امریکی سامراج کی زد میں نہیں آ سکتا کیونکہ نو آزاد ممالک میں نیشنلزم کی تحریکیں زوروں پر ہیں۔ انہیں مارکسی تحریکیں کہنا درست نہیں بلکہ انہیں مارکسی تحریکیں قرار دیا جانا فی الحقیقت امریکی پراپیگنڈے کا ایک خاصہ ہے بلاشبہ افریقہ سامراج سے دلی نفرت کرتا ہے چاہے وہ روسی برانڈ کا ہو یا امریکی برانڈ کا بنابریں امریکہ کی دال گلتے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چنانچہ بالواسطہ اسرائیل کو آگے بڑھایا گیا تھا۔ اسرائیل نے ۱۹۷۳ء میں مصر پر حملہ کرکے ننگی جارحیت کا ارتکاب کیا۔ اس کے بعد اسرائیل بھی فارغ ہوگیا۔ اب جو اس نے افریقہ سے اپنے سفارتی تعلقات بحال اور استوار کرنے کا ڈول ڈالا تو وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا میں نے گردوپیش کے تمام حالات کا جائزہ لیتے ہوئے دفتر خارجہ کو حقائق سے آگاہ کیا جس پر سیکرٹری امور خارجہ نے ایک خط کے ذریعے مجھے اس حساس مسئلے پر ایک درست تجزیہ پیش کرنے پر میری تعریف کی۔ یہ ایک سرسری رپورٹ نہ تھی۔ بلکہ میں نے تفصیل سے مغربی افریقہ کے ممالک میں ان تمام کوششوں اور کاروائیوں کی نشاندہی کی جو اسرائیل ان ممالک کے ساتھ سفارتی رابطے استوار کرنے کے لئے بروئے کار لا رہا تھا۔ اس

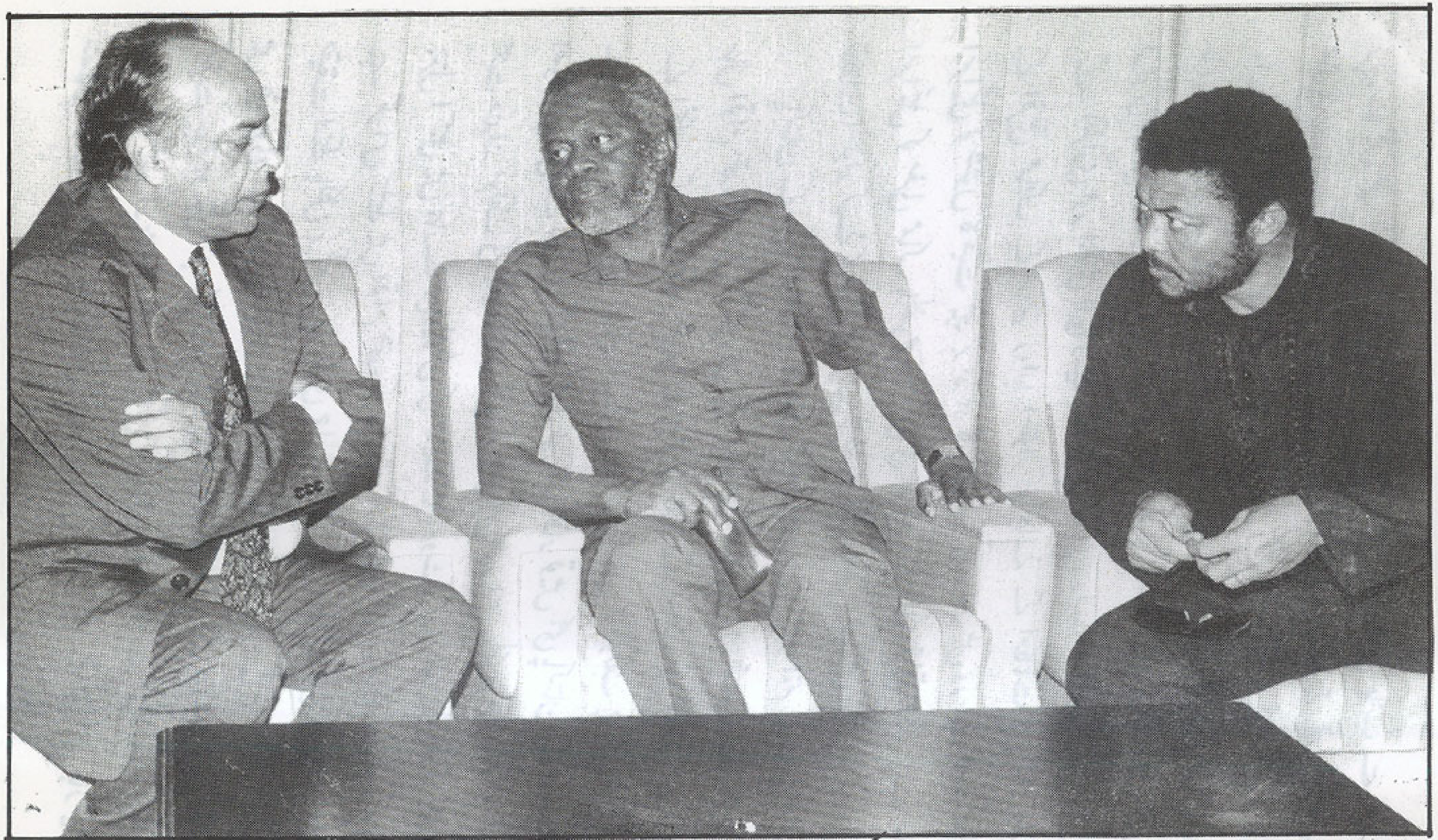

22 اگست 1988 چیرمین صدر مملکت جیری جے رالنگ، کینین کوجوچکاٹا' پاکستانی سفیر مرحوم جنرل ضیا الحق کی تعزیت کے لئے پاکستانی مشن میں

رپورٹ میں ان حربوں کا بھی ذکر تھا۔ جو اسرائیلی حکومت کی جانب سے سربراہان مملکت اور ان کے مشیروں کو رام کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ پالیسی بنانے والے موثر افراد کے لئے بیش بہا نقد رقوم کے تحفے۔ بچوں کے لئے تعلیمی وظائف طلباء کے لئے بیرون ملک سیر و سیاحت کے مواقع زراعت اور انڈسٹری کی ترقی میں امداد کی پیشکش ادھار پر اسرائیل سے درآمدات اور بلا سود قرضے ہر ملک میں پیش کئے گئے۔ انفرادی اور اجتماعی لانچ دیئے گئے میں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اسرائیل کے افریقی ممالک کے ساتھ روابط استوار ہو جانے کے امکانات ہیں اور جلد ہی اسرائیلی کوششوں کا مثبت نتیجہ برآمد ہو گا۔ میرا یہ تجزیہ بعد میں درست ثابت ہوا اور اسرائیل کو مغربی مماک بالخصوص فرانس کی اعانت سے کافی افریقی ممالک سے سفارتی تعلقات استوار کرنے کا موقع مل گیا۔ پہلا خط اس تجزیے کی تعریف میں تھا۔

پاکستان کے لئے افغانستان کا مسئلہ بھی نہایت حساس اور اہم ہے۔ یہ مسئلہ ہر سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش ہوتا چلا آ رہا ہے۔ افغانستان سے روسی افواج کے انخلاء کے لئے اقوام متحدہ نے ہمیشہ پاکستان کے موقف کی حمایت اور تائید کی ہے۔ ہم بھی متواتر یہی اعلان کرتے رہے کہ پاکستان کا موقف چونکہ حقائق اور اصولوں پر مبنی ہے لہٰذا دنیا کی تمام آزاد اور خود مختار قومیں بھی پاکستان کے درست اور صحت مندانہ موقف کی حمایت اور تائید کر رہی ہیں اور اسی لئے ہر سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہمارے ریزولیوشن کی حمایت میں ووٹ دینے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ مگر اس سلسلے میں اقوام متحدہ کی رائے کے اعداد و شمار درست ہونے کے باوجود حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے ہماری حمایت کا سبب یہ ہے کہ آج کی دنیا دو دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان ہر سطح پر معرکہ آرائی کی کیفیت پیدا ہو چکی ہے یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور اس کے حواریوں نے ہمارے موقف کی تائید اپنے مفاد میں شروع کی تو جاری رکھی۔ ہمارے موقف کی سچائی اور منصفانہ ہونے کی انکے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی صرف ہم نے ہی اس جارحیت پر

سنجیدگی سے توجہ دی تھی۔ وہ بھی جنرل ضیا الحق نے عوام کے جذبات کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی خاطر۔

پاکستان اور افغانستان کی سرحدیں چونکہ ملحق ہیں۔ اس لئے روسی فوجوں کے افغانستان میں داخل ہونے سے پاکستان کے لوگوں میں ہلچل پیدا ہونا اور اسے پاکستان کے لئے خطرے کی بات سمجھنا ایک فطری بات ہے جنرل محمد ضیاء الحق نے جو اس وقت پاکستان کے حکمران تھے اس پر فوراً عوام کے ردعمل کو اپنا لیا۔

ابتدا میں امریکہ جو روس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا تھا نہ صرف یہ کہ خاموش رہا۔ بلکہ اس کے اتحادیوں نے بھی روسی فوجوں کی جارحیت پر احتجاج کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے کہ امریکہ نے اپنے عالمی اور غیر ملکی مفادات کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ بحر ہند اور گلف کے خطے میں روس کی بالادستی امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لئے مستقل خطرہ ہو گی۔ بایں ہمہ امریکہ بدستور تذبذب میں مبتلا رہا۔ افغان مجاہدین نے روس کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ محض اپنی صوابدید کی بنیاد پر کیا تھا۔ اس میں ابتداً ہمارا بھی کوئی دخل نہ تھا۔ مجاہدین کی امداد کا فیصلہ جنرل محمد ضیاء الحق نے خود ہی کیا۔ اور ملکی و ملی سالمیت کو ایسی جنگ میں داؤ پر لگا دیا۔ جس کی افادیت محل نظر تھی۔ مجاہدین کی امداد کا فیصلہ آج بھی نقد و بحث کا موضوع رہتا ہے۔ بعد میں جب امریکہ نے مجاہدین کی امداد کا فیصلہ کیا وہ اس کے اپنے مفادات پر مبنی تھا۔ مجاہدین یا ہمارے ساتھ دوستانہ روابط اور خیرسگالی کے جذبات اس کی بنیاد نہ تھے۔ امریکہ تو روس کو افغانستان میں الجھانا چاہتا تھا۔ مجاہدین کی فتح اس کا ہدف نہ تھا۔ ویت نام میں اپنی شرمناک شکست کے بعد امریکہ کو اب موقع ملا تھا کہ وہ روس کو سیاسی اور فوجی طور پر زچ کر دے۔ جب دیگر ممالک کی بھرپور تائید کے ساتھ ہم نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی طرف رجوع کیا تو ہماری قرارداد اور موقف کی حمایت و تائید صرف اور صرف ان ملکوں نے کی جو امریکہ کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ یا روسی جارحیت اور اس کی مزید پیش قدمی سے خوفزدہ تھے۔

مشرقی یورپی ملکوں اور روس کے حواریوں منجملہ بھارت نے آخری دن تک اس قرارداد کی مخالفت کی۔ قصہ کوتاہ یہ کہ دونوں جانب سے ملکی سالمیت عدم مداخلت اور غیر جانبداری کے ان اصولوں پر کاربند رہنے کا کوئی بھی فریق روادار نہ ہوا جو اقوام متحدہ کے چارٹر میں تحریر ہیں۔ نہ ہی کسی نے اس چارٹر کے تقدس ہی کو نگاہوں کے سامنے رکھا۔ یہ سراسر دھڑے بازی تھی جس میں افغانیوں کا بے بہا خون بہا۔ ۱۵ لاکھ مارے گئے۔ ۳۵ لاکھ پاکستان میں پناہ گزین ہوئے۔ ۲۰ لاکھ ایران میں جا بسے تقریباً ۴۰ ہزار روسی فوجی مارے گئے۔ اب افغانستان کا بطور ایک ملک کے جانبر ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ہے۔ گیارہ برس کی اس جنگ کے بارے میں جنرل ضیاء الحق نے تاریخی تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ "ہمارا تو کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا ہوا ہے۔ حاصل حصول کچھ نہیں۔" اس جنگ کے بارے میں یہی حرفِ آخر ہے۔

ہمارے دفتر خارجہ پاکستان کی جانب سے ہر سال جنرل اسمبلی کے اجلاس سے قبل افغانستان کے مسئلے پر گزشتہ برس کی تائید کو قائم رکھنے اور آئندہ اجلاس میں مزید تائید حاصل کرنے کے لئے رکن ممالک میں خصوصی سفیر روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں یہ احتیاط کی جاتی ہے۔ کہ جس ملک میں سفیر بھیجا جائے اس کے بارے میں اسے کچھ علم نہ ہو۔ اور اگر کچھ علم ہو بھی تو وہ کارآمد ثابت نہ ہو خصوصی سفیر کی راہ میں مزید مشکلات حائل کرنے کے لئے دفتر خارجہ والے اس کا پروگرام بھی خود ہی طے کر دیتے ہیں جس میں یہ بات مخفی ہوتی ہے کہ اس خطے میں مقیم سفیر کی سہولتوں کا خیال نہ رکھا جائے مزید برآں کہ پروگرام کو مرتب کرتے وقت میزبان ملکوں کے اعلیٰ عہدے داروں کی سہولت کا بھی خیال نہ رکھا جائے۔

میرے تجربے کے مطابق اگر ہمارے سفیر نے ہوم ٹاسک نہیں کیا ہوا تو سال بھر کے بعد خصوصی سفیر کو بھیجنا بے سود ہے۔ وہ بے چارہ ایک آدھ گھنٹے کی گفتگو میں میزبان ملک کی پالیسی کو کیا تبدیل کرا سکے گا اور اگر ہمارے سفیر نے اپنا کام صحیح طور پر انجام دے رکھا ہے تو پھر خصوصی سفیر کو بھیجنے کا کیا مقصد ہے میری رائے میں تو اس کا

اصل مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے کسی چہیتے کو خصوصی سفیر کے طور پر ملک سے باہر زیادہ تر تبدیلی آب و ہوا کے لئے بھیجا جائے۔ افادیت ترجیح اول نہیں ہوتی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ افغانستان کے بارے میں گھانا نے متواتر کئی برس تک ہمارے موقف کی تائید کی اور باوجود اس کے کہ مشرقی بلاک کے ملکوں اور اس کے حواریوں منجملہ بھارت نے مختلف حربے استعمال کئے مگر گھانا کو اپنے موقف سے منحرف ہونے پر وہ کسی طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔ گھانا اپنے موقف پر سختی سے قائم رہا اور اس بات کا زبردست موید ہے کہ جارحیت جیسی بھی ہو جہاں بھی ہو قابل مذمت ہے۔

وزارت خارجہ پاکستان نے اچانک ۱۹۸۷ء میں ہونے والے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے بارے میں گھانا کی پوزیشن پر اپنی گھبراہٹ کا اظہار کرنا شروع کر دیا اور اس بات کا تواتر سے اظہار کیا کہ آئندہ اجلاس میں پاکستان کے ریزولیوشن کے حق میں گھانا ووٹ نہیں دے گا۔ لیکن میں نے ۱۹۸۶ء ہی سے اس سے متعلق پاکستان کے حق میں گھانا میں لابی کو مضبوط بنا رکھا تھا۔ اس لئے میں مطلق فکر مند نہ تھا۔ گھانا حکومت کے تمام چھوٹے بڑے عہدیداروں سے میرے ذاتی مراسم اور تعلقات تھے۔ سربراہ مملکت اور مشیران حکومت کے ساتھ بھی میری دوستی تھی۔ اور میں اس پوزیشن میں تھا کہ ان سے براہ راست نازک اور حساس معاملات کے بارے میں گفتگو کر سکوں۔

دفتر خارجہ اسلام آباد اور اقوام متحدہ میں ہمارے مشن کے افسران گھانا کے بارے میں مختلف الخیال تھے اور وہ اپنے اس اندازے کی صحت پر مصر تھے کہ گھانا اس بار پاکستان کا ساتھ نہ دے سکے گا مگر گھانا کے بارے میں ان تمام شکوک و شبہات کا خاتمہ اس وقت ہو گیا جب اقوام متحدہ میں پاکستان کے ریزولیوشن کے حق میں گھانا نے اپنا ووٹ دے دیا۔

مغربی افریقہ کے ملکوں میں سے ایک ملک برکینا فاسو بھی ہے۔ پہلے اس کا نام

اپر وولٹا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں فوجی انقلاب کے ذریعے کامریڈ سنکارا نے اس پر قبضہ کیا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ افغانستان کے مسئلے پر برکینا فاسو وقتاً فوقتاً اپنی رائے اور پوزیشن بدلتا رہتا تھا۔ اگر اس سال ریزولیوشن کے حق میں ووٹ دیا۔ تو اگلے سال اس کے خلاف ووٹ دے دیا اس سے اگلے سال اس مسئلے پر غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کر لیا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تھا اس کی وجوہات کا تو علم نہ سکا البتہ یہ ضرور محسوس ہوا کہ ہم دوستی اور باہمی تعلقات کے معاملے میں برکینا فاسو کے معیار پر پورے نہیں اتر سکے۔ نہ ہم ان توقعات ہی کو پورا کر سکے جو اس غریب اسلامی ملک نے ہم سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم برکینا فاسو سے محض وعدے ہی کرتے رہے مگر ووٹ حاصل کرنے کے بعد ہم نے کبھی ان کے ایفا کرنے کی نہ سوچی میرا مشاہدہ ہے کہ ہم ووٹ حاصل کرنے کے لئے تو لابی کرنے میں مستعد ہو جاتے ہیں کاغذی گھوڑے بھی دوڑائے جاتے ہیں۔ خصوصی سفیر بھی اسراف کرتے ہوئے بھجوائے جاتے ہیں۔ الٹے سیدھے وعدے بھی کئے جاتے ہیں۔ الغرض اقوام متحدہ میں رائے شماری سے پہلے ہم بھاگ دوڑ میں لگے رہتے ہیں پھر اجلاس کے دوران تمام کا تمام دفتر خارجہ نیو یارک میں منتقل ہو جاتا ہے لیکن ووٹنگ کے فوراً بعد ہمارا دفتر خارجہ نہ تو ان ممالک سے رابطہ قائم کرتا ہے جنہوں نے پاکستان کے موقف کی تائید کی نہ اپنے سفیر سے رابطہ قائم کر کے اسے کسی قسم کی کوئی اطلاع دیتا ہے جہاں تک مجھے علم ہے افسران امور خارجہ اسلام آباد آتے ہی اپنے ٹی اے بل وغیرہ بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور بین الاقوامی معاملات کے بارے میں مزید کاروائی اگلے سال تک ملتوی کر دی جاتی ہے۔ وہ اس بات کی مطلق فکر نہیں کرتے کہ اقوام متحدہ کے ان ممالک سے ہمارے روابط اور تعلقات کیسے استوار اور قائم رکھے جائیں جو ہمارے موقف کی تائید اور حمایت کرتے ہیں۔ یہی سلوک ہم نے برکینا فاسو کے ساتھ کیا بلکہ یہ سلوک تو سبھی ملکوں سے ہم روا رکھتے ہیں اور بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہمارے موقف کی حمایت صرف اور صرف اصولوں کی بنیاد پر کی جا رہی ہے۔ حالانکہ اصول پرستی کے

سوا اس میں خیر سگالی کے جذبات بھی کار فرما ہوتے ہیں۔ جنہیں بد قسمتی سے ہم نظرانداز کر دیتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے موقف کی تائید اس خارجہ پالیسی کی مرہون منت ہے جسے ہم اپنے ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے مرتب کرتے ہیں حالانکہ ہماری خارجہ پالیسی کی افادیت کے علاوہ اور بہت سے عوامل ہوتے ہیں جن کے زیر اثر ہمارے موقف کی تائید کرنے والے ممالک کسی بین الاقوامی معاملے کے بارے اپنے رویے اور طرز عمل کا فیصلہ کرتے ہیں۔

اگرچہ برکینا فاسو پر چھاپ تو مارکسسٹ ملک ہونے کی لگی تھی۔ اس کے سربراہ مملکت اپنے آپ کو کامریڈ کہلواتے تھے اور اسی طرح وزرائے کرام بھی کامریڈ کہلاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہاں سوویٹ یونین یا چین کا کوئی عکس اور نقش دکھائی نہیں دیتا۔ کامریڈ ٹامس سنکارا کے ساتھ میری بہت ملاقات رہی۔ مجھے اس کے سوزدروں کا کچھ اندازہ تھا جو اپنے ملک اور قوم کے لئے سلگتا تھا۔ اسے بخوبی احساس تھا کہ اس کے ملک میں بے پناہ دولت موجود ہے۔ تانبہ۔ مینگانیز' سونا اور ملک کے کچھ حصے میں قیمتی پتھر بھی موجود ہیں۔ کمی ہے تو صرف وسائل کی' معدنی دولت کو بطن زمین سے نکال کر قومی دولت میں اضافہ کرنے کا اس کے پاس نہ کوئی وسیلہ ہے نہ ذریعہ۔

ایک ملاقات میں کامریڈ سنکارا نے یہ بات رازداری سے کہی کہ وہ اپنی قومی معدنی دولت کے بارے میں نہ تو روس اور امریکہ یا اس کے حواریوں پر بھروسہ کر سکتا ہے نہ ہی بھارت پر اعتماد کر سکتا ہے کیونکہ یہ سب کے سب ممالک سامراجی قوتیں ہیں اور جو آگیا یہاں سے جائے گا نہیں۔ فرانس اور کوٹ ڈی ایوار کا اثر اور امداد بھی کامریڈ کے لئے قابل قبول نہ تھی۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور بتایا کہ میں اس کا پیغام تو صدر پاکستان تک پہنچا دوں گا لیکن وہ خود اگر صدر پاکستان سے ملاقات میں اس مسئلے پر گفتگو کرے تو بہتر ہو گا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور اسلامی ممالک کی کانفرنس کے موقع پر ملاقات کے دوران چند ایک معاملات کے بارے میں دونوں سربراہان مملکت کے درمیان اتفاق رائے ہو گیا۔ مگر افسوس یہ اتفاق رائے

بروئے کار نہ آ سکا کیونکہ دفتر خارجہ اور بعض متعلقہ محکموں نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کوئی کوشش نہ کی۔ میری یاد دہانیوں کے باوجود بھی ہم برکینا فاسو کی کوئی مدد نہ کر سکے۔

ہماری بے اعتنائی اور لاپرواہی کا یہ عالم تھا کہ ایک سال برکینا فاسو کے جب دو سو سے زیادہ گاؤں سیلاب ار بارشوں کی نذر ہو گئے اور وہاں ٹائیفائڈ اور ہیضہ جیسی مہلک بیماریاں پھیل گئیں تو میرے پر زور اصرار کے باوجود اور یاد دہانیوں کے علی الرغم پاکستان کی طرف سے نہ ہمدردی کے دو بول کہے گئے اور نہ ہنگامی صورت حال کے پیش نظر کسی امداد و تعاون کا یقین دلایا گیا۔ ہماری سرد مہری کے باعث نتیجتا برکینا فاسو کا ہمارے ریزولیوشن کے متعلق سرد مہری کا زویہ درست تھا اس دوران ہم نے برکینا فاسو سے کوئی رابطہ نہ رکھا۔ اس برس برکینا فاسو کے لئے پروگرام یوں طے کیا گیا تھا کہ پاکستان سے آمدہ خصوصی سفیر جو لندن میں ہمارے سفیر تھے دوسرے ممالک کا دورہ کر کے برکینا فاسو پہنچ جائیں اور میں بھی وہاں پہنچ جاؤں مقررہ تاریخ پر میں تو وہاں پہنچ گیا مگر وہ نہ پہنچ سکے۔ میں ان کا برابر انتظار کرتا رہا۔ حتی کہ اس بات کا انتظام کر لیا گیا کہ اگر خصوصی سفیر ہفتے یا اتوار تک آ جائیں تو کامریڈ سنکارا سے ان کی ملاقات ہو سکے عام حالات میں ایسا کرنا اگرچہ پروٹوکول کے خلاف ہے تاہم کامریڈ سنکارا نے پاکستان کا احترام کرتے ہوئے یہ رعایت ہمارے لئے روا رکھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ خصوصی سفیر دفتر خارجہ کے پروگرام کا ساتھ نہ دے سکے۔ برکینا فاسو سے دور دراز کسی اور ملک میں پھنس کر رہ گئے میں نے ان کی راہ دیکھنے کے بعد آخر کار وزارت خارجہ میں معذرت کر کے واپس آ گیا۔

اس واقعے کے کوئی آٹھ دس روز بعد کامریڈ سنکارا کے خلاف فوجی بغاوت ہوئی جس میں وہ اپنے دوستوں سمیت مارا گیا۔ یہ خونی انقلاب ۱۶ اکتوبر کی رات کو برپا ہوا اس کے ایک بے حد قریبی دوست کامریڈ کیپٹن کمپاری نے اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور خود سربراہ مملکت کا عہدہ سنبھال لیا۔ کامریڈ سنکارا اور اس کے ساتھیوں

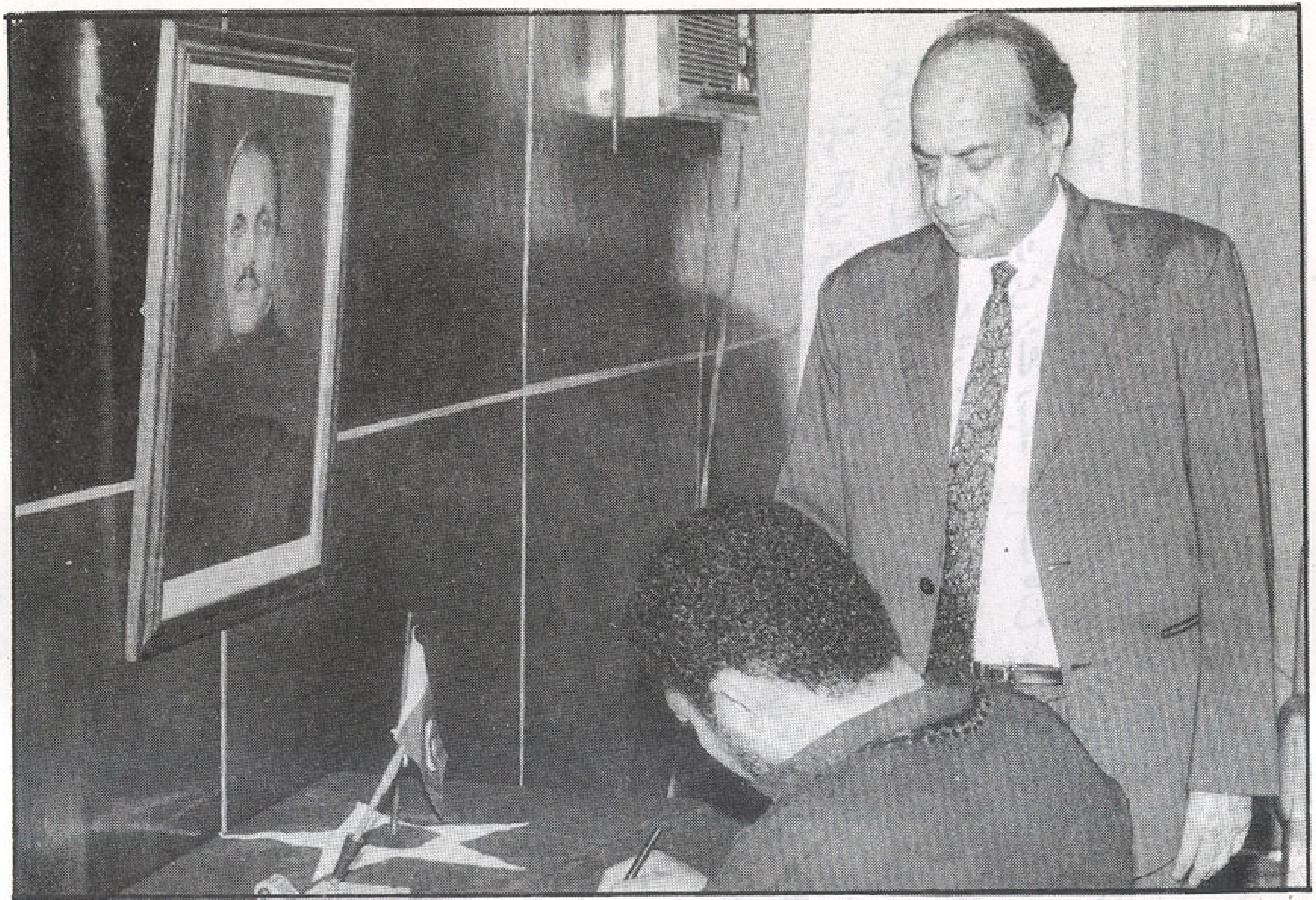

22 اگست 1992 صدر جنرل ضیاء الحق کی وفات پر صدر مملکت جیری جے رالنگ پاکستانی مشن میں تعزیتی کتاب میں دستخط کر رہے ہیں۔

کے قتل کی واردات پر افریقی ممالک میں خاص طور پر شدید ردعمل ہوا۔ گھانا میں سات دن تک سوگ منایا گیا کیونکہ گھانا کے سربراہ مملکت فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ کے کامریڈ سنکارا سے گہرے تعلقات اور مراسم تھے دونوں کے درمیان کوئی تکلف نہ تھا یہ بھی مشہور تھا کہ کامریڈ سنکارا کامریڈ کمپاری کے دیرینہ گہرے دوست ہیں دلی تعلق ان میں پرائمری کے زمانہ طالب علمی ہی سے تھا۔ دونوں ایک ہی سکول اور ایک ہی جماعت میں پڑھتے رہے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد زمانہ فوج میں بھی دونوں اکٹھے ہی رہے اور کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جس میں کامریڈ کیپٹن کمپاری جگری دوست کے گھر پر موجود نہ ہوتے۔

ایک انٹرویو میں کامریڈ کیپٹن کمپاری نے بتایا کہ اس کے جسم میں گردش کرنے والے خون کا ستر فیصد حصہ کامریڈ کیپٹن سنکارا کے گھر کی دعوتوں کا ہے۔ اب مشکل یہ پیش آئی کہ گھانا کی حکومت کیپٹن کمپاری کو برکینا فاسو کا نیا سربراہ مملکت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ حتیٰ کہ جب ٹیلیفون پر کیپٹن کمپاری نے فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ پھر اس نے گھانا میں برکینا فاسو کے سفیر کے ذریعے گھانا آنے کی اجازت مانگی تو اسے پھر انکار کر دیا گیا۔ ان حالات میں افغانستان کے بارے میں نئے سربراہ مملکت سے رابطہ ہو تو کیونکر۔ اور اگر ہو بھی جائے تو کیا امید لے کر اس کے پاس جاؤں۔ بادی النظر میں برکینا فاسو کی نئی حکومت سے کوئی امید وابستہ رکھنا عبث ہی تھا۔ پچھلے سال برکینا فاسو نے ہماری قرارداد کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ بدلے ہوئے حالات میں برکینا فاسو اپنا ووٹ کیوں تبدیل کرے گا۔ لیکن کوشش کرنے میں تو کوئی ہرج نہ تھا۔ میں کوشش کرنے کے لئے تیار تھا۔ لیکن میں اس تذبذب میں مبتلا ہو گیا کہ برکینا فاسو کا سفر اختیار کروں یا نہ۔ یہ فیصلہ مجھے خود ہی کرنا تھا۔ اس نازک مسئلے پر مقامی طور پر کوئی مشورہ نہ مل سکتا تھا۔ میں نے اسلام آباد اور نیویارک سے بات چیت کر کے ہدایات چاہیں۔ اسلام آباد میں میرا رابطہ ایڈیشنل سیکرٹری بختیار علی سے ہوا

فجر کی نماز کا وقت تھا۔ بختیار علی سو رہے تھے۔ جب انہیں میرے فون کے لئے جگایا گیا۔

میں ۔ السلام وعلیکم بختی جی کیا حال ہے معاف کریں میں نے آپ کو صبح صبح جگا دیا ہے۔ لیکن ایک اہم معاملے میں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

بختیار علی ۔ جی۔ بھائی صاحب بتائیں کیا بات ہے۔

میں ۔ آپ کو علم ہے کہ برکینا فاسو میں نئی حکومت آ چکی ہے نئے لوگوں سے ہمارا تعارف نہیں ہے افغانستان کے مسئلے پر ان سے رابطہ ضروری بھی ہے۔ جس کے لئے وہاں جانا ضروری ہو گا آپ کی کیا رائے ہے۔

بختیار علی ۔ بھائی صاحب۔ یہ تو آپ کی اپنی صوابدید پر ہے ویسے بھی اس ریجن کے بارے میں آپ خود موجود ہیں اور فیصلہ کر سکتے ہیں جیسا آپ محسوس کریں۔ اسی پر عمل کریں۔

میں ۔ میرا تو تجربہ کم ہی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ افغانستان جیسے مسئلے پر اگر برکینا فاسو سے رابطہ نہ کیا گیا تو پچھلے سال سے مختلف رویئے کی امید نہ ہو گی۔ کامریڈ سنکارا سے تو امید کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی حکومت کے سابقہ رویے ہر نظر ثانی کر لیں۔ لیکن نئے سیٹ اپ کے ردعمل کا کوئی علم نہیں ہے۔

بختیار علی ۔ پچھلے سال برکینا فاسو نے ہماری قرار داد کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ اب اگر پھر وہ اپنا ووٹ ہمارے خلاف دے۔ تو یہ آپ کی ذمہ داری تو نہیں ہو گی۔ بہرحال آپ خود فیصلہ کر لیں اور اگر آپ کو امید ہے کہ آپ کا سفر سود مند ہو گا۔ تو آپ ضرور چلے جائیں۔ مزید یہ کہ اگر آپ نہ بھی گئے تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے فیصلہ بہرحال

آپ نے کرنا ہے اور ذمہ داری بھی آپ ہی کی ہے۔

میں ۔ بھائی صاحب میں چلا تو جاؤں لیکن اگر ووٹ نہ ملا تو فارن آفس شور مچائے گا کہ پیشگی اجازت کے بغیر کیوں گئے خواہ مخواہ کا خرچہ ہوا۔

بختیار علی ۔ آپ اس بات کی فکر نہ کریں ویسے نیو یارک میں عبدالستار (سیکرٹری امور خارجہ) بھی ہیں اور شاہنواز سے بھی بات کر لیں۔ دونوں اس وقت میٹنگ کر رہے ہوں گے۔

میں نے نیو یارک سے رابطہ کیا عبدالستار تو میٹنگ سے جا چکے تھے اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندے شاہنواز کو ڈھونڈا تو مل گئے انہیں معلوم ہوا کہ ایمبیسڈر افتخار علی ان سے بات کریں گے۔ تو وہ خوش ہوئے دراصل انہوں نے سمجھا کہ سابق سفیر افتخار علی جو سابق سیکرٹری امور خارجہ بھی رہے ہیں لائن پر ہیں دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔

میں ۔ اسلام وعلیکم۔ جناب معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو اس وقت تکلیف دے رہا ہوں۔

شاہنواز ۔ نہیں۔ نہیں بھئ تکلیف کس بات کی لیکن تم عکرہ میں کیا کر رہے ہو۔

میں ۔ خانصاحب میں یہاں سفیر ہوں۔

شاہنواز ۔ وہ کب سے مجھے تو کوئی علم نہیں ہوا۔ اچھا یہ بتاؤ صحت کیسی ہے نیو یارک کب آ رہے ہو۔

میں بھانپ گیا کہ وہ مجھے سابق سفیر سمجھ رہے ہیں چنانچہ میں نے ان سے عرض کیا۔

جناب میں تو جونیئر سفیر ہوں اور سابق سفیر افتخار علی کے ساتھ عزیز داری تو ضرور ہے لیکن میں مختلف آدمی ہوں۔

میں نے اپنا مزید تعارف کروایا اور برکینا فاسو کے بارے میں ان کی رہنمائی چاہی۔

شاہنواز ۔ بھئی ہمیں تو گھانا کے متعلق شک ہے کہ اس مرتبہ ہماری قرار داد کی حمایت نہ کرے گا یہ بہت فکر کی بات ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس کا بہت منفی اثر مرتب ہو گا۔

میں ۔ ایکسیلنسی آپ گھانا کے متعلق فکرمند نہ ہوں انشا اللہ GHANA WILL REMAIN IN LINE. مجھے یقین ہے کہ یہ معاملہ ٹھیک رہے گا۔

شاہنواز ۔ سفیر صاحب آپ کے یقین کی داد دیتا ہوں لیکن یہاں ڈاکٹر عبید اساموا نے ہمیں گھاس بھی نہیں ڈالی۔ اور گھانا کا مندوب ملاقات تک سے گریزاں ہے۔ رہا برکینا فاسو کا معاملہ تو آپ اسے چنداں اہمیت نہ دیں۔ پچھلے سال بھی ان کا ووٹ ہماری قرار داد کے خلاف گیا تھا۔ اب بھی چلا جائے گا تو کیا ہو گا آپ گھانا کی فکر کریں۔

میں ۔ ایکسیلنسی میری رائے میں تو برکینا فاسو میں کوشش کر لی جائے تو کوئی ہرج نہیں ۔

شاہنواز۔ ٹھیک ہے آپ اپنی سی کوشش کر لیں۔

میں نے انہیں تاکید کی کہ ووٹنگ کے فوراً بعد مجھے وہ گھانا اور برکینا فاسو کے بارے میں ضرور اطلاع دیں۔ جس کی انہوں نے حامی بھر لی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے برکینافاسو چلے جانا چاہئے۔ اور میں دوسرے دن ۷ نومبر صبح پہلے جہاز سے عابد جان کے راستے برکینا فاسو پہنچ گیا پچھلی رات ہی کو وہاں میری آمد کی اطلاع ہو چکی تھی لہذا مجھے ایئرپورٹ سے سیدھا دفتر خارجہ لے جایا گیا وہاں نئے وزیر خارجہ پروفیسر پالم اور دفتر خارجہ کے سیکرٹری سے تقریباً تین گھنٹے تک

میری بات چیت ہوتی رہی۔

وزیر خارجہ بننے سے پہلے مسٹر پالم مقامی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور وہاں پولیٹکل سائنس پڑھاتے تھے افغانستان کے مسئلے پر ان سے میری سیر حاصل گفتگو ہوئی اسی شام صدر مملکت کامریڈ کمپاری سے پون گھنٹے تک بات چیت رہی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو روز بعد جب اقوام متحدہ میں جنرل اسمبلی میں ووٹنگ ہوئی تو برکینا فاسو نے پاکستان کے ریزولیوشن پر غیر جانبداری سے کام لیا جس پر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ یہ ایک ایسی کامیابی تھی جس پر دفتر خارجہ اسلام آباد نے بھی میری کامیابی کا اعتراف کرتے ہوئے ایک خط کے ذریعے اظہار مسرت کیا۔ مجھے اس ضمن میں دفتر خارجہ اسلام آباد سے دو تعریفی خطوط ملے اس کے علاوہ گھانا کے سفارتی حلقوں نے بھی مبارکباد پیش کی۔ بالخصوص برطانیہ کے ہائی کمشنر نے مجھے ایک تعریفی خط بھی لکھا۔

دفتر خارجہ کے قواعد و ضوابط کچھ اس طرح سے ہیں کہ مشن میں کاریں ہر تین سال بعد تبدیل کر دی جاتی ہیں گھانا کے مشن میں میرے پیشرو کے زمانے میں ایک مرسڈیز ۸۶-۱۹۸۵ ماڈل تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو مجھے اس کار کو دیکھ کر مرسڈیز بنانے والوں پر ترس آیا۔ کار بری طرح شکستہ و خستہ حالت میں تھی۔ اور اس وقت تک مشن کار کی مرمت پر تقریباً چار ہزار ڈالر خرچ کر چکا تھا لیکن خاطر خواہ حالت میں یہ گاڑی نہ تھی۔ میں نے ذاتی دلچسپی لے کر ورکشاپ سے اس کے تمام نقائص دور کروائے۔ اور اسے استعمال کے لائق بنا دیا۔ اب صرف ایئرکنڈیشنر کا ایک نقص باقی تھا ہر دوسرے تیسرے ہفتے ایئرکنڈیشنر کام کرنا چھوڑ دیتا تھا جس سے بار بار گیس بھروانی پڑتی جو خواہ مخواہ کا خرچہ تھا۔

جب مقامی طور پر نقص دور نہ ہوا تو مجھے شبہ ہوا کہ اس کی ساخت میں ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ مختصراً یہ کہ ایئرکنڈیشنڈ کار کو استعمال میں آئے بمشکل تمام ایک سال گزار ہو گا کہ اس میں بہت سی توڑ پھوڑ اور فنی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ جنہیں

دور کروانے کے لئے اکثر و بیشتر اوقات ورکشاپ میں جانا پڑتا تھا میں نے ایک ایک کر کے کار کے تمام نقائص اپنی ہدایت و نگرانی میں دور کروا لیے۔ مگر یہ ایئر کنڈیشنر مقامی طور پر ٹھیک نہ ہو سکا میں نے کار بنانے والی جرمن کمپنی کو خط لکھا جس میں واضح کیا کہ مقامی طور پر اس کار کے ایئر کنڈیشنر کا نقص سمجھ میں نہیں آ رہا اور مجھے اس کا نقص چونکہ اس کی مینو فیکچرنگ میں محسوس ہو رہا ہے اس لئے کار ساز ادارے کی حیثیت سے اس کا کچھ بندوبست کریں یہ خط لکھنے کے ایک ہفتے کے اندر اندر مجھ سے انہوں نے رابطہ قائم کیا اور یقین دلایا کہ ان کا ایک نمائندہ جو ابھی جنوبی افریقہ کے دورے پر ہے وہاں سے واپس آتے ہی پہنچ جائے گا چند روز بعد وہ آیا اور اس نے آتے ہی ایک معمولی خرچ پر کار ایئر کنڈیشنر کو ٹھیک کر دیا۔

اب وزارت خارجہ سے مشن میں خط موصول ہوا کہ قاعدے کے مطابق تین سال سے جو گاڑی آپ کے پاس ہے وہ پرانی ہو چکی ہے اس لئے بجٹ میں نئی گاڑی لینے کے لئے رقم کا انتظام کرنے کے لئے کوئی تجویز بھیجیں تو میں نے صاف صاف لکھ بھیجا کہ پرانی گاڑی بہت عمدہ طریقے سے چل رہی ہے اس لئے نئی گاڑی لینے کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی اور اس طرح قومی خزانے کی ایک کثیر و خطیر رقم کو ناحق خرچ ہونے سے میں نے بچا لیا۔ اور دفتر خارجہ نے میری اس تجویز کو بنظر استحسان دیکھا اور تحریری طور پر میری حوصلہ افزائی کی۔

گھانا اور پاکستان کے درمیان تجارت نام کو بھی نہیں۔ سبب یہ ہے کہ تجارت پیشہ اصحاب اس افریقی خطے کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجوہات ڈھونڈنے لگیں تو بیشمار مل جائیں گی۔ مگر میری دانست میں سب سے بڑی وجہ مغربی افریقہ کے بارے میں معلومات کی کمی ہے۔ اس بات کا احساس پہلی بار مجھے دفتر خارجہ میں چند ماہ کے قیام کے دوران ہوا لائبریری میں مغربی افریقہ کے بارے میں جتنی کتب موجود تھیں وہ سب کی سب کم از کم دس برس پرانی اور شکستہ حالت میں تھیں۔ مغربی افریقہ نے جو رپورٹ ۱۹۸۵ء میں ہمارے سفارت خانے کی طرف سے

فراہم کی گئی تھی وہ دستیاب نہ تھی- اس سے پہلے کی جو رپورٹیں موجود تھیں ان سے نئی اور تازہ معلومات میسر نہ آسکتی تھیں پاکستان کے سفیر نے جو اپنی سالانہ رپورٹ بھیجی تھی اس میں انہوں نے اپنے کارناموں کا ذکر تو بڑی تفصیل سے کیا تھا مگر اس خطہ ارض کے بارے میں تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا- آخر کار میری درخواست پر گھانا کے بارے میں گھانا سے تازہ رپورٹ منگوائی گئی جس میں مہنگائی کا رونا زیادہ تھا اور اس بات کا بھی ذکر تھا کہ گھانا میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ انتظام نہیں ڈاک اور ٹیلیفون کا انتظام نہایت خراب اور ناقص ہے- اور بس-

مختصراً یہ کہ اس خطے کا اس قدر خوفناک اور ہیبت ناک نقشہ کھینچا گیا تھا کہ حوصلہ پست ہوتا چلا جاتا تھا اور یہ کہ جو کار آمد معلومات کسی ملک کا تعارف کرانے کے لئے ضروری ہوتی ہیں وہ اس رپورٹ میں بھی نہیں تھیں مغربی دنیا سے آمدہ جو چند ایک کتب میں نے ڈھونڈ نکالی تھیں ان میں بھی ضروری معلومات کا فقدان تھا-

اس اثناء میں مس ایس کے جان سے میری ملاقات ہوئی جو پاکستان کی جانب سے گھانا میں چار سال تک سفیر رہ چکی تھیں انہوں نے گھانا کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کی تصویر کشی کی وہ اور بھی ڈراونی اور بھیانک تھی - الغرض مجھے گھانا کے بارے میں درست اور صحیح معلومات کہیں سے بھی حاصل نہیں ہوئیں اس امر کے باوصف کہ براعظم افریقہ کے تمام ممالک اقوام متحدہ کے رکن ہیں- اور ان کے ووٹوں کی تعداد تمام ارکان ممالک کی تعداد کا تیسرا حصہ ہے- دفتر خارجہ کی فائیلوں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری وزارت خارجہ کی ترجیحات میں افریقہ شامل نہیں اسی طرح تجارت کے معاملے میں بھی ہم نے افریقہ کی جانب توجہ نہیں دی- اس سلسلے میں نہ تو حکومت کی سطح پر کبھی توجہ دی گئی ہے نہ پاکستان کے تجارت پیشہ افراد اور مینو فیکچرز ہی نے اس طرف کبھی خیال کیا-

ایکسپورٹ پروموشن بیورو کی ترجیحات میں بھی جاپان- کوریا اور جرمنی- امریکہ

وغیرہ تو شامل ہیں افریقہ اس کی ترجیحات میں بھی نہیں۔ غرض افریقہ کو سرکاری اور کاروباری سطح پر تجارت کے لئے موزوں خیال نہیں کیا جاتا۔ مگر بایں ہمہ اس براعظم سے ووٹ مانگنے میں ہم نے کبھی کوئی عار محسوس نہیں کی۔

گھانا میں ہر سال ایک بین الاقوامی تجارتی میلہ لگتا ہے دنیا بھر کے ممالک اس میلے میں حصہ لیتے ہیں اور اپنی مصنوعات کی نمائش کرتے ہیں۔ کیوبا' چین' بھارت' روس' امریکہ' جرمنی اور برطانیہ باقاعدگی سے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ سرکاری اور نجی ادارے اس میلے میں بطور خاص نمائش کے لئے اپنی مصنوعات پیش کرتے ہیں۔

فروری مارچ ۱۹۸۷ء میں جب ایسا میلہ لگا تو مجھے پتہ چلا کہ ایک بھولا بھٹکا پاکستانی تاجر اس میلے میں حصہ لینے کے لئے یہاں آگیا ہے میں نے اپنے سیکنڈ سیکرٹری کی وساطت سے اس سے رابطہ قائم کیا اس میلے کا افتتاح گھانا کے پی وی اوبنگ نے کیا۔ ان کا عہدہ ہمارے ملکی وزیراعظم کے برابر ہے۔ مقامی طور پر انہیں چیئرمین آف کونسل سیکرٹریز کہا جاتا ہے۔ میں نے انہیں پاکستانی مصنوعات میں سے چند نقشی کے کام والے گلدان تحفے کے طور پر ان کی خدمت میں پیش کئے۔ وہ بے حد خوش ہوئے ان کے ہمراہ وہاں کے سیکرٹری ڈیفنس (وزیر دفاع) اور سیکرٹری تجارت (وزیر تجارت) اور کمانڈر انچیف بھی تھے۔ میں نے سب کو تحفے پیش کئے اور اس طرح پی وی اوبنگ سے میری دوستی کی بنیاد استوار ہو گئی۔ جس گرمجوشی سے گھانا کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں پاکستانی مصنوعات کی پذیرائی ہوئی اس سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ اور میں نے اگلے سال کے میلے کے لئے کاغذی گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے۔ بالاخر میری پیہم کوششوں سے ایکسپورٹ پروموشن بیورو کراچی نے چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کو سرکاری طور پر ۱۹۸۸ء میں ہونے والے میلے کے لئے نامزد کر دیا۔

فروری مارچ ۱۹۸۸ء میں پاکستان کی جانب سے بارہ تاجروں نے اس میلے میں حصہ لیا۔ لکڑی کی مصنوعات' تیار شدہ کپڑے' کھیل کا سامان' شیشے کا سامان' قالین'

مصنوعی زیورات' آرٹی فیشل جیولری' کٹلری' جوتے' چوڑیاں اور گھریلو دستکاری (ہینڈی کرافٹ) وغیرہ۔ غرض پاکستانی مصنوعات کی جو شے بھی ہم نے پیش کی وہ فوراً بک گئی۔

شہریوں کے علاوہ اس میلے میں گھانا کے دور دراز کے دیہات سے بھی لوگ آئے۔ ایک ڈپلومیٹ تو نائجیریا سے بھی آئے اور لکڑی کا سامان خرید کر لے گئے جس میں بہت عمدہ طور سے نقش و نگار اور بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔

اس سال صرف اور صرف ہمارے ہی تاجروں کی دکانوں پر رش رہا اور ہمارے رقیب حسرت سے ہمارے انتظام و انصرام کو دیکھتے رہے۔ پاکستانی مصنوعات کی بے پناہ پذیرائی ہوئی اور بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ گھانا کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں پاکستانی مصنوعات میں سے کوئی نہ کوئی شے موجود نہ ہو۔ کیا لبنانی کیا ہندوستانی یا یورپی ممالک سبھی نے پاکستانی سٹال سے کوئی نہ کوئی شے ضرور خریدی۔ بلغاریہ کے سفیر نے تو دو پاکستانی ٹیبل سیٹس خریدے جو منقش تھے تمام سفارت کار سٹالوں پر پہنچتے وہیں سے ہمارے مشن میں فون کرتے اور میں ان کے سامنے موجود ہوتا

ایک روز پی وی اوبنگ نمائش میں تشریف لائے۔ مجھ سے ملاقات ہوئی انہوں نے مجھے تجویز دی کہ پاکستانی تاجروں سے گھانا کے معزز اور موثر ارکان کی ملاقات ہونی چاہیے۔ یہ میری عزت افزائی تھی۔ میں نے انہی کے مشورے سے حکومت کے اہم ارکان' گھانا حکومت کے سات وزراء' بینک آف گھانا کے چیئرمین اور سیکرٹری' کسٹمز کے سربراہ' امیگریشن کے سربراہ' ایئرپورٹ کے سربراہ' ٹرانسپورٹ' تجارت' چیمبرز آف کامرس' ایکسپورٹ پروموشن بیورو اور ان تمام لوگوں کو بھی مدعو کر لیا جو کسی نہ کسی طرح تجارتی پالیسی کے بارے میں اثر انداز ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس دعوت میں میرے مشن کا تمام عملہ اور تاجر حضرات نے بھی شرکت کی۔

یہ تقریب اس لحاظ سے بیحد اہم تھی کہ مسٹر اوبنگ نے پاکستانی تاجروں کو ساٹھ فیصد

ڈیوٹی سے مستثنیٰ کئے جانے کا اعلان کیا جس سے پاکستانی تاجر بے حد خوش ہوئے اور اس کاروائی پر دفتر خارجہ نے بھی مسرت محسوس کی اور اس سلسلے میں میرے نام خط لکھا جس میں میری اس کوشش کو بے حد سراہا گیا۔ علاوہ ازیں دفتر تجارت کی طرف سے میری حوصلہ افزائی کے لئے میرے تجزیات اور پیش کردہ تجاویز کے بارے میں نہایت معقول اور مثبت رویہ اختیار کیا گیا۔

ایک معصوم معاہدہ جو پذیرائی سے محروم ہے

گھانا کے صدر مقام عکرہ میں ہر سال ایک بین الاقوامی نمائش کا فروری اور مارچ کے مہینوں میں اہتمام کیا جاتا ہے۔ موسم کے لحاظ سے یہ دو چار مہینے خشک رہتے ہیں۔ دھوپ بھی کم پڑتی ہے اس لئے نمائش کے لئے یہ مہینے نہایت موزوں خیال کئے جاتے ہیں۔

نمائش لگانے کی تیاری ہر سال اکتوبر کے مہینے سے شروع ہوتی ہے روس جاپان' کوریا' جرمنی' فرانس چین' بھارت کچھ افریقی ممالک اور کیوبا اس نمائش میں شریک ہو کر اپنے اپنے ملکوں کی مصنوعات پیش کرتے ہیں دوران نمائش غیر ملکی تجارتی وفود بھی آتے ہیں جو اپنے اپنے ملک کے لئے تجارتی حلقوں میں لابی کرتے ہیں۔

۱۹۸۶ء کے وسط تک گھانا میں سال کے سال ہونے والی کسی نمائش میں پاکستان کبھی شریک نہیں ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہم نے سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر افریقہ خاص طور پر مغربی افریقہ کو تجارت کی فہرست میں کبھی شامل نہیں کیا۔

اس خطہ زمین کے ممالک سیرا لیون SIERRALEON لائیبریا LIBERIA کوٹ ڈی ایوار COTE DE IVOIRE برکینا فاسو BURKINA FASO اور ٹوگو TOGO کے دورے کے دوران میں نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ پاکستانی مصنوعات افریقہ کے کسی ایک ملک میں کسی سٹور یا دکان پر بھی دیکھنے میں نہیں آئی ہیں جب کہ ان ملکوں میں ہر شے درآمد کی جاتی ہے۔

ٹوگو اور کوٹ دی ایوار اور برکینا فاسو آزاد ہونے سے پہلے فرانس کے زیر تسلط

ممالک تھے۔ آج بھی ان ملکوں پر فرانس کا اثر موجود ہے ان ملکوں میں درآمدات پر بھی فرانس ہی کا کنٹرول ہے اگرچہ فرانس سے درآمدات گراں ہوتی ہیں تاہم دکانیں فرانسیسی چیزوں سے اٹی پڑی رہتی ہیں ان ملکوں میں کرنسی CFA سی فا کہلاتی ہے تقریباً ۳۰ سال پہلے اس کرنسی کی جو قیمت مقرر ہوئی تھی فرانس نے اب تک اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ ایک فرانسیسی فرانک FRENCH FRANC کی قیمت پچاس "سی فا" ہوتی ہے کرنسی کی قیمت میں یہ استحکام ہی ان ممالک کی فرانس کے ساتھ روز افزاوں تجارتی تعلقات کا راز ہے۔ ان فرانکو فون (FRANCOPHONE) ممالک میں فرانسیسی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے ذریعہ تعلیم بھی فرانسیسی ہی ہے۔

گھانا لائیبریا اور سیرالیون میں مختلف مقامی کرنسی چلتی ہے گھانا کی کرنسی سی ڈی کہلاتی ہے لائیبریا کی کرنسی امریکی ڈالر کی ہم نام ہے سیرالیون کی کرنسی لیونی کہلاتی ہے سی فا تمام فرانکو فون ممالک میں مستعمل ہے اس لئے ان ملکوں کو آپس میں تجارت کرتے ہوئے ڈالر' پاؤنڈ یا فرانک کے سہارے کی ضرورت پیش نہیں آتی اینگلوفون ممالک یعنی وہ ممالک جو آزادی سے پہلے برطانیہ کے زیر تسلط تھے ان میں ایسی صورتحال موجود نہیں یعنی ان کی مشترکہ کرنسی نہیں ہے اور اسی بات سے ماضی کی ان دو استعماری قوتوں کے مزاج کا فرق صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

اینگلو فون ممالک میں کرنسی کی قیمت روزانہ تبدیل ہوتی رہتی ہے ایک ملک کی کرنسی دوسرے ملک میں استعمال نہیں ہو سکتی۔ کرنسیوں کا عدم استحکام اور زرمبادلہ کی کمی وہ بڑے عناصر ہیں جن کے باعث پاکستان کے تاجر بھی ان ملکوں کے ساتھ اپنے تجارتی روابط بڑھانے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ سرکاری طور پر بھی یہی حال ہے۔ پاکستان کے تمام چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری ایکسپورٹ پروموشن بیورو' تاجران انڈسٹری کے بڑے بڑے ادارے ٹریڈنگ کارپوریشن اوردوسرے ادارے جن کی ذمہ داری برآمدات کو فروغ دینا ہے افریقہ میں عمومی طور سے اور مغربی افریقہ میں خصوصی طور پر کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔

ایکسپورٹ پروموشن بیورو میں موجودہ اعداد و شمار نہایت مایوس کن ہیں مئی ۱۹۸۵ء میں پاکستان سے ایک تجارتی وفد بھی گھانا' لائبیریا اور سیرالیون کے دورے پر گیا تھا۔ اس نے ایک تفصیلی رپورٹ حکومت کو پیش کی تھی' اپنے دورے کی روشنی میں مختلف سفارشات بھی مرتب کیں۔ جن پر اس وفد کے خیال میں عمل کرنے سے پاکستانی برآمدات میں اضافہ ہونے کا امکان ہے۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک تو میں نے ان میں سے کسی ایک سفارش پر بھی عمل ہوتے نہیں دیکھا۔ میں نے ایک بار اس وفد کی رپورٹ کی نقل منگوانے کے لئے متعلقہ وزارت کو لکھا۔ جواب تو کیا آنا تھا مجھے اس خط کے وصول ہونے کی رسید تک نہیں دی پھر ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک حکومت وقت کی ترجیحات میں سے افریقہ اور برآمدات دونوں غائب رہے ہیں پہلے بھی یہی حال تھا افریقہ کا براعظم ہماری سیاسی' تجارتی اور دوستی کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارا قومی خاصہ ہے کہ ہم اول تو اپنی قومی ترجیحات کا تعین ہی نہیں کرتے اور اگر کر بھی لیں تو وہ ایڈہاک ازم کی نذر ہو جاتی ہیں۔

ہم قومی مفادات ذاتی انا کی قربانگاہ کی بھینٹ چڑھانے کے بھی عادی ہو چکے ہیں اور اس پر فخر محسوس کرتے ہیں افریقہ ہماری مصنوعات کے لئے بہت بڑی منڈی ہے۔ بہت بڑی اتنی بڑی کہ ہم اس کا انداز نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم تو ایسی ایسی مصروفیات میں مشغول ہیں جو قومی مفاد کے زمرے میں نہیں آتیں۔

ہمارے دفتر خارجہ کو بھی یہ احساس نہیں کہ دو ملکوں کے درمیان دوستی اور خیر سگالی کی اصل بنیاد ہی تجارتی رابطہ ہوتا ہے بے غرض اور مخلصانہ تعلقات کا تصور بین الاقوامی تعلقات میں نہیں ہے۔ ہر ملک کے اپنے اپنے مفادات ہوتے ہیں۔ لہٰذا بین الاقوامی سطح پر تعلقات کا انحصار محض ملکی اور قومی مفادات پر مبنی ہوتا ہے۔ خالی خولی دوستانہ جذبات پر نہیں۔

لیکن ہم نے بین الاقوامی حلقہ اثر کے حصول کے لئے کبھی کوشش ہی نہیں کی ہم تو ابتداء ہی سے امریکہ اور اس کے دوستوں کے زیر اثر چلے آ رہے ہیں اور اسی

پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہیں کہ امریکی فرانسیسی اور برطانوی حلقہ اثر تمام تر ہمارے تصرف میں ہے نہ ہم نے کوئی نئے دوست بنائے اور نہ ہماری وزارت خارجہ نے پرانے دوستوں ہی کی طرف کبھی اپنی توجہ مبذول کی اور نہ ہی سابقہ تعلقات کو مضبوط و مستحکم بنانے کی کوشش کی ہے اگر مغربی طاقتوں کا مفاد ہمارے مفاد سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ تو ہم صرف دست تاسف ملتے رہ جاتے ہیں لیکن اپنے تئیں دوطرفہ دوستانہ تعلقات نہ تو تجارتی بنیاد پر استوار کرتے ہیں نہ سیاسی اور نظریاتی بنیاد پر۔

ہمارے یہاں وزارت خارجہ وزارت خزانہ اور وزارت تجارت کے درمیان اس حد تک تو ہم آہنگی ہے کہ یہ تینوں وارتیں ایڈہاک بنیادوں پر چلائی جا رہی ہیں۔ ورنہ ان کے درمیان نہ تو کوئی قدر مشترک ہے اور نہ ہی ربط و ضبط ان کی انفرادی ایڈہاک پالیسیوں کے باعث جو منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اول تو ان کا ادراک ہی نہیں ہو پاتا اور اگر ہوتا ہے تو اغماض برتا جاتا ہے محض خانہ پری کی سمری تیار ہوتی ہے اور خانہ پری کے احکامات جاری ہوتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اصولوں کی ہیئت اور ان کے اطلاق کا موقع محل مختلف ہو جاتا ہے جن کا اثر بین الاقوامی تجارتی رابطوں پر بھی پڑتا ہے لیکن بین الاقوامی تجارتی رابطے صرف متعلقہ ممالک کے درمیان دو طرفہ مفادات کے تابع ہوتے ہیں اور ان میں تبدیلی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

جب اس قاعدے' کلیئے اور ضابطے کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے مغربی افریقہ کے ممالک سے تجارت کرنے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو بڑی مایوس کن باتیں سامنے آئیں میں نے اس کا ذکر مشن کے کونسلر سے کیا تو وہ بے ساختہ ہنس دیا اور کہنے لگا۔ سفیر صاحب! آپ کس چکر میں پڑ گئے آپ سیاسی فیلڈ سے آئے ہیں۔ دو تین سال آپ کی سفارت ہے آرام کریں یہاں تو ۲۸ سال سے کوئی تجارت نہیں ہوئی اس نے مزید کہا کہ جب آپ سے پہلے کے سفیروں سے تجارت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا گیا تو آپ سے کون پوچھے گا مختصراً یہ کہ کونسلر کی رائے

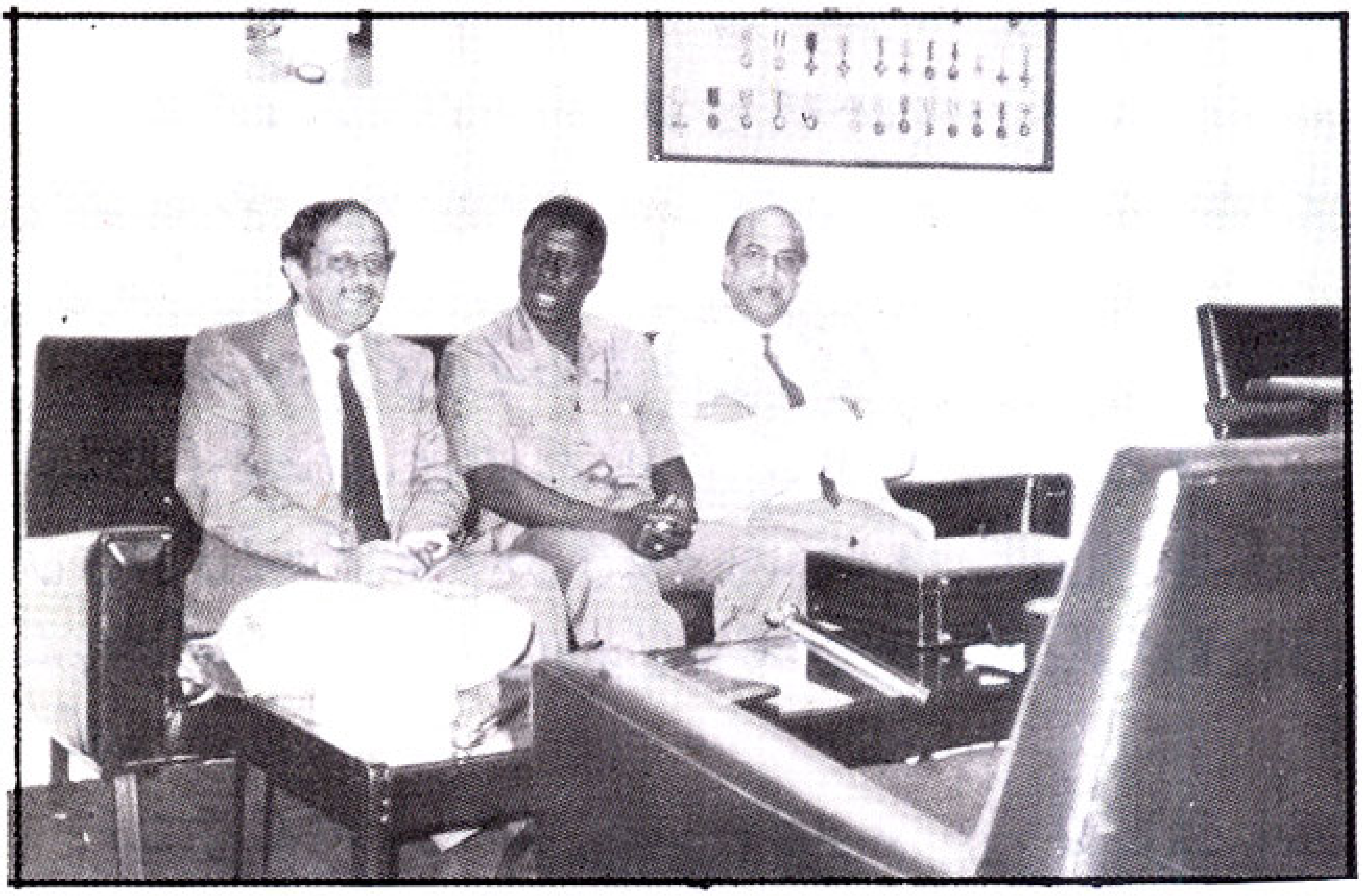

افتخار علی شیخ، پی وی اوبنگ چیئرمین آف کونسل آف سیکرٹریز، خواجہ بشیر بخش آف ایچ کریم بخش اینڈ سنز لاہور فروری 1988 تجارتی میلے کے موقع پر

میں تجارت کے بارے میں یہاں کچھ سوچنا اور اس کے لئے تگ ودو کرنا بالکل بے فائدہ تھا۔

گھانا کے چیمبرز آف کامرس کی جانب میں نے رجوع کیا تو وہاں عالم یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ارکان کے ناموں کی ڈائریکٹری تک طبع نہیں کرائی تھی اسی دوران ایک اور انکشاف یہ ہوا کہ تقریباً دس برس کی مدت سے پاکستان اور گھانا کے درمیان ایک ٹریڈ ایگریمنٹ کا مسودہ زیر ترتیب ہے اور ابھی تک اسے کوئی حتمی شکل نہیں دی جا سکی۔ دونوں ملکوں کے درمیان تجارت پر بات چیت خط و کتابت پر غور سے آگے نہیں بڑھی پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ ماضی بعید میں جن برآمد کنندگان حضرات نے پاکستان سے کچھ مال گھانا بھیجا تھا اس کی رقم گھانا کی اقتصادی بدحالی کے باعث انہیں ابھی تک نہیں مل سکی تھی۔

ایک دفعہ مقامی کرنسی کی قیمت گرنی شروع ہو گئی تو گرتی ہی چلی گئی۔ ۱۹۵۷ء میں ایک ڈالر کی قیمت ایک سی ڈی کے برابر تھی بلکہ ڈالر کی قیمت قدرے کم تھی بعد میں سی ڈی کی قیمت کم سے کم ہوتی گئی چنانچہ بینک آف گھانا کے پاس زرمبادلہ کی کمی کے باعث گھانا کی درآمدات کا بل ادا نہ کیا جا سکا جس سے پاکستانی برآمد کنندگان بددل ہو گئے۔

آئے دن کے انقلابات اقتصادی پالیسیوں کا فقدان اور اس پر قحط سالی کے باعث گھانا کی حالت بد سے بد تر ہوتی گئی ایسے مخدوش حالات میں پاکستانی تاجروں کا تجارت کرنے میں گریز تو سمجھ میں آتا ہے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے دفتر خارجہ نے مغربی افریقہ سے تجارت کرنے اور پروموٹ کرنے میں گریز کی پالیسی سالہا سال تک کیوں اختیار کئے رکھی کہ تجارتی معاہدہ کے شین قاف درست کرنے میں ہی دس سال گنوا دیئے۔

مغربی افریقہ سے ہم ہر سال چین۔ امریکہ اور فرانس کی وساطت سے ووٹ تو مانگتے ہیں مگر اس خطہ سے دست تعاون بڑھانے کی ہماری جو قومی اور اخلاقی ذمہ داری ہے

اس پر ہم نے کبھی توجہ نہیں دی ہم نے یہاں پاکستان کے تشخص کو اب تک نہ آگے بڑھایا اور نہ اسے استعمال کیا ہم نے گریز کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اس علاقے میں اپنے تجارتی روابط قائم کرنے کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔

پاکستانی برآمدات کو فروغ دینے والے اداروں کی فائلوں میں گھانا اور مغربی افریقہ کے ممالک سے متعلق کوئی کوائف موجود نہیں۔ ایکسپورٹ پروموشن بیورو کے پاس البتہ ایک ریکارڈ موجود ہے جس کے مطابق پاکستان اور مغربی افریقہ کے درمیان تجارت نہ ہونے کے برابر ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ سرے سے ہے ہی نہیں۔

۸۴'۸۵ سے اب تک پاکستان نے گھانا کو کوئی شے برآمد نہیں کی۔ سیرالیون نے ۸۴'۸۵ میں پاکستان سے چاول خریدار تھا اور بس برکینا فاسو نے پاکستان سے فقط تھوڑا سا سوت خریدا تھا لائیبریا اور ٹوگو نے پاکستان سے سوتی کپڑا درآمد کیا تھا۔ ۸۴۔ ۱۹۸۵ء کے ریکارڈ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان ملکوں نے پاکستان کو کچھ بھی برآمد نہیں کیا۔ مختصراً یہ کہ سرکاری یا نجی سطح پر مغربی افریقہ کے ساتھ ہمارا کوئی قابل ذکر تجارتی رابطہ قائم نہیں عام طور پر نجی سطح پر تجارتی رابطہ قائم نہ کئے جانے کی وجہ تو معلوم ہو جاتی ہے لیکن جہاں تجارتی رابطہ قائم کرنے سے سیاسی طور پر بین الاقوامی معاملات میں فائدہ اٹھانا مطلوب ہو وہاں سرکاری روابط کا قائم نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

میں نے ۱۹۸۶ء میں ایکسپورٹ پروموشن بیورو سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کیا تھا مجھے بتایا گیا کہ رواں سال کا چونکہ سارا پروگرام طے پا چکا ہے اس لئے فروری اور مارچ ۱۹۸۷ء میں ہونے والی نمائش میں حصہ لینے سے وہ معذور ہیں۔ حالانکہ لاہور چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدر جناب ممتاز حمید نے میری روانگی سے پہلے ایک ملاقات میں زور دے کر کہا تھا کہ لاہور چیمبرز آف کامرس کے زیر انتظام پاکستانی مصنوعات کی ایک نمائش کا ضرور بندوبست ہونا چاہیے۔ جس میں وہ میری ہر طرح اعانت کریں گے۔ چنانچہ میں اسی خیال کے تحت پاکستانی برآمد کنندگان سے باقاعدہ طور

سے رابطہ قائم کر رہا تھا نمائش کی مقررہ تاریخ بھی قریب آ رہی تھی مگر کونسلر شیر محمد لونڈ خود کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حالانکہ اسی کی تجویز پر نمائش میں پاکستان کے شریک ہونے کا انتظام کرنے کی سیکنڈ سیکرٹری سلطان احمد کی میں نے ڈیوٹی لگائی تھی کہ فروری مارچ ۱۹۸۷ء میں ہونے والی نمائش میں پاکستان کی جانب سے شمولیت کے انتظامات کو دیکھے اور اگر ہو سکے تو بندوبست کرے۔

سلطان احمد نے تگ و دو کر کے ایک سٹال بک کرا لیا اور نمائش میں شرکت کے تمام انتظامات نمائش کمیٹی سے طے کر لئے۔ انہوں نے ایک نوٹ لکھا اور سٹال کا کرایہ معہ سیکورٹی وغیرہ کے تمام اخراجات کا بل تقریباً بارہ سو ڈالر اکاؤنٹنٹ کو پیش کر دیا اس وقت یہ معلوم ہوا کہ نمائش میں شرکت کے لئے بجٹ میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ نمائش میں حصہ لینے کے لئے دفتر خارجہ اور وزارت خزانہ سے پیشگی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے بلکہ پیشگی منظوری کے بغیر اس ضمن میں کوئی خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ کونسلر اور اکاؤنٹنٹ نے ان قواعد کو مجھ سے پوشیدہ رکھا تھا۔

اس پر میں نے دونوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ سیکنڈ سیکرٹری اس نمائش میں پاکستان کی شرکت کے لئے برابر چھ ہفتوں سے لگے ہوئے ہیں۔ اب کہ اسے فائنل کرنے کا وقت آیا ہے تو آپ لوگ اعتراضات کر رہے ہیں۔ اس بات کے جواب میں کونسلر نے تو یہ کہا کہ وہ تو ابتدا ہی سے اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا اکاؤنٹنٹ کا جواب کچھ اس طرح سے تھا کہ "اس نمائش میں شرکت کے بارے میں آپ نے مجھ سے پوچھا کب تھا؟ اگر آپ اس پروجیکٹ کو شروع کرنے سے پہلے معلوم کر لیتے تو میں ضرور درست صورتحال عرض کئے دیتا۔"

مجھے اس بات سے رنج تو بہت ہوا ناحق چھ ہفتے ضائع کئے لیکن اس کا فائدہ آگے چل کر مجھے یہ پہنچا کہ مجھے دفتری طریقہ کار کا پتہ چل گیا اور میں آئندہ کے لئے محتاط ہو گیا چنانچہ میں نے تمام کاروائی قلمبند کر کے آخر پر یہ تحریر کر دیا کہ بجٹ پروویژن نہ

ہونے کے باعث نمائش میں حصہ نہ لیا جائے۔ سیکنڈ سیکرٹری سے میں نے کہا کہ نمائش میں شریک نہ ہونے کے لئے کوئی عذر پیش کیا جائے اور گلو خلاصی کر لی جائے اس بچارے نے حکم کی تعمیل کی اور کسی نہ کسی طرح نمائش کمیٹی سے معذرت کر لی۔

اگرچہ نمائش میں سرکاری طور پر پاکستان شریک نہ ہو سکا تاہم نجی طور سے شرکت کا موقع پاکستان کو ضرور میسر آ گیا جسے ہم نے سرکاری رنگ دے دیا۔ سیکنڈ سیکرٹری چوہدری سلطان احمد نے مجھے بتایا کہ اس نمائش میں حصہ لینے کے لئے کراچی سے ایک فرم آ رہی ہے اور اس نے اپنے لئے پہلے سے سٹال بھی مخصوص کروا رکھا ہے پھر نمائش کمیٹی سے پتہ چلا کہ اس فرم کے پروپرائٹر نمائش سے چند روز قبل عکرہ پہنچ جائیں گے اس پر سیکنڈ سیکرٹری نے فوری طور پر ان سے رابطہ قائم کیا اور انہیں خوش آمدید کہی انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور نمائش کی تاریخ کے قریب آنے تک ہم سے مسلسل رابطہ قائم کئے رکھا اور خدا خدا کر کے نمائش کے افتتاح کا دن بھی آ گیا۔

اگرچہ پروگرام میں واضح طور سے تحریر تھا کہ نمائش کا افتتاح صدر مملکت فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ کریں گے لیکن عین وقت پر یہ اعلان ہو گیا کہ نمائش کا افتتاح مسٹر پی وی اوبنگ کریں گے ان کا مرتبہ مملکت میں ہمارے وزیر اعظم کے برابر ہے انہیں چیئرمین آف کمیٹی آف سکریٹریز کہا جاتا ہے اور سیکرٹری کا رتبہ ہمارے یہاں کے وزیر کے مساوی ہوتا ہے۔

پی وی اوبنگ نے نمائش کا افتتاح کیا نمائش میں حصہ لینے والے غیر ممالک کے قومی جھنڈے نمائش گاہ کے باہر گیٹ کے پہلو میں نصب کر دیئے گئے میں جب نمائش گاہ پہنچا تو مجھے پاکستان کا قومی جھنڈا لہراتا ہوا نظر نہ آیا۔ اس پر مجھے رنج ہوا۔ سیکنڈ سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ پاکستان چونکہ سرکاری طور پر اس نمائش میں شریک نہیں اس لئے ضابطے کے مطابق پاکستان کا قومی جھنڈا بھی نہیں لہرایا گیا۔ مگر میں جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ میں نے تھوڑی سی دوڑ دھوپ اور کوشش کی آخر کار پاکستان کا جھنڈا

بھی نمائش گاہ کے صدر دروازے پر دیگر ممالک کے جھنڈوں کے ساتھ لہرانے لگا۔

پی وی اوبنگ نے افتتاحی تقریر میں نمائش میں حصہ لینے والے ممالک کا شکریہ ادا کیا مگر پاکستان کو یہاں بھی نظر انداز کر دیا گیا اور اس کا نام نہ لیا گیا۔ مجھے اس پر شدید رنج ہوا اور میں ٹریڈ سیکرٹری کو اس طرف توجہ دلائے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ جب پی وی اوبنگ تقریر کرنے کے بعد سٹیج سے اتر رہے تھے تو سیکرٹری نے آگے بڑھ کر میرے اعتراض سے انہیں آگاہ کیا وہ فوراً پلٹ کر مائیک پر آئے۔ اور انہوں نے معذرت کرتے ہوئے پاکستان کی شمولیت کا بھی ذکر کیا۔ اگلے روز اخبارات میں اور ٹی وی پر نمائش کی جو کوریج دی گئی اس میں پاکستان کا بطور خاص ذکر کیا گیا کہ پاکستان اس نمائش میں نمایاں ہے۔ یوں ایک پاکستانی تاجر کی نجی شمولیت کو ہم نے سرکاری شمولیت میں تبدیل کر دیا۔

پی۔ وی اوبنگ نمائش کا افتتاح کرنے کے بعد سٹالوں پر گئے پاکستانی سٹال پر میں نے خود ان کا استقبال کیا اور سٹال کے مالک مسٹر شکیل احمد شیخ نے پیتل کے دو بڑے بڑے منقش گلدان پیش کئے۔ اس موقع پر تصویریں اتریں اگلے روز ذرائع ابلاغ میں پاکستانی سٹال کی بے حد تعریف کی گئی اور اسے اخبارات میں نمایاں طور پر جگہ دی گئی۔

دوسرے دن میں نے تحفے گفٹ پیک کروا کر پی وی اوبنگ کے گھر بھجوا دیئے میں دوپہر کا کھانا کھانے گھر آیا تو ان کا فون آیا۔ انہوں نے ذاتی طور پر میرا بے حد شکریہ ادا کیا شکریئے کے سلسلے میں ان کا ذاتی دستخطوں کے ساتھ ایک خط بھی ملا جس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ اگر پاکستان اپنی مصنوعات کے لئے عکرہ میں کوئی شو روم کھولنا چاہے تو گھانا کی حکومت اس کا خیر مقدم کرے گی۔

اس سلسلے کی تمام رپورٹ ہمارے دفتر خارجہ کے پاس موجود ہے اور میں نے اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ وی پی اوبنگ کی اس پیشکش پر سنجیدگی سے غور کرنا

چاہے میری اس سفارش میں جہاں خیر سگالی کا جذبہ کار فرما تھا وہاں قومی مفاد کے نقطہ نظر سے یہ بات بھی نگاہوں کے سامنے تھی کہ اس سے پاکستان کی مصنوعات کا لوگوں سے تعارف ہو گا تو وہاں ان کی مانگ بڑھے گی۔ خود شکیل احمد شیخ نے بھی اس تجربے کو کامیاب قرار دیا تھا اور ان کے سٹال کی تمام چیزیں منہ مانگے داموں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ وہ میرے قیام کے دوران ۱۹۸۸ء میں بھی وہاں آئے اور ۱۹۸۹ء میں بھی اور ہر مرتبہ مطمئن ہو کر واپس گئے۔

اسی ابتدائی حوصلہ افزائی کے باعث میں نے فروری اور مارچ ۱۹۸۸ء میں ہونے والی نمائش کے لئے حکومت پاکستان سے رجوع کیا۔ سیکنڈ سیکرٹری سلطان احمد نے بڑی ہمت کی اور ہم نے پاکستانی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو گھانا کی نمائش میں شرکت پر آمادہ کرنے کے لئے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا اور وہ تمام طریقے اختیار کئے جو مناسب اور ضروری تھے۔

آخر کار ہماری محنت ٹھکانے لگی اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ایکسپورٹ پروموشن بیورو نے لاہور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کو گھانا میں ۱۹۸۸ء میں ہونے والی نمائش میں شرکت کے لئے ہدایات جاری کر دیں۔ ہمارے لئے یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔

مشن کی طرف سے ہفتہ وار سرکلر لیٹر جاری ہوتے تھے جن میں پاکستانیوں کو نمائش میں شمولیت کے لئے ترغیب دی جاتی تھی اور ساتھ ہی وہ تمام معلومات بھی مہیا کی جاتی تھیں جو موقع و محل کے مطابق درکار تھیں چنانچہ لاہور چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے ساتھ بہت سے لوگوں نے رابطہ قائم کیا اور نمائش میں شمولیت پر آمادگی کا اظہار کیا۔ ہماری جانب سے یہ تاکید کی گئی تھی کہ آنے والوں کی بابت تفصیل کے ساتھ مطلع کیا جائے۔ چنانچہ لاہور چیمبرز آف نے تعاون کیا اور اس طرح سے پاکستان کی جانب سے لاہور چیمبرز کے زیر انتظام تیرہ برآمد کنندگان نے اس نمائش میں حصہ لیا۔ اور یہ تیرہ سٹال ایک ہی قطار میں لگائے گئے جس سے نمائش کے

اس حصے کا نام پاکستان پویلین PAKISTAN PAVILLION قرار دیا گیا۔

نمائش میں خوب رونق رہی۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ فروری مارچ ۱۹۸۸ء میں ہونے والی نمائش میں رونق صرف اور صرف پاکستان پویلین کی وجہ سے تھی۔ اس رونق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے نمائش کنندگان نے پاکستان مصنوعات کی فروخت بھی شروع کر دی۔ حالانکہ نمائش میں شمولیت کی یہ شرط بھی تھی کہ نمائشی سامان فروخت نہیں کیا جائے گا۔

دراصل یہ سب کچھ ایک غلط فہمی کے باعث عمل میں آیا۔ پچھلے برس جب شکیل احمد شیخ نے نمائش میں اکیلے شمولیت کی تھی تو اس وقت نمائش میں خرید و فروخت کی اجازت تھی نمائش کے اختتام پر کسٹم ڈیوٹی والوں نے حکومت سے یہ شکایت کی کہ فروخت شدہ مال پر کسٹم ڈیوٹی ادا نہیں کی گئی۔ اسی طرح سے سیلز ٹیکس والوں نے بھی شکایت کی یہ تمام ڈیوٹی فروختگی کی قیمت پر ساٹھ فیصد تھی چنانچہ انہی شکایات کے پیش نظر ۱۹۸۸ء کی نمائش میں سامان کے فروخت کئے جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ پاکستانی سٹال والوں کا موقف یہ تھا کہ ہم بھاری کرایہ ادا کر کے اپنی مصنوعات کی نمائش کر رہے ہیں۔ اگر ہمارا مال فروخت نہ ہوا تو اتنا ہی کرایہ پھر ادا کر کے سامان کو پاکستان واپس لے جانا پڑے گا۔ جس سے ہم دہرے زیربار ہو جائیں گے اور سخت نقصان اٹھائیں گے۔

میں نے پاکستانی سٹال والوں سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس پابندی کے بارے میں نمائش کے منتظمین سے بات چیت کروں گا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیسے بات کی جائے کہ اتنے میں نمائش کا افتتاح ہو گیا۔ اور پاکستانی نمائش کنندگان نے اپنے سٹال پر سامان فروخت کرنا شروع کر دیا۔

اتفاق سے نمائش کے سامان کی فروختگی سے متعلق میں نے پی وی اوبنگ سے سرسری سا ذکر کیا تھا تو انہوں نے اس کا جواب حوصلہ افزا دیا تھا ان کے خیال میں پاکستان کا گھانا کی نمائش میں سنجیدگی سے حصہ لینا بہتر تعلقات باہمی کی طرف ایک

مثبت قدم تھا مجھے قوی امید تھی کہ پاکستانی تاجروں کے نمائشی مال کی فروختگی پر کسی کو اعتراض نہ ہو گا مگر میرے خیال کے برعکس ہوا وہی جس کا پہلے سے خدشہ تھا۔

کسٹم اور سیلز ٹیکس والوں نے جب مجھ سے رابطہ قائم کیا تو میں نے انہیں بتایا کہ ڈیوٹی کی وصولی کے بارے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں اس کا مناسب حل تلاش کر لوں گا۔ اس نمائش کا افتتاح گھانا کی آرمڈ فورسز کے کمانڈر انچیف نے کیا تھا۔ وہ جب پاکستانی سٹال پر آئے تو جملہ پاکستانیوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا اور ہر پاکستانی سٹال پر انہیں تحفے پیش کیے گئے ان کے ہمراہ گھانا کے ڈیفنس سیکرٹری وزیر دفاع اور ریسو موموح بھی تھے۔ انہیں بھی تحفے دیئے گئے۔

عکرہ میں یہ نمائش دس روز جاری رہی پاکستانی تاجروں نے اپنے ملک و قوم کا نام روشن کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ گھانا کی حکومت کا شاید ہی کوئی اہم عہدیدار ہو گا جو ہمارے پاکستانی تحفوں سے محروم ہوا ہو ورنہ تمام مناصب کے لوگوں نے گراں قدر تحفے پائے۔

سعید اینڈ کمپنی سیالکوٹ سے کھیلوں کا سامان لیکر آئے تھے ایچ کریم بخش اینڈ سنز لاہور سے ریڈی میڈ شرٹس اور فیبرکس لائے تھے ٹویوناسک لاہور سے شیشے کا سامان لے کر آئے تھے پیرس سے بھی ایک پاکستانی فرم نے اس نمائش میں حصہ لیا تھا وہ لکڑی کا نہایت خوبصورت منقش فرنیچر لائے۔ کارونگ کے کام والا فرنیچر بھی لائے تھے۔ اونیکس کا سامان بھی نمائش میں شامل تھا۔ پاک پنجاب کارپٹس لاہور سے بیش قیمت ہاتھ کے بنے ہوئے قالین لائے تھے۔ غرضیکہ پاکستان کی ہر نوع کی شے نمائش میں موجود تھی چوڑیاں' دوپٹے' کاٹن' فیبرکس' فراک وغیرہ وغیرہ۔

اب تمام عکرہ میں پاکستان پاکستان کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا۔ سب لوگ پاکستان اور اس کی مصنوعات کی تعریفیں کر رہے تھے۔ جب نمائش ختم ہوئی تو عکرہ کے ہر گھر میں پاکستانی مصنوعات میں سے کوئی نہ کوئی شے ضرور موجود تھی۔

اختتام نمائش کے دوسرے دن جب پاکستانی تاجروں سے میری ملاقات ہوئی تو وہ سب کے سب نہایت خوش و خرم اور مطمئن دکھائی دے رہے تھے میں نے انہیں اپنے یہاں کھانے پر بلایا حکومت گھانا کے سیکرٹری صاحبان بھی آئے۔ سنٹرل بینک آف گھانا کے صدر اور گھانا چیمبرز آف کامرس کے صدر صاحبان بھی تشریف لائے پی وی اوبنگ بھی اس موقع پر آئے دراصل یہ دعوت انہی کے کہنے پر منظم کی گئی تھی۔ اور انہی نے ان تمام سرکاری عہدیداروں کی لسٹ بھجوائی تھی۔ جنہیں مدعو کرنا مقصود تھا دعوت میں تقاریر بھی ہوئیں۔ اور جناب اوبنگ نے پاکستان کی بڑی تعریف کی پاکستان کی مصنوعات کو خوب سراہا۔ میں نے وہیں پر پہلے سے تیار شدہ ایک تحریری درخواست پیش کی کہ ٹیکس کی ادائیگی میں رعائیت کر دی جائے انہوں نے خیرسگالی کے جذبے سے تمام ٹیکس معاف کرنے کا اعلان کر دیا۔ دراصل یہ کاروائی بھی انہی کے اشارے پر کی گئی تھی۔ کیونکہ میں نے ذاتی طور پر پاکستانی تاجروں کی ڈیوٹی کے بارے میں پریشانی کا ذکر کیا تھا۔ جس پر انہوں نے تعاون کا وعدہ کیا تھا۔

اگلے روز پاکستان کی جانب سے ایک وفد تشکیل دیا گیا جس میں ایچ کریم بخش کے خواجہ بشیر بخش صدر اور ٹویوناسک تجارتی ادارے کے محمود احمد صاحب وفد کے رکن تھے۔ پی وی اوبنگ نے ان حضرات کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور پاکستان اور گھانا کے درمیان تجارتی روابط کو فروغ دینے کے علاوہ باہمی دلچسپی کے دیگر امور پر بھی گفتگو ہوئی اس گفتگو میں کیپٹن کوجو چکاٹا ممبر پرووزنل ڈیفنس کونسل برائے نیشنل سیکورٹی اور امور خارجہ

CAPTAIN KOJO TJAKATA MEMBER PRONISIONL DEFENCE COUNCIL FOR NATIONAL SECURITY AND FOREIGN AFFAIRS نے بھی حصہ لیا۔ یہ دونوں اصحاب گھانا کی حکمران کونسل کے بہت ہی سینئر اور اہم ترین ارکان ہیں۔ دونوں سربراہ مملکت جے جے رالنگ کے ذاتی دوست بھی ہیں اور اپنے اپنے کام میں ماہر اور تجربہ کار بھی دونوں پاکستان کی دوستی کا دم

بھرتے ہیں لیکن یہ یکطرفہ محبت ہے ہمارے دفتر خارجہ میں گھانا اور اس کے پالیسی سازوں کا کوئی کھاتہ نہیں ہے۔

اس نمائش کے ختم ہوتے ہی ہم نے ۱۹۸۹ء میں منعقد ہونے والی نمائش میں شمولیت کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ جب اپنے مقررہ وقت پر نمائش لگی تو اس میں بھرپور حصہ لیا گیا گھانا حکومت نے بھی خوب تعاون کیا اور ہر طریقے سے دوسروں پر پاکستانیوں کو ترجیح دی اس علاقے میں پاکستانی اصحاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا اور پاکستانی مصنوعات کو پسند کیا گیا اور یہ کہ گھانا کی کرنسی کو پاکستانی لانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ فارن ایکسچینج بیورو کے ذریعے قانون کے مطابق زرمبادلہ دستیاب ہوا۔

پاکستانی قالین۔ لکڑی کا سامان۔ پیتل کے منقش VASE اور ایچ کریم بخش کی تیار کردہ قمیصیں چکن اور ڈوریا وغیرہ کی اور دوسری مصنوعات کی بہت پذیرائی ہوئی غرض ہر گھر میں پاکستانی مصنوعات پسند کی گئیں۔

بلغاریہ' چیکو سلاویہ' ہنگری اور پولینڈ کے سفارت خانوں کے اہکاروں اور سفیروں نے بھی پاکستانی مصنوعات کی خوب خریداری کی۔ سوویت یونین کے سفارت خانے کا عملہ ایک ٹیم کے طور پر آیا اور اسے پاکستانی کپڑا بہت پسند آیا۔ قیمت کے بارے میں ہمارے تاجر حضرات گڑبڑ کرتے تھے جس پر مجھے بار بار مداخلت کرنی پڑی۔ ورنہ ہمارے پاکستانی تاجر حضرات کا طرز عمل بحیثیت مجموعی ہر لحاظ سے بہت عمدہ رہا۔

ایچ کریم بخش کے خواجہ بشیر بخش نے مشن کے ساتھ بے حد تعاون کیا اور میری فرمائش پر گھانا کے معززین کو اپنی مصنوعات منجملہ تیار شدہ قمیضیں ارزاں قیمتوں پر یا تحفے کے طور پر دیں۔ یہاں تک کہ میرے ہاں جب نمائش کے بعد ۲۳ مارچ کو دعوت کا اہتمام ہوا تو اس وقت تقریباً ہر فرد نے پاکستان کی بنی ہوئی قمیض پہن رکھی تھی۔

کینیڈا کی ہائی کمشنر' بلغاریہ اور لبنان کے سفیر صاحبان کی بیگمات کو پاکستان کا کپڑا سکرٹ اور فراک بہت پسند آئے یوگو سلاویہ کے سفیر کی بیگم کو شیشے کا سامان' لکڑی کی

مصنوعات اور چوڑیاں بہت دلکش محسوس ہوئیں۔ سعودی عرب کے چارج ڈی افیرز کی بیگم نے اپنی سہیلیوں کے ہمراہ پاکستانی قالین خرید خرید کر پاک پنجاب کارپٹ والوں کے ہوش بھلا دیئے۔ ابتداء میں انڈین کمیونٹی والوں نے ہمارے پاکستانی سٹال نظر انداز کئے رکھے۔ لیکن بعد میں تو کچھ ایسی بھیڑ چال چلی کہ خریداروں نے پاکستانی مصنوعات خرید خرید کر تمام سٹال خالی کر دیئے۔

ایک ساؤتھ انڈین خاتون نے مجھے بتایا کہ اس نے ایک ہی دن میں اپنے شوہر اور بچوں کیلئے ۳۷ قمیضیں خریدی ہیں۔ ایک سوشلسٹ ملک کے ڈپلومیٹ بذریعہ جہاز محض پاکستان کی پیتل سے منقش میزوں کا سیٹ خریدنے نائجیریا سے آئے اور ان کے علاوہ پاکستان کی ہینڈی کرافٹ اور گھریلو دستکاری کی اشیاء خرید کر اسی روز واپس چلے گئے گھانا میں کسی بھی ملک کے قومی دن کی تقریبات میں حکومت کی نمائندگی کرنے کے لئے کسی مقتدر فرد یا سیکرٹری کو نامزد کیا جاتا ہے۔ اس نمائندے کے منصب سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کے ملک کی اور میزبان ملک کے سفیر کی گھانا حکومت کی نظر میں کیا وقعت اور کیا مقام ہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۸ء کے قومی دن کی تقریب کے لئے گھانا کی حکومت نے جنرل منساوڈ (MENSA WOOD) پی این ڈی سی ممبر برائے دفاع' بن عبداللہ ABDULLA BEN سیکرٹری انفارمیشن (وزیر اطلاعات) اور وزارت خارجہ کے ایک سیکرٹری جناب ولماٹ MR. WILMOT کو نامزد کیا تھا۔ لیکن حکومت کے دیگر ارکان بھی جوق در جوق آئے اور تقریب میں شریک ہوئے۔ ان لوگوں میں مسلح افواج کے کمانڈر انچیف' ایئرفورس کے چیف' چیمبرز آف کامرس کے صدر سنٹرل بینک آف گھانا کے صدر ڈاکٹر محمد بن چمباس پی۔ این ڈی سی۔ ڈپٹی سیکرٹری برائے امور خارجہ۔ پی۔ این۔ ڈی۔ سی سیکرٹری برائے تعلیم مس جائس پی این ڈی سی ڈپٹی سیکرٹری برائے تعلیم و ثقافت گھانا ٹی وی کے سربراہ اور پی۔ این ڈی سی ممبر برائے دفاع ادریس مومو بھی شامل تھے۔ اس موقع پر تقریباً آٹھ سو مہمانان گرامی تشریف لائے تھے۔ سوائے

ہمارے کونسلر کے تمام عملے نے اس تقریب کو کامیاب کرانے کے لئے بڑی محنت کی اور یہ تقریب کامیاب ہوئی۔

اس تقریب کی کامیابی میں پاکستان کی جانب سے چند روز پہلے ہونے والی نمائش میں شریک ہونے کا اثر بھی تھا۔ اس نمائش میں پاکستانی تاجروں نے گھانا کے عوام کے ساتھ جس گرمجوشی حسن اخلاق اور خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا۔ وہ پاکستان اور گھانا کے درمیان باہمی خوشگوار تعلقات قائم ہونے کے لئے نشان راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میرے دور سفارت میں پاکستان نے فروری' مارچ ۱۹۸۹ء میں عکرہ میں ہونے والی بین الاقوامی نمائش میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ اس مرتبہ ۱۴ سے زائد تاجروں نے اپنی ملکی مصنوعات پیش کر کے پاکستان کی نمائندگی کی۔ حقیقت میں یہ بھی مشن ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ جولائی ۱۹۸۶ء سے جولائی ۱۹۸۹ء تک پاکستان نے یکے بعد دیگرے تین بین الاقوامی نمائشوں میں حصہ لیا۔ ایک بار تو شکیل برادرز کے پروپرائٹر شکیل صاحب کراچی سے گھانا اپنے طور پر تنہا آئے تھے۔ دوسری بار جب لاہور چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری نے انتظام کیا تو سرکاری طور پر پاکستانی تاجران عکرہ تشریف لائے اور تیسری مرتبہ محض مشن کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے پاکستانی تاجران عکرہ تشریف لائے وگرنہ پچھلا اٹھائیس برس کا ریکارڈ تو منفی ثابت ہوا تھا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ چودہ برس سے مجوزہ تجارتی معاہدہ مابین گھانا اور پاکستان ہماری وزارت قانون' وزارت تجارت اور مختلف مستقل و غیر مستقل وزراء کے درمیان لٹکا رہا ہے۔ مقام تاسف ہے کہ ایک معصوم سا معاہدہ اب تک ہماری حکومتوں سے پذیرائی حاصل نہیں کر سکا۔ لیکن کام تو اس معاہدے کے نہ ہونے کے باوجود چل رہا ہے۔

کماسی

"آدم اور حوا سیاہ فام تھے؟"

عکرہ سے ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر کماسی کا خوبصورت شہر واقع ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے جہاں اسانتی قبیلے کا سربراہ ASANTE HENE اسانتی ہینی رہائش پذیر ہے۔ پورے ریجن میں اشانتی قبیلے کی اکثریت ہے۔ دنیا بھر میں اس ریجن کی شہرت سونے کی کانیں ہیں۔ ان سونے کی کانوں کی وجہ سے ہی گھانا کو گولڈ کوسٹ GOLD COAST کہا جاتا تھا۔ ۱۹۵۷ء تک یہ ملک اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ ڈاکٹر کوامے نکرومہ کی زیر قیادت جب آزادی کی جدوجہد کامیاب ہوئی۔ تو اس کا نام گھانا رکھ دیا گیا۔ اشانتی ریجن میں کماسی ایک بہت بڑی منڈی ہے اور گھانا کی معیشت میں مقامی طور پر اس کی بہت اہمیت ہے ایک زمانے میں اسے باغوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک بے حد خوبصورت گولف کورس ہے جو مقامی کلب کے زیر انصرام خشک سالی کے باوجود سر سبز ہے۔ انڈسٹریل ایریا بھی ہے۔ ایئرپورٹ بھی ہے۔ بہت بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ تمام تھوک و پرچون تجارت بھارت نژاد ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ وہی درآمد پر قابض ہیں۔ وہی قیمتوں کا تعین کرتے ہیں۔ شہر میں قابل ذکر دو ہوٹل ہیں۔ جو تمام طرح کی سہولتیں مہیا کرتے ہیں۔ کھانے کا معیار بھی اچھا ہے۔ کماسی شہر میں صرف ایک پاکستانی شہری نے پاکستان کا جھنڈا بلند کر رکھا ہے۔ یہ لاہور سے جعفری صاحب ہیں۔ بے حد خوش خلق، متواضع اور شدت سے پاکستانی۔ ایک لبنانی ٹینری میں چیف ٹیکنالوجسٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔ جرمنی سے تربیت یافتہ ہیں

اور عرصہ زائد از بیس سال سے کماسی میں ہی مقیم ہیں۔ عکرہ سے کماسی پہنچنے والوں میں سے کوئی ہی ہو گا جس نے جعفری صاحب کے دستر خوان کا مزا نہ چکھا ہو گا۔ پاکستان بجا طور پر اس فرزند زمین پر فخر کر سکتا ہے۔ جس نے محنت' دیانت داری اور خوش اخلاقی سے کماسی کی سوسائٹی میں اپنا مقام پیدا کر رکھا ہے۔ پورے گھانا میں صرف یہی ایک ٹینری ہے۔ جہاں جعفری صاحب کام کر رہے ہیں۔ مدت ہوئی گھانا کی حکومت نے ایک ٹینری لگانے کا سوچا تھا۔ جگہ مختص ہو گئی۔ مشینری در آمد کر لی گئی لیکن پانچ چھ سال کی مدت میں بھی یہ ٹینری نہ لگ سکی۔ کماسی میں گودام میں پڑے پڑے مشینری کے پارٹس چوری ہو گئے اور تمام مشینری بیکار ہو کر رہ گئی۔ اب یہی مشینری سپیئر پارٹس کے طور پر جعفری صاحب کی ٹینری کے کام آ رہی ہے۔ ویسے بھی ٹینری کے لئے خام مال کی بے حد کمی ہے اور جس کم تعداد میں کھالیں میسر ہوتی ہیں وہ دو ٹینریوں کے لئے ناکافی ہوتیں۔ اگر حکومت کی ٹینری لگ جاتی تو لازمی طور پر لبنانیوں کی ٹینری بند ہو جاتی۔ در آمدہ مشینری کے پرزوں کا چوری ہو جانا لبنانیوں کے لئے نعمت ثابت ہوا اور ابھی تک انہی کی مناپلی ہے۔

کماسی میں ایک فوجی عجائب گھر بھی ہے۔ اس میں وہ بندوقیں' ہتھیار تلواریں اور توپیں رکھی گئی ہیں جو افریقی فوجیوں نے کسی وقت استعمال کی ہوں گی۔ دوسری جنگ عظیم میں حصہ لینے والے افریقیوں کی تصویریں بھی آویزاں ہیں۔ وہ تمغے بھی محفوظ رکھے ہیں۔ جو افریقی فوجیوں نے حاصل کئے۔ اور ان انگریز جرنیلوں کی تصویریں بھی ہیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً افریقہ کے مغربی ساحل کے اس حصے پر حملہ کیا یا قبضہ کیا اس عجائب گھر میں وہ نیزے' تیر کمان' خنجر اور تلواریں بھی محفوظ ہیں جو اشانتی قبیلے نے انگریزوں کے خلاف اپنا دفاع کرتے ہوئے استعمال کئے تھے۔ ایک اور قابل دید جگہ کوامے نکرومہ کے نام سے موسوم مرکز بھی ہے۔ یہ گھانا بھر میں سب سے بڑا کلچرل سنٹر ہے۔ اس میں مقامی افریقی کلچر کی نمائندگی کی گئی ہے۔ ایک سٹرانگ روم میں شوکیس میں بوسیدہ سی ایک گٹھڑی رکھی ہے۔ شوکیس بہت مضبوط ہے اور سامنے

کے حصے میں موٹا شیشہ لگا ہوا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس گٹھڑی کو اس شوکیس میں رکھنے کے بعد باہر نہیں نکالا گیا روائیت ہے کہ موجودہ اسانتی ھینی کے پردادا نے آخری مرتبہ اس گٹھڑی کو ہاتھ لگایا تھا جب اس نے اس کو شوکیس میں رکھا تھا۔ یہ کم از کم دو سو سال پرانی بات ہے لیکن شوکیس کے شیشے کی عمر اتنی نہیں ہے۔ کلچرل سنٹر کی ڈپٹی ڈائریکٹر نے مجھے بتایا کہ قدیم روایات کے مطابق اس گٹھڑی میں محفوظ ملفوظات کا تعلق دنیا میں انسان کی ابتدائی پیدائش سے ہے اور رہتی دنیا تک تمام اہم واقعات کے بارے میں تذکرہ ہے۔ گٹھڑی کپڑے کی نہیں ہے بلکہ کسی درخت کی چھال ہے اور اس میں لپٹے ہوئے ملفوظات بھی کسی درخت کی چھال پر تحریر ہیں۔ باہر سے دیکھنے پر رسم الخط کا کوئی پتہ نہیں چلتا ہے تمام تحریریں اکان AKAN زبان میں ہیں جو اس خطے کی قدیم ترین زبان ہے۔ ایک ملاقات میں اسانتی ھینی نے خود مجھے بتایا کہ یہ گٹھڑی کبھی کھول کر نہیں دیکھی گئی۔ جب یہ کھلے گی قیامت آ جائے گی۔ نامعلوم اس روائیت میں کتنی سچائی ہے۔ لیکن ایک بات عیاں ہے کہ افریقی قبائل بھی قیامت پر یقین رکھتے ہیں قیامت کے بارے میں ایک اور روایت بھی مشہور ہے۔ کماسی میں جہاں آجکل کمبائنڈ ملٹری ہسپتال ہے ایک پرانا درخت ہے اس کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ بتائی جاتی ہے اس کے پہلو میں ایک پختہ چبوترہ ہے اس چبوترے کے درمیان ایک زنگ آلود لوہے کی تلوار کا دستہ والا حصہ نظر آتا ہے یہ حصہ چھ فٹ کے قریب ہے کہا جاتا ہے کہ یہ تلوار صدیوں سے اس جگہ دفن ہے اور قیامت کے نزدیک ہی کوئی اللہ کا بندہ دنیا بھر میں نیکی کی حکومت پھیلانے کے لئے اس تلوار کو نکالے گا اور بدی کے خلاف جنگ کرے گا جس میں وہ کامیاب و کامران ہو گا مختلف قبیلوں کے لوگ اس روایت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ انگریزی راج کے دوران اس روایت کا طلسم توڑنے کے لئے اس تلوار کو زمین سے نکالنے کی کوشش کی گئی لیکن کافی گہری کھدائی کرنے کے باوجود تلوار کا پھل نہ نکل سکا۔ کلچرل سنٹر کی ڈپٹی ڈائریکٹر مس ریکا نے بتایا کہ آخر میں دو سو فٹ

تک کھدائی کر کے انگریز انجینئر نے سرہلاتے ہوئے یہ پراجیکٹ بند کر دیا تھا۔ تلوار کے بارے میں اس روایت پر سبھی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ قبائلی اشانتی بھی اور مسلمان بھی۔ فرق یہ ہے کہ قبائلی لوگوں کے مطابق بدی کے خلاف جنگ کرنے والا شخص اشانتی قبیلے میں سے ہو گا اور وہ دنیا بھر سے بدی کا خاتمہ کر دے گا جبکہ مسلمان یقین رکھتے ہیں کہ ایسا شخص مسلمان ہو گا اور عربی میں گفتگو کرتا ہو گا ان کا اشارہ شاید امام مہدی علیہ اسلام کی طرف ہے۔ اس مقابلے میں مقامی عیسائی باشندے بھی کم نہیں ہیں۔ وہ یہ تو نہیں کہتے کہ افریقہ میں کوئی ایسا شخص نازل ہو گا جو بدی کو ختم کر دے گا۔ وہ اس تلوار کی حد تک یقین رکھتے ہیں۔ کہ یہ تلوار بالاخر وہی شخص زمین سے نکالنے میں کامیاب ہو گا جو تمام افریقہ پر حکومت کرے گا۔ عیسائیت کے بارے میں ان کا ایمان ہے کہ تمام کا تمام افریقہ بالاخر حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آئے گا اور خداوند کی سلطنت میں شامل ہو جائے گا۔

کماسی میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے بہت کام ہو رہا ہے۔ افریقی باشندوں کی رگ رگ میں موسیقی بھری ہوئی ہے۔ عیسائی مبلغ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے موسیقی کی آڑ لیتے ہیں اور کماسی میں موسیقی کی محفلیں کلچر کے نام پر برپا کرتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں کماسی دورے پر گیا ہوا تھا۔ شام کو ایک محفل موسیقی میں مجھے مدعو کیا گیا۔ یہ سراسر ایک مقامی کلچرل شو تھا لیکن عیسائی منتظمین نے اس میں قبائلی موسیقی کے ہمراہ مغربی موسیقی کی چاشنی لگا دی اور شو کے اس حصے کو کرسچن موسیقی کا نام دیا۔ اس صنف موسیقی کا تعارف کراتے ہوئے ایک بینڈ لیڈر نے اعلان کیا "گھانا ایک عیسائی ملک ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ کرسچن میوزک یہاں فروغ پائے۔" اس تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر شامل تھا۔ اپنی تقریر میں میں نے بینڈ لیڈر کے الفاظ کا ریفرنس دے کر کہا کہ

"گھانا ایک عیسائی ملک نہیں ہے۔ دنیا بھر میں کوئی بھی ملک عیسائی، مسلمان، یہودی یا لادینی نہیں ہوتا۔"

یہاں میں چند لمحے کے لئے رکا۔

میرے الفاظ کے ساتھ ہی تمام ہال میں سناٹا چھا گیا میں نے بات آگے بڑھائی اور کہا۔

"یہ دنیا تو اللہ تعالیٰ نے تخلیق دی ہے۔ وہی اس کا خالق ہے وہی انسانوں جانوروں پرندوں درختوں دریاؤں آسمانوں سمندروں کا مالک ہے۔ وہ خالق کل ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی تخلیق کیا ہے وہی اس کا مالک ہے۔ چنانچہ جب کروڑوں سال پہلے اس نے یہ دنیا بنائی تو اسے نہ مسلمان بنایا نہ عیسائی اور نہ ہی یہودی یہ دنیا کسی مخصوص مکتبہ فکر یا نظریئے کے لئے تخلیق نہ دی گئی تھی۔"

میں نے مزید کہا کہ۔

"یہ دنیا انسانوں کے لئے بلاتخصیص مذہب و ملت بنائی گئی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق میں سے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ مذہبی قبائلی سیاسی اور نظریاتی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر دنیا اور اس کے وسائل کو انسانی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کرے۔"

آخر میں مَیں نے رحمت العالمین محمدؐ رسول اللہ کے خطبہ عذیر کا ذکر کرتے ہوئے سامعین کو بتایا کہ "اسلام کے مطابق گورے کو کالے پر عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے تمام انسان برابر ہیں آقا اور غلام میں کوئی فرق نہیں ہے اگر ایک انسان کو دوسرے پر فوقیت یا برتری حاصل ہے تو وہ نیکی اور تقویٰ پر مبنی ہے۔"

میں نے یہ بھی سامعین کو بتایا کہ ایک مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ نہ صرف رسول خداؐ پر ایمان رکھے بلکہ ان سے پہلے گذرنے والے پیغمبروں پر بھی ایمان رکھے۔ مسلمان کہلانے کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام پر بھی ایمان لازم ہے۔

بات سے بات آگے بڑھتی گئی اور میں نے تقریباً پون گھنٹہ تقریر کی۔

ابتدائی سناٹے کے بعد تقریر کے دوران وقفے وقفے سے تالیاں بجتی رہیں تقریب کے اختتام پر میری تقریر پر اطمینان کا اظہار بھی کیا گیا بعد میں میں

نے انعامات تقسیم کئے اور یوں یہ تقریب بخیر و خوبی ختم ہوئی۔

اس مخلوط موسیقی کی لے پر بینڈ نے انگریزی اور مقامی زبانوں اور دھنوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں نظمیں سنائیں۔ ساتھ ساتھ مقامی قبائلی ناچ بھی ہوتا رہا۔ میں صرف اتفاقاً اس شو کے وقت کماسی میں موجود تھا۔ عکرہ سے بالخصوص اس شو کے لئے نہ گیا تھا مجھے منتظمین نے وہیں پاکر مدعو کیا تھا۔ لیکن شو کے آخر میں مجھے انہوں نے اختتامی کلمات کے لئے بلایا میرے ذہن میں ابھی تک وہی الفاظ گونج رہے تھے کہ گھانا عیسائی ملک ہے۔ مجھے اب جو موقع ملا تو میں نے اپنا فرض سمجھا کہ ان الفاظ سے جو تاثر پیدا ہوا ہے اس کی نفی کروں۔

کماسی میں سعودی عرب کی حکومت کی امداد سے ایک بہت بڑے تعلیمی ادارے کی داغ بیل پڑ رہی ہے۔ گھانا حکومت کے محکمہ تعلیم کے کے مطابق یہ ایک اسلامی یونیورسٹی بنے گی اور سعودی حکومت نے اس ادارے کے لئے بیش بہا رقم مختص کی ہوئی ہے۔ اس کے لئے ابتداء میں کماسی کے ایک امام نے کوشش کی تھی۔ منظوری بھی اسی امام کے نام میں آئی ۔ انہوں نے گھانا حکومت سے ایک قطعہ اراضی حاصل کیا اور سعودی فنڈ میں سے قیمت کی ادائیگی کی جلد ہی اس قطعہ اراضی کے ایک حصے میں اپنا گھر بنا لیا۔ خود اس میں رہائش پذیر ہو گئے۔ یہاں تک تو نظرانداز ہو گیا تھا۔ ہر برس سعودی عرب حکومت جو فنڈ بھیجتی وہ سعودی عرب سفارت خانے کے ذریعے ان امام صاحب کو چیک کی صورت میں ادا کر دیا جاتا وہ سمجھ بیٹھے کہ یہ پراجیکٹ ان کا ذاتی ہے اور وہی بلاشرکت غیرے اس کے مالک ہیں۔ سعودی ناظم الامور کے پاس اس بارے میں رپورٹ آئی تو اس نے مجھ سے مشورہ مانگا۔ ہم دونوں نے اس اسلامی یونیورسٹی کے بارے میں تمام خط و کتابت دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اسلامی یونیورسٹی کا کماسی میں قیام سعودی حکومت کی جانب سے گھانا کی حکومت کو خیر سگالی کا ایک تحفہ ہے اور اسلام کی تبلیغ کے عالمی پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ امام صاحب کی اس بارے میں تجویز مان لینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اس پورے

پراجیکٹ کے مالک ہیں اور ان کا ذاتی ملکیت کا دعویٰ نہ تو سعودی حکومت کو منظور ہے نہ ہی گھانا کی حکومت کو امام صاحب سے جب رجوع کیا تو انہوں نے بہت شور مچایا۔ وہ ریاض بھی گئے لیکن ان کی شنوائی نہ ہوئی۔ صورت حال مقامی طور پر یوں تھی کہ اراضی کا انتقال ان کے نام تھا۔ موقعہ پر قبضہ ان کا تھا۔ گھر انہوں نے سعودی فنڈ سے بنایا لیکن ان کے نام تھا اور خود قابض تھے فوری ایکشن کی ضرورت تھی اور سعودی ناظم الامور خود کوئی کاروائی کرنے سے معذور زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ وہ گھانا کے دفتر خارجہ سے سلسلہ جنبانی کرتے۔ احتمال یہ تھا کہ کاروائی میں دیر ہو جاتی اور سعودی حکومت آئندہ امدادی رقم نہ بھیجتی۔ ایسا ہونے سے مقامی طور پر برا اثر پڑتا تھا۔ چنانچہ سعودی ناظم الامور نے صدر مملکت سے ذاتی طور پر رجوع کیا۔ اگلے روز امام صاحب کشاں کشاں بغیر وارنٹ منگوائے گئے اور صدراتی حکم کے تحت جیل بھیج دیئے گئے۔ انہیں کوئی علم نہ ہوا کہ یہ کاروائی کیسے اور کیوں ہو رہی ہے جب انہیں بتایا گیا تو مصر ہوئے کہ سعودی ناظم الامور کا موقف درست نہیں ہے اور انہوں نے سعودی حکومت سے رقم اپنی ذاتی حیثیت میں حاصل کی تھی اور صرف سعودی حکومت ہی ان سے باز پرس کر سکتی تھی۔ ان کی درخواست تھی کہ انہیں حراست سے رہا کر دیا جائے۔ تاکہ وہ سعودی حکومت سے براہ راست گفتگو کر سکیں اور مناسب دستاویزات حاصل کر سکیں۔ لیکن صدر مملکت نے انکار کر دیا۔ ان کی نظر میں اس معاملے کے بگڑنے سے گھانا اور سعودی حکومت کے درمیان تعلقات کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا امام صاحب کی رہائی صرف اس صورت میں ممکن ہوئی جب انہوں نے اراضی کی ملکیت کے کاغذات سعودی ناظم الامور کو واپس کئے۔ مقامی ریکارڈ میں ان کی درخواست پر اراضی کا انتقال ان کے نام سے خارج کر دیا گیا اور انہوں نے مکان خالی کر دیا کچھ عرصہ کے بعد شوکاز نوٹس دے کر انہیں امامت کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اگر صدر مملکت مداخلت نہ کرتے تو امام صاحب نے تو ماننا ہی نہ تھا۔ اور زر کثیر جو حکومت سعودی عرب نے بھیجا تھا، ضائع ہو جاتا۔

آئندہ کے لئے امداد بھی بند ہو جاتی یہ اسلامی یونیورسٹی جب بن جائے گی تو مثالی ہو گی۔ یونیورسٹی کے اندر ہی اساتذہ کے لئے گھر بنائے جائیں گے۔ طلباء کے لئے ہاسٹل ہو گا۔ تعلیم مفت ہو گی اور دینی تعلیم کے لئے اساتذہ مقامی بھی ہوں گے اور درآمد بھی کئے جائیں گے۔

کماسی میں ایک چڑیا گھر بھی ہے۔ بے حد وسیع و عریض رقبے پر محیط اس چڑیا گھر میں دیکھنے کی چیز صرف اس کا بورڈ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوہے کی سلاخوں کے اندر چڑیا گھر ہے بڑے سے احاطے میں جنگلی جانوروں میں سے دو ہاتھی اور ایک شیر ہیں۔ مقام طوطے بھی مقید ہیں پانچ یا چھ بندر ہیں اور بس ہاتھی اور شیر تو اب اپنے بھائیوں کا سایہ لگتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ جنگلی جانور فاقہ کشی کے ہاتھوں بھول چکے ہیں کہ وہ کبھی ہاتھی اور شیر بھی تھے۔ بندر البتہ تندرست و توانا لگتے تھے۔ ایک جنگلے کے اندر شیشے کی چار دیواری بنا کر مختلف اقسام کے سانپ بھی رکھے ہوئے تھے یہ برآمد کئے جاتے ہیں اور چڑیا گھر کا خرچ بھی اس سیکشن کے سر پر چلتا ہے۔ اسی چڑیا گھر میں اژدھا بھی پکڑ کر لائے جاتے ہیں وہ بھی برآمد ہوتے ہیں اور کوئی قابل ذکر جانور اس چڑیا گھر میں نہیں رکھا جاتا کہا جاتا ہے کہ یہ چڑیا گھر کسی وقت بیحد پر رونق تھا۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے اسے صحیح صورت میں بحال رکھنا محال ہو چکا تھا۔ جانور جو مر گئے ان کی بجائے نئے جانور نہ لائے جا سکے۔ اس لئے اب یہ چڑیا گھر بے آباد سا ہے ویسے بھی گھانا میں جنگلی جانور تو جنگل سے بھی مفقود ہو چکے ہیں۔ ہاتھی بالکل ناپید ہیں۔ جنگلی پرندے البتہ بہت ہیں کیونکہ آتشی اسلحہ ہر قسم ممنوع ہے جال لگا کر پکڑنے کی قانونی ممانعت ہے ان ہر دو پابندیوں پر بڑی سختی سے عمل کیا جاتا ہے پرندوں کی برآمد نجی شعبے میں بالکل بند ہے۔ دراصل ۱۹۸۱ء کے بعد خشک سالی' قحط' جھاڑیوں کی آگ' بارشوں کی کمی نے گھانا کی معیشت کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ لوگ فاقوں سے مجبور ہو کر بلیاں تک کھا گئے تھے۔ کماسی کا حال باقی ملک سے مختلف نہ رہا تھا۔ یہاں کے بازار اجڑ گئے اندرون ملک یہ تجارت کی بہت بڑی منڈی تھی جو ویران

ہو کر رہ گئی۔ پھر ۱۹۸۶ء میں فصلیں بہتر ہونے لگیں۔ قدرت نے بھی ترس کھایا اور ایک دفعہ پھر بارشیں وقت پر ہونے لگیں۔ ابھی پرانی رونقیں واپس نہ آئی ہیں۔ انڈسٹریل ایریا نئے سرے سے آباد ہونا شروع ہوا ہے۔ ابھی کچھ وقت لگے گا۔ عام آدمی امید و یاس کا شکار رہتا ہے۔ لیکن عام طور پر قانع ہے۔ یہاں کے مسلمان اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتے ہیں قرآن مجید کی تعلیم عام ہے علم کے حصول کا شوق ہے دیگر مقامی لوگوں سے زیادہ خوشحال ہیں اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور قبائلی رسوم کو مکمل طور پر چھوڑ چکے ہیں صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ وہ بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ کماسی میں اسلامی یونیورسٹی کا قیام سعودی عرب کی جانب سے افریقی مسلمانوں کی تمنی اور تعلیمی ترقی کے لئے مثبت قدم ہے۔

کماسی میں تعلیمی حلقوں میں یہ بات زبان زد عوام ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا جنت سے نکالے جانے کے بعد افریقہ میں تشریف لائے تھے۔ وہ سیاہ فام تھے اور باغ بہشت کے بعد پوری کائنات میں یہ خطہ ہی جنت کے ساتھ مماثلت رکھتا تھا۔ جہاں قدرتی ماحول باغ بہشت جیسا ہی تھا ویسے تو افریقہ کے ہر ملک کا یہی دعوی ہے لیکن گھانا میں عام طور پر یہ دعوی نہیں کیا جاتا۔ یہ شرف صرف کماسی والوں کو ہی حاصل ہے کہ وہ اس بات پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں۔ کوامے نکرومہ کلچرل سنٹر کے ڈائریکٹر جنرل نے ایک ملاقات میں بتایا کہ ان کی تحقیق کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا نے زیادہ نہیں تو کچھ عرصہ اشانتی ریجن میں جس جگہ قیام کیا تھا وہ یہی کماسی ہے انہوں نے تمام زور بیان اس تھیوری پر صرف کیا اور کوشش کی کہ میں اسے تسلیم کرلوں۔ میں نے جب انہیں سری لنکا والوں کے اس دعوئ کی طرف توجہ دلائی کہ حضرت آدم وہاں تشریف لائے تھے تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس تھیوری سے واقف بھی ہیں اور سری لنکا کے اس دعوی کو سچ مانتے ہیں ان کے مطابق حضرت آدم علیہ اسلام نے طویل عمر پائی تھی تمام کائنات میں گھومتے رہے ہوں گے۔ اور جیسے وہ کماسی میں قیام فرما ہوئے ویسے ہی وہ سری لنکا بھی گئے ہوں گے۔ اگرچہ افریقی دعوی

کا کوئی ثبوت تو نہیں دیکھا لیکن کماسی والے اس دعوی پر مصر ہیں اور اس بات پر بھی کہ حضرت آدم علیہ اسلام اور بی بی حوا سیاہ فام تھے۔ وہ تو یہ بھی دعوی کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی سیاہ فام تھے۔ یہ بات تو باور کی جا سکتی ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام سفید فام نہ تھے لیکن ان کا سیاہ فام ہونا بھی محل نظر ہے۔ وہ فلسطینی تھے اور ان کی جلد کا رنگ بھی فلسطینیوں جیسا تھا۔ اس قسم کے دعوے تو خیر ہر ملک میں ملیں گے کماسی کی حد تک ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ گھانا میں اشانتی قبیلہ اپنے ماضی پر فخر کرتا ہے اور پھر اس ریجن میں سے کماسی کو اپنی قدیم تہذیب و تمدن پر بیحد فخر ہے۔ اسانتی ہینی کو وہ خدا کا مظہر جانتے ہیں اور وہ اس بات پر بھی فخر کرتے ہیں کہ وہ انہی کے قبیلے سے ہے۔ بیحد طاقتور ہے اور اس کا پایہ تخت کماسی ہے۔

اسانتی ہینی۔ ایک طاقتور سربراہ

عکرہ سے ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر مغربی ریجن میں ایک صنعتی شہر واقع ہے۔ کسی وقت اسے باغوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ اب اس کی کشادہ سڑکیں گولف کورس' یونیورسٹی' کارخانے اور بہت بڑے بازار اس کی عظمت گذشتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ اس ریجن کا نام اشانتی (ASHANTE) ہے اور جو شہر اس کا دارالحکومت کہلاتا ہے اس کا نام کماسی (KUMASI) ہے۔ یہاں ایرپورٹ بھی ہے اور کالج بھی ہیں اور ایک چڑیا گھر بھی ہے۔ یونیورسٹی اس کے علاوہ ہے۔ جوٹ بیگ بنانے کی ایک فیکٹری بھی ہے جو صرف پچیس فیصد تک چل رہی ہے۔ ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بھی اس فیکٹری سے کافی پیداوار حاصل نہیں ہوتی۔ ۱۹۸۷ء میں مناسب تعداد میں جوٹ بیگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کوکو کی فصل سٹور نہ کی جا سکی جو سیلی ہو گئی اور تقریباً سب کی سب ضائع ہو گئی۔ کپڑا بنانے کی ایک فیکٹری بھی ہے۔ اس مل میں افریقن پرنٹ بھی بنتا ہے لیکن اتنا کم کہ ہر سال کپڑا درآمد کرنا پڑتا ہے۔ دونوں فیکٹریوں کے اپنی گنجائش سے کم چلنے کا فائدہ بھارت اٹھا رہا ہے۔ کم پیداوار کو انڈین کمیونٹی کے تاجر پورا کرتے ہیں۔ جوٹ بیگس بنگلہ دیش سے درآمد کئے جا سکتے ہیں۔ افریقہ پرنٹ پاکستان میں بڑی مقدار میں بنتا ہے۔ ٹوگو ہمارے ہاں سے درآمد بھی کرتا ہے لیکن گھانا میں تجارت بھارتی قومیت کے لوگوں کے قبضے میں ہے اس لئے افریقہ پرنٹ بھی وہی درآمد کرتے ہیں اور ان کی تجارت میں پاکستان کی مصنوعات کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی صورتحال مغربی افریقہ کے دیگر ممالک میں ہے۔

اشانتی ریجن (ASHANTI REGION) کی شہرت کا باعث اشانتی قبیلہ ہے جو اپنی روایات اور جنگجو تاریخ کی وجہ سے عالمگیر شہرت رکھتا ہے۔ برطانوی استبداد اس ریجن میں سب سے آخر میں پہنچا۔ جب ساحلی علاقے پر برطانوی حملہ آور فوجوں نے قبضہ کر لیا تو برطانوی حکومت نے مفتوحہ علاقے کو گولڈ کوسٹ کا نام دے کر حملہ آور فوجوں کے کمانڈر کو گورنر جنرل مقرر کر دیا۔ اس فاتح کمانڈر گورنر جنرل نے کماسی کا دورہ کرنے کی ٹھانی۔ قبائلی روایات کے مطابق اس کی پذیرائی کی گئی۔ تحفے تحائف دیئے گئے۔ ملکہ وکٹوریہ کے لئے بھی اسے تحفے پیش کئے گئے تاکہ وہ ان تک پہنچا دے۔ خوشگوار ماحول میں اسے وہی عزت دی گئی جو کسی بھی مہمان حکمران کو قبائلی روایات کے تحت دی جاتی ہے۔ روانگی سے ایک روز پہلے برطانوی گورنر جنرل نے اشانتی قبیلے کے سربراہ سے ایک ایسا مطالبہ کر دیا جس نے امن و امان کی فضا کو خونخوار جنگ میں تبدیل کر دیا۔

اشانتی قبیلے کے لوگوں کو یقین ہے کہ وہ آسمانی مخلوق ہیں۔ اور ان کا جد اعلیٰ آسمان سے دیوتاؤں کے ہمراہ افریقہ میں آیا اور اس نے اپنے لئے اس خطہ ارضی کو پسند کیا جسے اب اشانتی کہا جاتا ہے۔ اس جد اعلیٰ کے ہمراہ خالص سونے کا بنا ہوا ایک ٹھوس اسٹول بھی آسمان سے اترا جسے اشانتی قبیلے کا بانی تخت کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ نشے میں بدمست فاتح گورنر جنرل نے اشانتی قبیلے کے سربراہ سے اس اسٹول کا مطالبہ کر دیا۔ اسے بتایا گیا کہ اس اسٹول پر صرف حکمران ہی بیٹھ سکتا ہے۔ گورنر جنرل نے بکمال رعونت جواب دیا کہ گولڈ کوسٹ کو برطانوی عملداری میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ اب ملکہ وکٹوریہ برطانوی سلطنت کا ایک حصہ ہے اور وہ برطانوی حکومت کا ایک نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اس اسٹول پر بیٹھنے کا حقدار ہے۔ ابھی اس نے اپنے حق میں پورے دلائل نہیں دیئے تھے کہ اشانتی سربراہ نے گورنر جنرل کا سر تن سے جدا کر دیا سٹول کے اس جھگڑے نے گولڈ کوسٹ کی طویل ترین جنگ برپا کر دی جو حملہ آور انگریزی فوج نے گولے اور بارود کے بل بوتے پر جیت لی۔

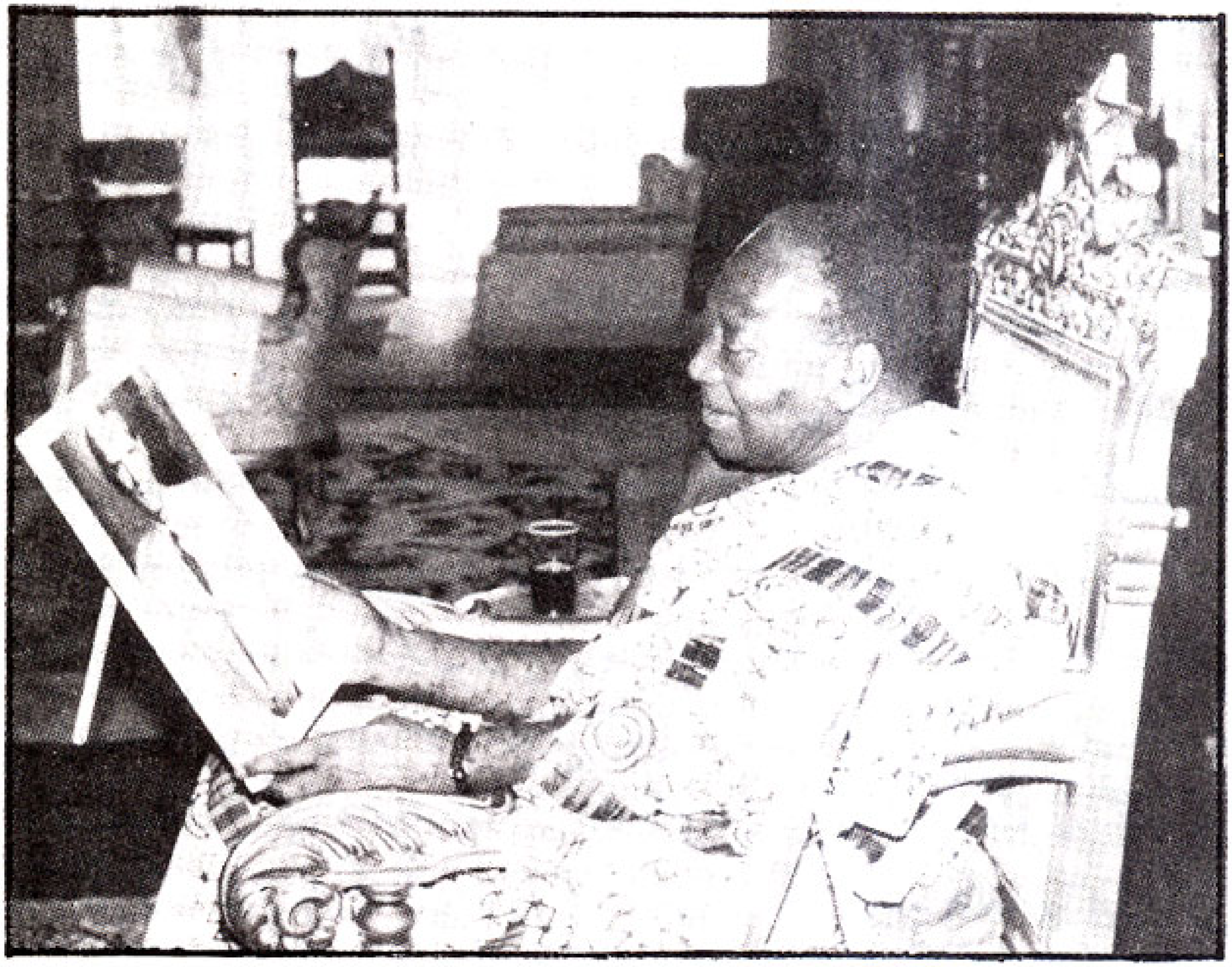

جب قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر اسانتی ہینی کو پیش کی گئی

اشانتی قبیلے کے افراد کو یقین ہے کہ خالص سونے کا ٹھوس اسٹول اشانتی سربراہ کے لئے آسمان سے اتارا گیا ہے اور دیوتاؤں ہی کے مخصوص احکام کے تحت اس کی حفاظت کے لئے جان دینے والا شہید ہے۔ یہ بھی دیوتاؤں ہی کا حکم ہے کہ کوئی غیر اشانتی حکمران اس اسٹول پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر بیٹھے گا تو اس کا قتل واجب ہو جائیگا۔ چنانچہ اس روایت کے مطابق کسی غیر آدمی کا یہ مطالبہ کرنا کہ سونے کا اسٹول اس کے حوالے کر دیا جائے ایک سنگین جرم ہے جس کی سزا قتل ہے۔ لہٰذا قبائلی قانون کے مطابق غیر ملکی گورنر جنزل کا قتل جائز تھا۔

دوسری طرف گورنر جنزل کا قتل برطانوی قانون کے مطابق ایک جرم تھا جس کی رو سے تمام اشانتی قبیلہ مجرم قرار پایا۔ اس ناقابل معافی جرم کو نظرانداز کرنا برطانوی حکومت کے بس کی بات نہ تھی۔ اشانتی قبیلے کے پاس محض تیر تفنگ اور تلوار تھی اس کے برعکس برطانوی سپاہی جدید اسلحہ سے لیس تھے۔ توپوں اور بندوقوں کا تیروں اور تلواروں سے کہاں تک مقابلہ کیا جا سکتا ہے جنگ کا نتیجہ سخت خونریزی اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ برآمد نہ ہوا۔ برطانوی سپاہیوں نے اپنی روایت کے مطابق خوب قتل و غارت گری کی۔ اگرچہ اشانتی قبیلے نے کمال جرات و ہمت اور دلیری سے کام لیا مگر تیر اور تلوار سے وہ توپ اور بندوق کا مقابلہ کیسے اور کب تک کر سکتے تھے۔ اشانتی قبیلے کا سردار اور اس کے تمام ساتھی قتل کر دیئے گئے اور قبیلے کے باقی تمام لوگ غلام بنا لئے گئے سونے کا اسٹول جس کے لئے یہ جنگ برپا ہوئی تھی برطانوی حکومت کے حوالے کر دیا گیا۔

یہ بھی روایت ہے کہ سونے کا یہ اسٹول اصلی نہیں تھا بلکہ راتوں رات ایک اسٹول تیار کر کے نئے گورنر جنزل کے سپرد کر دیا گیا۔ اگرچہ تاج برطانیہ کے نمائندے کو اس جعلسازی کا علم ہو چکا تھا تاہم وہ مصلحتاً خاموش ہو گیا کیونکہ اشانتی قبیلے کے افراد کی بہادری اور دلیری نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ برطانوی سپاہیوں نے صرف توپ اور بندوق کے سہارے فتح پائی ہے ورنہ وہ قبائلی افراد کے ساتھ لڑتے

لڑتے نڈھال ہو چکے تھے۔ اور مزید جنگ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔

اشانتی قبیلے کے موجودہ سربراہ سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے قدیم روایت کے بارے میں یہی سوال کیا اور انہوں نے بڑی سنجیدگی سے اس کی تصدیق کی کہ ہاں ایسا ہی ہوا تھا جیسا آپ نے سنا ہے اور انہیں اس روایت پر بہت فخر ہے کہ ان کے آباؤ اجداد ایسے ہی جنگجو اور بہادر تھے کہ انہوں نے برطانوی حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ انہوں نے کہا یہ بھی درست ہے کہ گورنر جنرل کو اسٹول کے نقلی ہونے کا پتہ چل گیا تھا مگر اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ ایک اور جنگ کا خطرہ مول لے سکے۔

مجھے گھانا میں قیام کیے ابھی چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ خیال آیا کماسی کو بھی دیکھنا چاہئے اس کی بڑی شہرت سنی ہے۔ وہاں اشانتی قبیلے کے سردار اسانتی ہینی ASANTE HENE کا محل ہے۔ ہر سفیر کم سے کم ایک مرتبہ اسانتی ہینی سے ضرور ملتا ہے کیونکہ اس کی سیاسی اور سماجی حیثیت مسلمہ ہے۔ قبائلی روایات کے مطابق وہ اس خطہ ارضی پر اپنے اس جد اعلیٰ کی نمائندگی کرتا ہے جو دیوتاؤں کی دعاؤں سے مقدس روحوں کے جلو میں یہاں آسمان سے اتارا گیا تھا۔ یہی وہ مفروضہ ہے جس کے باعث اشانتی ریجن سب کا سب اس کی ملکیت ہے اور گھانا کی مرکزی حکومت کا عمل دخل اس ریجن میں اتنا ہی ہے جتنا اسانتی ہینی اس کی اجازت دے۔

جہاں تک میں نے دیکھا ہے اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حکومت اور اسانتی ہینی ایک دوسرے کے دائرہ کار سے دور ہی رہتے ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ ورکنگ رابطہ ہے جس کا دونوں احترام کرتے ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے سے خوش نہیں تو وہ ناراض بھی نہیں۔ میں نے اسانتی ہینی سے ملاقات کا وقت طے کرنے کے لئے عکرہ میں چیف آف پروٹوکول کو درخواست بھجوا دی اور اس کے چند روز بعد میں اور میری بیگم نرگس اسانتی ہینی سے ملاقات کرنے کے لئے عکرہ سے کماسی پہنچ گئے۔

اگلی صبح ۹ بجے اسانتی ہینی کے چیف آف پروٹوکول نے اسانتی محل کے گیٹ پر ہمارا استقبال کیا۔ ایک خوبصورت ڈیوڑھی کے راستے ہم ایک بڑے کمرے میں پہنچ گئے جہاں اسانتی ہینی کا سرکاری مترجم اور ان کی کابینہ کے چند وزراء اور اسانتی ہینی کے قبیلے کے دو چھوٹے چیف موجود تھے۔ مجھے اور نرگس کو ایک علیحدہ صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسانتی ہینی ایک مخصوص دروازے سے برآمد ہوئے وہ اپنے قبیلے کے روائتی لباس میں ملبوس ایک بھاری بھرکم شخصیت تھے۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لئے نہایت متانت اور سنجیدگی سے آہستہ آہستہ چل کر ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گئے یہ کرسی اگرچہ سونے کی بنی ہوئی نہیں تھی تاہم سونے سے منقش تھی۔

چیف آف پروٹوکول نے میرا اور نرگس کا ان سے تعارف کرایا۔ میں نے پاکستان کی جانب سے انگریزی میں چند جملے ادا کئے جن کا سرکاری مترجم نے مقامی زبان میں ساتھ کے ساتھ ترجمہ کیا۔ پھر میری بات کے جواب میں اسانتی ہینی نے بھی جو کچھ کہا اس کا سرکاری مترجم انگریزی میں ساتھ ساتھ ترجمہ کرتا گیا۔ یہ خوشگوار گفتگو ایک گھنٹے پر محیط تھی۔

گفتگو کے دوران ہم میاں بیوی کی کوکا کولا سے تواضع کی گئی۔ باتوں باتوں میں یہ بھی پتہ چلا کہ گذشتہ آٹھ برس کی مدت میں میں پہلا پاکستانی سفیر تھا جسے اسانتی ہینی کے پاس آنے اور ان سے ملاقات کرنے کا موقع ملا۔

ملاقات کے وقت اسانتی ہینی نے روایتی کپڑے کا بھاری تہہ بند باندھ رکھا تھا اور جسم کے اوپر کے حصے کو اسی کپڑے سے لپیٹ رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے احرام باندھ رکھا ہے۔ اس کپڑے کو کینٹی کلاتھ کہا جاتا ہے یہ چار خانہ رنگدار ہوتا ہے جس میں پیلا رنگ خاص طور سے نمایاں ہوتا ہے۔ اسے بڑی بڑی ٹکریوں میں بنایا جاتا ہے۔ یہ ہمارے ہاں کے کھیس کے سائز کا بھی ہوتا ہے اور کمربند کے سائز کا بھی۔ عورتیں اس کپڑے کو عام استعمال کرتی ہیں۔ بہت خوبصورت ہوتا ہے اور اسے خالص سوت سے بنایا جاتا ہے۔ جو رنگ اس میں دیئے جاتے ہیں وہ عام طور پر مقامی

پسند کے مطابق ہوتے ہیں اور نہایت پختہ ہوتے ہیں۔ اس کپڑے کو قبائلی رسموں اور شاہی دربار وغیرہ میں مختلف تقریبات کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اسانتی ھینی سے جتنی بار بھی مجھے ملنے کا اتفاق ہوا میں نے انہیں ہر بار اسی لباس میں پایا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں خالص سونے کی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ ہر انگوٹھی تقریباً ایک چھٹانک وزنی ہو گی ان کی پیشانی پر خالص سونے کی فاختائیں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسانتی ہینی نے اپنے پاؤں میں چمڑے کی فلیٹ چپلیں پہن رکھی تھیں۔ ان پر بھی خالص زردوزی کا کام ہوا تھا۔ ہاتھ میں ان کے عصائے سربراہی تھا جو ٹھوس سونے کا بنا ہوا تھا۔ عام طور پر ان کے ہاتھ میں ایک دوسرا عصا ہوتا ہے جس پر سونے کا پتر چڑھا ہوتا ہے۔

موجودہ اسانتی ہینی بار ایٹ لاء ہیں۔ انگلینڈ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ گھانا حکومت کی جانب سے اٹلی میں نامزد سفیر تھے جب ان کے قبیلے نے انہیں اپنی سربراہی کیلئے چن لیا یوں وہ سفیر ہوتے ہوتے رہ گئے انہیں اس کا کوئی افسوس نہیں کہ وہ سفیر نہ بن سکے۔ ان کے ہال میں ایک پکچر گیلری بھی ہے جہاں دنیا کے مختلف سربراہوں اور لیڈروں کی تصویریں سجائی ہوئی ہیں۔ میں نے ایک موقع پر اس بات کا نوٹس لیا کہ گیلری میں قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر نہیں۔ میں نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کروائی اس پر اسانتی ہینی نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ قائداعظم کی ایک تصویر مہیا کر دیں تو میں آپ کا بیحد ممنون ہوں گا اور مجھے اس پر فخر ہو گا کہ میری فرمائش پر آپ نے گیلری میں آویزاں کرنے کے لئے مجھے قائداعظم کی ایک تصویر مہیا کی۔ میں نے ان سے اس کا وعدہ کر لیا اور کہا کہ اب دوبارہ جب ان سے ملنے آؤں گا تو قائداعظم کی تصویر اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔ اس پر وہ پھر بولے کہ اس کے ساتھ ہی اپنی بھی ایک تصویر لیتے آنا۔ میں تمہاری تصویر کو شرلے ٹمپل بلیک BLACK SHIRLEY TEMPLE کی تصویر کے ساتھ سجا دوں گا۔ شرلے ٹمپل بلیک ایک امریکی ایکٹریس خاتون تھیں جو امریکہ کی جانب سے گھانا میں سفیر رہ چکی تھیں۔ اور

ان کی ایک خوبصورت تصویر نمایاں مقام پر آویزاں تھی۔ چنانچہ اگلی بار جب میں کماسی گیا تو دونوں مطلوبہ تصویریں اپنے ساتھ لے گیا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر سفارت خانے میں لگی ہوئی ہے جو سرکاری طور پر مشن کو بھیجی جاتی ہے۔ میں نے گورنر جیلانی کے زمانے میں ان کے ملٹری سیکرٹری کے کمرے میں قائداعظم کی ایک رنگین تصویر دیکھی تھی جو مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے اس تصویر کی ایک کاپی کے لئے پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے گورنر کے سیکرٹری سے فون پر اپنا رابطہ قائم کیا اور کہا کہ مجھے اس تصویر کی ایک کاپی مہیا کر دی جائے۔ انہوں نے اس ضمن میں مجھ سے تفصیل دریافت کی تو میں نے انہیں صرف اتنا بتایا کہ مجھے قائداعظم کی وہی رنگین تصویر چاہئے اور بس۔ مگر افسوس گورنر جیلانی نے میری اس آرزو کو پذیرائی کے قابل نہ سمجھا اور تصویر کی ایک کاپی اصرار کے باوجود نہ بھجوائی۔ مجھے افسوس ہے کہ ان صاحب نے جو اپنے آپ کو مسلم لیگی کہلواتے ہیں اور تحریک پاکستان کا ایک کارکن ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں' میری اس معصوم خواہش کو پورا نہ کیا اور بخل سے کام لیا۔

خدا بھلا کرے مخدوم سجاد حسین قریشی کا وہ پنجاب کے گورنر تھے۔ جب میں نے انہیں عکرہ سے قائداعظم کی تصویر کے لئے کہا اور انہیں ایک خط لکھ کر مطلوبہ تصویر کی نشاندہی کر دی۔ تو انہوں نے ایک ہفتے کے اندر اندر وہ تصویر نہایت عمدہ فریم میں مجھے بھجوا دی۔ یہی وہ قائداعظم کی تصویر ہے جو اسانتی ہینی کی پکچر گیلری میں نمایاں جگہ پر معزز مہمانوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی ہے۔ مجھے انڈین کمیونٹی کے ایک مقتدر رکن نے بتایا کہ یہ بات قابل رشک ہے کہ اسانتی ہینی کی پکچر گیلری میں بھارت کے کسی رہنما اور لیڈر کی تصویر جگہ نہیں پا سکی اور قائداعظم کی تصویر نمایاں جگہ پر آویزاں ہے۔

اسانتی ہینی سے میری اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ایک بار میرے بچے اشتر' بیگم

اشتر اور ان کا بیٹا محمد افتخار علی میرے پاس عکرہ آئے ہوئے تھے۔ میرا دوسرا بیٹا یاسر ان دنوں میرے پاس ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ مجھے ایک سرکاری کام سے کماسی جانا تھا۔ میں نے ان سب کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ کماسی پہنچ کر میں نے چیف آف پروٹوکول سے استدعا کی کہ اسانتی ہینی کے پاس فرصت کا وقت ہو تو ہمیں ملاقات کا موقع بخش دیں۔ انہوں نے مہربانی فرما کر ہمیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اب اسانتی ہینی اور میرے درمیان براہ راست انگریزی میں گفتگو ہونے لگی تھی اور مترجم کے واسطے کا حجاب اٹھ چکا تھا۔ یہ اعزاز انہوں نے بہت ہی تھوڑے لوگوں کو دیا ہوا تھا۔ ورنہ پروٹوکول کے مطابق اسانتی ہینی (ASANTE HENE) مترجم کے واسطے سے ہی گفتگو کرتے ہیں۔ براہ راست گفتگو بالکل نہیں کرتے تھے۔

یہ ملاقات خوب رہی۔ میرا پوتا محمد افتخار علی دربار ہال میں گھومتا رہا۔ اس کے ساتھ اسانتی ہینی نے ایک تصویر بھی اتروائی۔ یہ بے تکلفی پروٹوکول کے آداب سے سوا تھی۔ محمد نے دربار ہال کی کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو اس کو مور نظر آئے۔ وہ باہر جانے پر مچل گیا۔ اس پر اسانتی ہینی بہت محظوظ ہوئے اور انہوں نے ایک گارڈ کے ہمراہ میرے پوتے کو باہر بھیج دیا۔ وہ باہر جا کر دیر تک کھیلتا رہا۔ اب ہمارا وہاں سے رخصت ہونے کا وقت ہو رہا تھا۔ اسانتی ہینی نے ہمارے لئے پروٹوکول کا پھر ایک اصول توڑا۔ وہ ہمیں الوداع کہنے اپنے محل کے پورچ تک ہمارے ساتھ آئے۔ چیف آف پروٹوکول بھی ان کے ہمراہ تھے۔ میرا پوتا محمد افتخار علی اس وقت لان میں ایک مور کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلانا چاہا۔ مگر اسانتی ہینی نے مجھے منع کر دیا اور کہا یہ آپ کا نہیں میرا پوتا ہے اسے کھیلنے دو۔ ہم سب اس وقت پورچ میں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ تاآنکہ وہ پسینے میں نہایا ہوا ہمارے پاس آگیا۔ اس دوران اسانتی ہینی ہمارے ہمراہ کھڑے رہے۔ یہ ایک منفرد اعزاز تھا جس سے پاکستان کے لئے ان کے خیرسگالی کے جذبے کا اظہار ہو رہا تھا۔

جب الوداعی ملاقات کے لئے میں اسانتی ہینی کے یہاں حاضر ہوا تو میں پاکستانی

ہینڈی کرافٹ کی دو چار اشیاء اپنے ساتھ لے گیا۔ ان میں آ لیکس پتھر کا بنا ہوا ٹیبل لیمپ بھی تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بیحد خوش ہوئے اور فوراً دربار ہال کے درمیان رکھی ہوئی ایک میز سے چیزیں اٹھا کر ٹیبل لیمپ اس پر سجا دیا۔ مجھ سے کہنے لگے اب یہ ٹیبل لیمپ اسی جگہ پر نصب رہے گا۔ ہر آتے جاتے شخص کی اس پر نگاہ پڑے گی اور یہ ایمبیسڈر علی شیخ اور اسانتی ہینی کی دوستی کی علامت بنا رہے گا۔

عکرہ سے روانگی سے چند روز پہلے اسانتی ہینی کی جانب سے ایک قبائلی چیف میرے یہاں آیا اس نے مجھے اسانتی ہینی کی طرف سے ایک الوداعی تحفہ پہنچایا۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا مجسمہ ہے جس میں ایک شخص کو درخت پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور دوسرا شخص اسے نیچے سے اوپر چڑھنے کے لئے سہارا دے رہا ہے۔ قبائلی چیف نے مجھے بتایا کہ اسانتی ہینی نے یہ تحفہ خاص طور پر منتخب کیا ہے اور کہا ہے کہ اس مجسّمے کا مطلب مقامی زبان میں کچھ اس طرح سے ہے۔

IF YOU ARE WELL MEANING DIVINE HELP
SHALL COME TO PUSH YOU TO THE TOP

اسانتی ہینی بیحد طاقتور سربراہ ہیں لیکن وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ وہ گھانا کے واحد قبائلی سربراہ ہیں جن کے لئے سربراہ مملکت کا استقبال کرنے کے لئے بھی اپنے اسٹول سے اٹھ کر کھڑے ہونا کوئی ضروری نہیں۔ لیکن وہ اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ وہ مہمانوں کے احترام میں اپنے روایتی اسٹول سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور ان کا پرتپاک استقبال کرتے ہیں۔

وہ اس بات کی بڑی آرزو رکھتے ہیں کہ انہیں پاکستان کا دورہ کرنے کا موقع ملے۔ میں نے ان کی اس خواہش سے اسلام آباد میں ارباب اقتدار کو مطلع کیا ہوا ہے مگر اس کا کیا کیجئے کہ دفتر خارجہ کی اپنی ترجیحات ہیں۔ اور انہیں دعوت دینے کے لئے میری سفارش کام نہیں آئی۔

ہم نے تو آج تک گھانا کے صدر مملکت کمانڈر انچیف فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے

رالنگ کو بھی کبھی دعوت نہیں دی اور نہ کبھی کسی اور سماجی و سیاسی شخصیت ہی کو مدعو کیا ہے۔ یہ انداز فکر اور طرز عمل افریقہ کے بارے میں جو ہم نے اختیار کیا ہوا ہے اچھے اور مخلص دوستوں سے اپنے آپ کو محروم رکھنے کے مترادف ہے۔

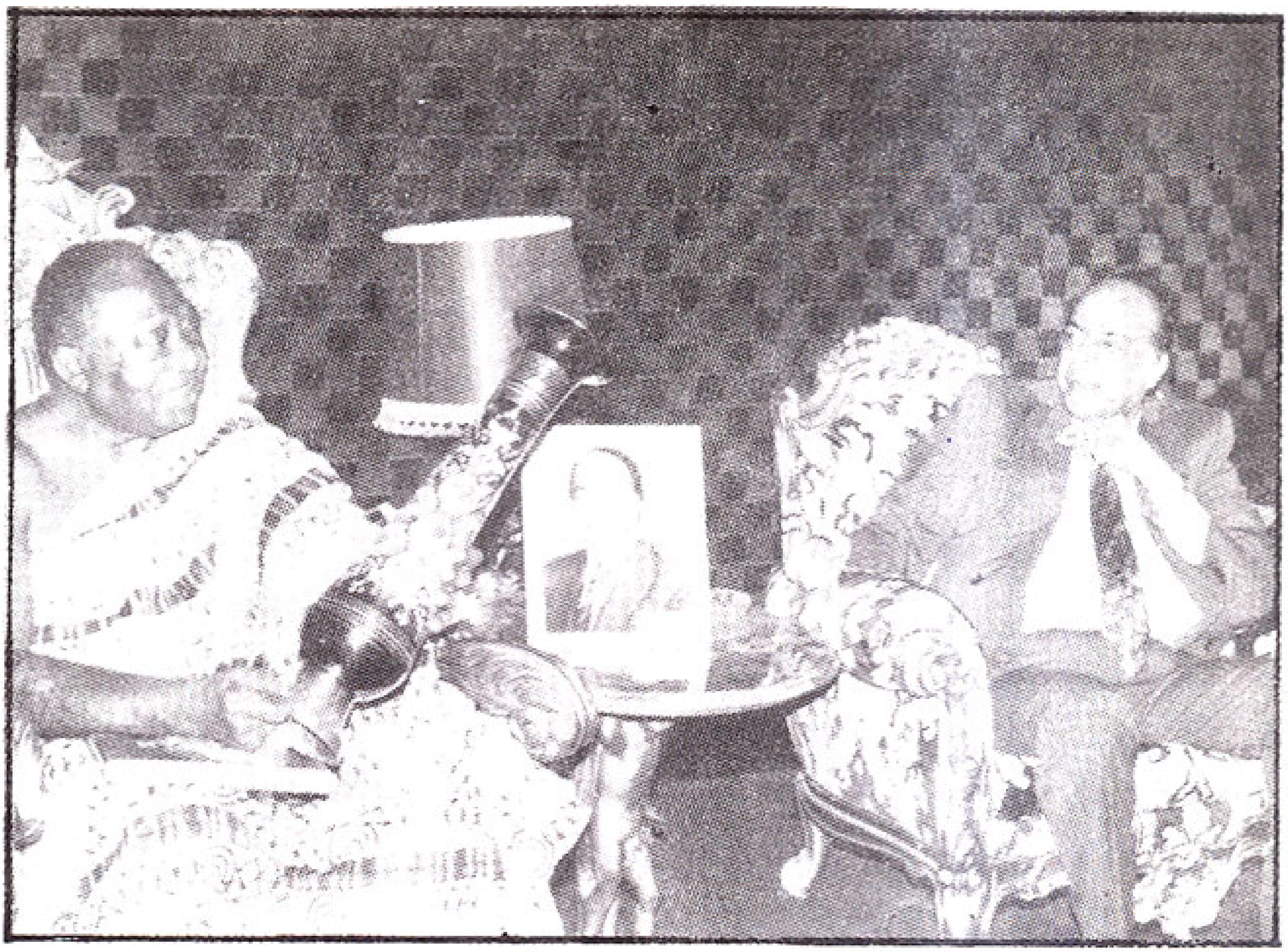

پاکستانی سفیر اسانتی ہینی کے ساتھ

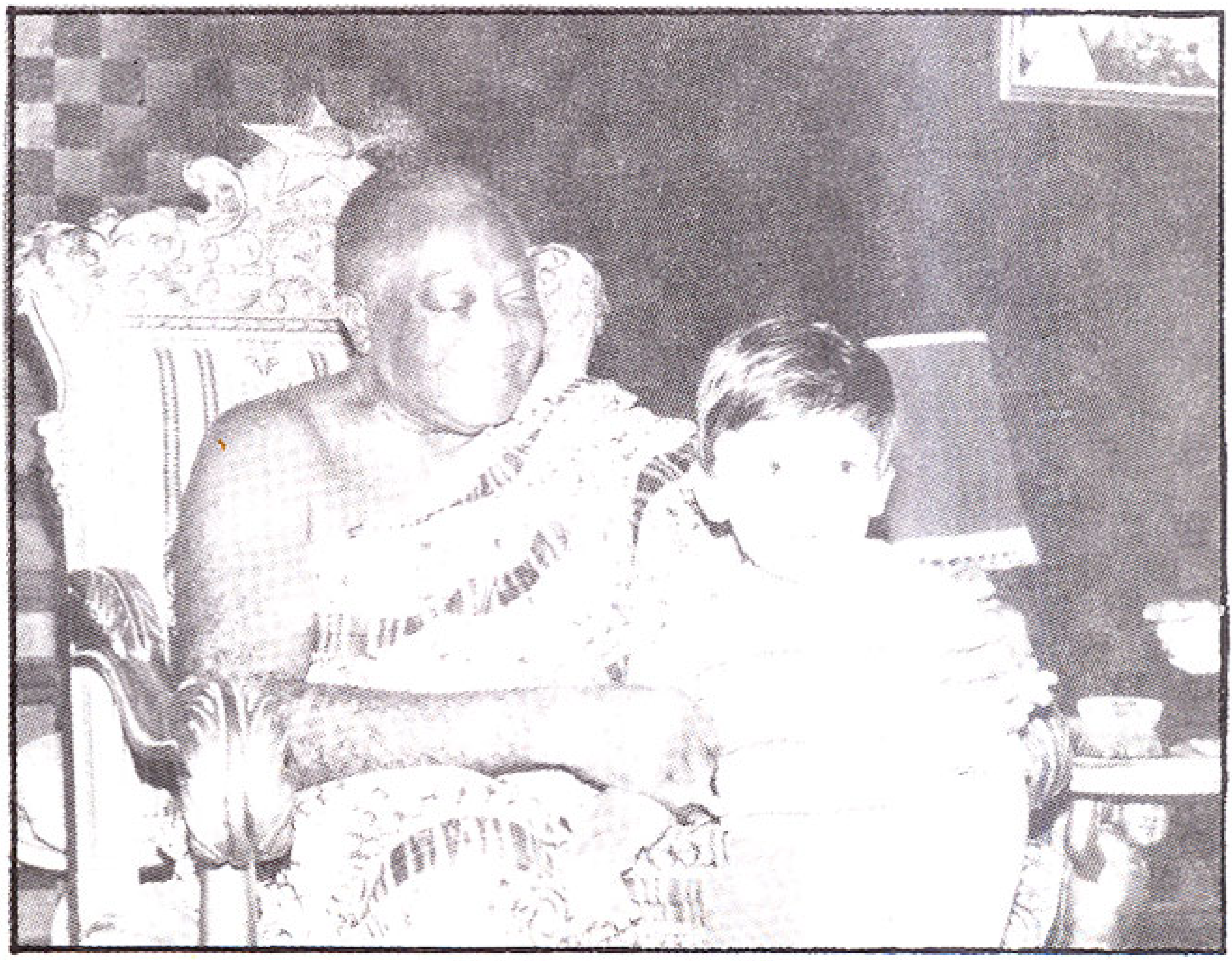

محمد افتخار علی اور اسانتی ہینی

امام کعبہ کے ساتھ چند روز

امام کعبہ عبداللہ ابن سبیل دنیا بھر میں اسلام کی خدمت میں بیجد کوشاں ہیں پاکستان میں ہر سال وہ ایک مرتبہ تشریف لاتے ہیں۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بھی تشریف لائے اور جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں بھی۔ ان کے یہ دورے خیرسگالی سے مزین ہوتے ہیں وہ پیرانہ سالی کے باوجود دور دراز کے سفر میں تھکتے نہیں۔ قوت ایمانی انہیں متحرک رکھتی ہے افریقہ میں بھی ان کا ورود ہوتا ہے۔ گھانا میں میرے قیام کے دوران وہ تقریباً ہر سال تشریف لائے۔ ۱۴ر فروری ۱۹۸۸ء کا ذکر ہے کہ مجھے سعودی ناظم الامور شیخ انور عبدالروحو کی جانب سے فون پر اطلاع ملی کہ امام کعبہ ۱۵ر فروری کو تشریف لا رہے ہیں اور اگلے روز شام کو شیخ انور کے ہاں کھانے پر ملاقات رہے گی۔ ساتھ ہی یہ فرمائش بھی انہوں نے کی کہ عکرہ میں قیام کے دوران میری گاڑی بھی انہیں درکار ہو گی۔ یہ اظہار تھا اس اعتماد کا اور تعلق کا جو سعودی سفارت خانے کا ہمارے ساتھ تھا۔ میرے لئے ذاتی طور پر یہ بات فخر و اطمینان کا باعث تھی کہ میں کسی طور امام کعبہ کی خدمت میں حصہ لے سکوں گا۔ اگلے روز صبح وہ بذریعہ جہاز تشریف لائے تو میں' مصر کے سفیر شلبایہ' لبنان کے سفیر جابر اور الجیریا کے سفیر حمید ایئرپورٹ پر استقبال کے لئے موجود تھے۔

اس سے اگلے روز شام کے کھانے پر ان سے ملاقات رہی۔ وہیں اس بات کا اظہار ہوا کہ اس مرتبہ امام کا ارادہ گھانا کے شمالی ریجن کے ہیڈکوارٹر تمالی TAMALE جانے کا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کی انجمن نے دو روزہ انٹرنیشنل

اسلامک کنونشن کا انتظام کر رکھا ہے۔ مجھے پہلے سے اس کنونشن میں شمولیت کے لئے دعوت مل چکی تھی۔ میں نے عین سعادت جان کر یہ دعوت قبول کر لی۔ امام کعبہ اگلے دو روز تک عکرہ میں مصروف رہے۔ ۱۹ر فروری کو ہم لوگ عازم تمالی ہوئے۔ ان کے ہمراہ ریاض کی یونیورسٹی کے ڈین اور اسلامی شاریہ یونیورسٹی کے سربراہ بھی تھے۔ وہی ان کے مترجم بھی تھے۔ دونوں کے پاس اسلامی شریعت میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں تھیں۔ عکرہ میں دو روز کے قیام کے دوران امام نے مقامی مساجد میں نماز باجماعت ادا کی تھی۔ ہر مسجد کے امام کو بھی انہوں نے کنونشن کی دعوت دی۔ پھر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اس کنونشن میں ان کے ہمراہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور ایئرپورٹ پر پہنچ گئے۔ عکرہ میں مقیم سفیروں میں سے میں اور مصر کے سفیر شلبابہ ہی ساتھ گئے۔ یہ قافلہ کوئی ۳۰ر افراد پر مشتمل تھا۔ سعودی ناظم الامور کے ہمراہ ایک خانساماں‘ رسد کے طور پر ڈبل روٹی‘ پنیر‘ مکھن‘ انڈے‘ گھی‘ چینی‘ پینے کا سادہ پانی سربمہر بوتلوں میں دیگر مشروبات کے علاوہ پانچ چھ عدد بکرے اور اتنی ہی بھیڑیں ساتھ لے لی گئیں۔ سفر کے لئے گھانا کی آرمی کا ایک جہاز چارٹر کیا گیا۔ پروگرام کے مطابق ہمارا قیام تمالی میں دو روز تھا۔ تیسرے روز ہم نے واپس آ جانا تھا۔

۱۰ر بجے دن عکرہ ایئرپورٹ سے روانگی ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم تمالی ایئرپورٹ پر پہنچ گئے۔ جہاز کے رکتے ہی بے پناہ ہجوم اس کی طرف دوڑا۔ اور سیڑھی کے لگتے لگتے جہاز مکمل طور پر لوگوں کے محاصرے میں تھا سب سے پہلے امامِ کعبہ جہاز سے برآمد ہوئے تو تمام ایئرپورٹ اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ہر شخص امام کعبہ سے مصافحہ کرنے کا خواہاں تھا۔ یہ تو شکر ہے کہ امام کعبہ ہاتھ کو بوسہ کرانے کے قائل نہیں ہیں ورنہ ایئرپورٹ پر ہی رات ہو جاتی۔ ہجوم نے بالآخر امام کو پیجیرو میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ ایئرپورٹ پر اس وقت چھ پیجیرو کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک سعودی ناظم الامور نے چوبیس گھنٹے پہلے بذریعہ روڈ بھیج دی تھی۔ ان کی ایک مرسڈیز بھی بذریعہ روڈ پہنچی تھی۔ باقی

23 فروری 1988ء - امام عبداللہ ابن سبیل عکرہ میں پاکستان مشن کے عملے کے ساتھ امام کے دائیں جانب پاکستانی سفیر بیٹھے ہیں

ٹرانسپورٹ کا انتظام ایک لبنانی فرم جاپان موٹرز والوں نے کر رکھا تھا۔ یہ فرم کافی پرانی ہے اور اس کے مالکان نے گھانا کے مقامی مسلمانوں کے ہاں شادیاں کر رکھی ہیں۔ کافی مالدار لوگ ہیں۔ پاکستانی سفارت خانے کے ساتھ ہمیشہ سے ہی اس خاندان کے خوشگوار اور برادرانہ مراسم رہے ہیں۔ تمالی میں ہمارے ٹھہرنے کا انتظام سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں انہوں نے کیا تھا۔

یہ گیسٹ ہاؤس ایک چھوٹے سے ٹیلے کے اوپر تعمیر ہے۔ ہر ماڈرن سہولت اس میں میسر ہے۔ پانی، بجلی، خوبصورت فرنیچر، کچن اور درآمد شدہ گیس۔ لیکن بجلی ندارد تھی کہ جن دنوں ہم وہاں گئے۔ لوڈشیڈنگ کا پیریڈ تھا۔ عام حالات میں دن بھر میں چار گھنٹے بجلی میسر ہوتی تھی۔ ہمارے قیام کے دوران یہ مدت بڑھا کر آٹھ گھنٹے کر دی گئی لیکن بجلی آنکھ مچولی ہی کھیلتی رہی۔ یہی حال پانی کا تھا۔ وہ بھی بجلی کا ساتھ دے رہا تھا۔ شام کی چائے کے بعد گپ شپ ہوتی رہی۔ امام کعبہ کو ملنے کے لئے مقامی لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ رات کے کھانے تک موجود رہے۔ سعودی ناظم الامور نے تمام انتظام اپنے اوپر لے رکھا تھا اس لئے سب ملاقاتیوں کی تواضع کی گئی۔ رات آئی تو سونے کی مشکل پڑ گئی۔ اگرچہ یہاں تمام عمارتوں میں کراس ونٹیلیشن کا انتظام ہوتا ہے۔ پنکھے تک کی ضرور نہیں پڑتی اور نہ ہی کوئی بے آرامی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن گیسٹ ہاؤس میں اس امید پر ماڈرن ڈیزائن کا خیال رکھا گیا کہ یہاں بجلی کی کمی نہ ہو گی اور ہر بیڈروم میں ایئرکنڈیشنر بھی لگا دیئے گئے تھے کراس ونٹیلیشن کا لحاظ نہ رکھا گیا تھا۔ میں بیڈروم میں گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گھٹن کا احساس ہوا۔ ایئرکنڈیشنر بجلی کی کمی کی وجہ سے نہ چلتا تھا۔ چنانچہ میں نے نیچے ہال کمرے میں قالین پر ڈیرا جما لیا۔ کھڑکیاں کھول دیں۔ تھوڑی خنکی لئے ہوئے ہوا نے ذرا دیر میں مجھے سلا دیا۔ فجر کی نماز کے وقت جب گیسٹ ہاؤس میں بیداری ہوئی تو مجھے بھی جگایا گیا۔ معلوم ہوا کہ گیسٹ ہاؤس میں پانی تمام مہمانوں کے لئے دستیاب نہیں ہے۔ اور منتظمین نے اپنے اپنے گھروں میں ہمارے نہانے کا انتظام کر رکھا ہے جلدی جلدی فارغ ہوئے۔

امام کعبہ کی قیادت میں نماز فجر ادا کی۔ اس دوران یہ بات سب کو معلوم ہو چکی تھی کہ پاکستان کے سفیر نے رات فرش پر سو کر گزاری ہے۔ سب لوگ تعریف کر رہے تھے کہ میں نے ذاتی آرام کا خیال نہیں رکھا اور بغیر جگہ کی شکایت کئے فرش پر سونے کی تکلیف اٹھائی۔ ان کے خیال میں میں نے اسلامی جذبہ مروت سے کام لیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ فرش پر سونے میں میری طرف سے کوئی تکلیف اٹھانے کا تکلف نہ ہوا تھا بلکہ میں تو بیحد آرام سے تازہ ہوا کے خنکی آمیز جھونکوں میں قالین پر سویا تھا اور شاید مصر کے سفیر اور سعودی ناظم الامور سے زیادہ آرام میں رہا جنھوں نے تکلفاً اپنے اپنے کمروں میں بجلی، پنکھے اور ایئرکنڈیشنر کے بغیر رات بسر کی تھی۔ بہرحال میرے فرش پر سونے کی خبر نے اچھا تاثر دیا۔ چائے ناشتے سے فارغ ہو کر ہم اس میدان میں پہنچے جہاں کنونشن کے لئے انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق تیس ہزار کے قریب لوگ کنونشن میں شامل ہوئے۔ تمام کے تمام پتھریلے میدان میں بغیر سائے کے دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے اور تمام دن بیٹھے رہے، صبر و سکون سے۔ خاموشی سے۔ چلچلاتی دھوپ میں وہ انٹرنیشنل اسلامک کنونشن میں شرکت کے لئے دور و نزدیک سے آئے تھے۔ تمالی کی اپنی تمام آبادی بھی اجگہ اکٹھی ہو جاتی تو بھی اتنا ہجوم نہ بنتا۔ لوگ دور دور کے علاقوں سے سائیکلوں پر، پیدل اور بغیر کسی ذریعہ آمدورفت کے ماسوائے اپنے دو پاؤں کے، اسلام کی محبت کے لئے آئے تھے۔ وہ امام کا نام سن کر آئے تھے۔ کنونشن میں لاؤڈ سپیکر کا انتظام تھا۔ بجلی صرف اور صرف اس کے لئے میسر ہو سکی تھی۔ ہم لوگ جنہیں مہمانان خصوصی کہا گیا تھا ایک سٹیج پر بیٹھے تھے جس کے اوپر ایک شامیانہ تھا۔ یہاں بھی پنکھوں کا کوئی انتظام نہ تھا۔ صبح جس جگہ سورج کے رخ کی وجہ سے شامیانے کا سایہ تھا۔ سورج کا رخ بدلنے کے ساتھ ساتھ وہی جگہ دھوپ میں آتی گئی۔ چنانچہ سب مہمانان خصوصی نے دھوپ کا مزہ چکھا سامعین کے لئے تو کوئی سایہ نہ تھا۔ لیکن کسی جانب سے بھی احتجاج کی آواز نہ اٹھی۔ نماز کا وقفہ ہوا تو

امام کی قیادت میں اسی میدان میں نماز ظہرو عصر پڑھائی گئی۔ امام اور ہم لوگ تو حالت سفر میں تھے اس لئے کسر نماز ادا کی۔ مقامی لوگوں نے علیحدہ باجماعت نماز پڑھی لیکن جو لوگ تمالی میں باہر سے آئے تھے انہوں نے ہمارے ساتھ ہی کسر نماز ادا کی وہیں پتھریلے میدان میں گرم کنکریوں کے فرش پر۔ کنونشن کی ابتداء میں مہمانان خصوصی کا تعارف بھی کرایا گیا۔ جب میرے متعلق بتایا گیا کہ میں پاکستان کا سفیر ہوں تو لوگوں نے جوش و خروش سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کئے۔ اتنے جوش و خروش سے کہ سعودی ناظم الامور نے مجھ سے خاص طور پر پوچھا کہ تمہارا تو یہاں تعارف تک نہیں ہے تو یہ نعرے کس خوشی میں۔ اللہ اکبر کا نعرہ وہاں ہمارے ہاں زندہ باد کے نعرے کے مترادف ہے۔ کسی کا نام لے کے نعرہ نہیں لگایا جاتا۔ اسی طرح مسلمانوں کی تقریبات میں سامعین خوشی کا اظہار بھی اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر کے کرتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام سنتے ہی کافی دیر تک اللہ اکبر کے نعروں سے میدان گونجتا رہا۔

تمالی میں دو بڑی مساجد ہیں دونوں کے درمیان اللہ کے نام پر رقابت ہے۔ ایک پرانی جامع مسجد ہے اور ایک ابھی زیر تکمیل۔ کنونشن کے پہلے روز ہم نے پرانی جامع مسجد میں مغرب اور عشا کی نمازیں ادا کیں۔ میں بعد از نماز باہر نکلا تو جوتا ندارد۔ میں بے ساختہ ہنس پڑا کہ مسجد سے نمازی کا جوتا غائب کرنے کا رواج ہمارے ہاں تو ہے ہی۔ کیا افریقہ کے اس دور دراز علاقے میں بھی یہی رواج ہے۔ سامنے ایک بنچ پڑا تھا۔ پتھریلے راستے پر ننگے پاؤں چلنا محال تھا۔ بہرحال وہاں جا کے بیٹھ گیا اور صورت حال پر غور کرنے لگا۔ اتنی دیر میں ایک مقامی شخص نے خاموشی سے لا کر میرے پاس ایک جوتا رکھ دیا۔ میں نے دیکھا تو میرا ہی تھا۔ میں نے ان کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمام مہمانان خصوصی کے جوتے اس نے اپنی تحویل میں لے لئے تھے۔ تاکہ ہمیں بے شمار جوتوں میں سے اپنا جوتا ڈھونڈنے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔ جوتا گم ہونے کا صدمہ اور چوری ہونے کے رواج پر میں بہت پشیمان تھا کہ یہ مرض کہیں مسلمانوں کے تمدن کا حصہ تو نہیں بن گیا۔ لیکن ان منتظم صاحب کی سوچ نے

میرے علم میں اضافہ کیا کہ افریقی تواضع کا یہ بھی ایک حصہ ہے کہ مہمان کو چھوٹی سے چھوٹی زحمت سے محفوظ رکھا جائے۔ امام نے یہاں بھی کافی دیر تک قیام کیا۔ رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ جاپان موٹرز والے اس رات کے لئے میزبان تھے۔ کیٹرنگ اینڈ سروس ریستوران میں انہوں نے انتظام کر رکھا تھا۔ یہ وہاں کا بہت مشہور ریستوراں ہے۔ انتظام سراسر ولائتی تھا۔ کھانا مقامی لحاظ سے پر تکلف تھا لیکن مشکل ایک آن پڑی۔ میزبان نے پچاس مہمانوں کے لئے کہہ رکھا تھا۔ ہال میں اس سے دگنے مہمان موجود تھے چنانچہ پچاس آدمیوں کا کھانا سو کے قریب مہمانوں کو بانٹا گیا۔ یہ نہیں تھا کہ بن بلائے مہمان آ گئے تھے۔ نماز عشاء کے بعد جب امام *پیجیرو میں روانہ ہوئے تو اس گاڑی کے ساتھ ان کے مداح بھی کشاں کشاں پیدل چلے آئے اور یوں جب وہ ریستوران میں داخل ہوئے تو یہ لوگ بھی ہمراہ آ گئے۔ وہیں مجھے بتایا گیا کہ ہمارے لئے رات بسر کرنے کا علیحدہ انتظام کیا گیا ہے۔ مجھے تمالی کے ایک ماڈرن رہائشی علاقے میں ایک شخص عبداللہ کے ہاں قیام کرنا تھا۔ یہ تین بیڈروم کا گھر تھا۔ باتھ روم، ڈریسنگ روم، ڈرائنگ روم، لاؤنج وغیرہ سے آراستہ، بجلی اور پانی بھی موجود۔ رات بھر بجلی کا پنکھا چلتا رہا۔ صبح معلوم ہوا کہ رات بھر کے لئے بجلی موجود تھی۔ صبح سے لوڈشیڈنگ ہے اور پانی بھی غسل خانے میں نہ آ سکتا ہے کہ واٹر ورکس بھی تو بجلی کے بغیر پانی سپلائی نہ کرے گا۔ یہ ایک ماڈرن رہائشی کالونی تھی۔ گھر نئے اور خوبصورت بنے ہوئے تھے۔ میرے میزبان نے پلاسٹک کی دو بالٹیاں اٹھائیں اور جلد ہی پانی بھر لایا۔ معلوم ہوا کہ پانی دس بارہ میل دور سے ٹینکروں میں لایا جاتا ہے اور کچھ عرصے سے چونکہ بجلی کی لوڈشیڈنگ کی وجہ سے واٹر ورکس کا انتظام تسلی بخش نہیں ہے۔ اس لئے ٹینکروں کا نظام رائج ہے۔ فی گھر ضرورت کے مطابق راشن مقرر ہے۔ یہی پانی پینے کے کام بھی لایا جاتا ہے۔ پانی دریا سے حاصل کیا جاتا ہے اور اسے صاف کر کے سپلائی کیا جاتا ہے۔ اس کی صفائی کا کیا معیار ہے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ دریا کا پانی دوسرے دریاؤں کے پانی کی طرح نہ تو پینے کے قابل

ہے نہ ہی نہانے دھونے کے۔ اس پانی میں بیشمار بیماریوں کے جراثیم موجود ہیں۔ تمالی کے اس دریا کے استعمال سے آنکھوں کی بینائی ختم ہو جاتی ہے جس کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہو سکا۔ پھر گنی وارم GUINEA WORM کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ مرض خاصہ بھیانک ہے۔ دریا کا پانی پینے سے جسم میں ایسے جرثومے داخل ہو جاتے ہیں جو ابتدا میں تو پیٹ کے عام کیڑوں کی طرح ہوتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لمبے ہوتے جاتے ہیں۔ اس حالت میں وہ پیٹ سے گردن کی طرف سفر کرتے ہیں اور چھاتی کے پٹھوں میں سوراخ کر کے باہر لٹک جاتے ہیں۔ خواتین کے پستانوں میں سے انہیں باہر نکلنے کا راستہ باآسانی مل جاتا ہے۔ یہ کیڑے جسم کے اندر مر بھی جاتے ہیں اور اگر متاثرہ شخص اس کے باہر نکلے ہوئے سرے سے اسے نکالنے کی کوشش کرے تو یہ اکثر اوقات ٹوٹ جاتا ہے اور یوں یہ جسم کے اندر مرجاتے ہیں جس سے تمام جسم میں سوزش پیدا ہوتی ہے اور پھر بیجد تیز بخار غلبہ پا لیتا ہے۔ مناسب علاج نہ کیا جائے تو مریض کی وفات بھی ہو سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جرثومے کو گنی وارم اس لئے کہتے ہیں کہ یہ سب سے پہلے ریاست گنی میں دریافت ہوا تھا۔ گنی والے کہتے ہیں کہ اب اس کا نام کچھ اور رکھ لیا جائے کیونکہ ان کے ملک میں یہ مرض ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے ہاں ڈیرہ اسمٰعیل خان کے علاقے میں بھی یہ مرض پایا جاتا ہے۔ معلوم نہیں گنی سے یہ مرض ہمارے ہاں کیسے پہنچا۔ افریقہ میں اس کے انسداد کیلئے بی سی سی آئی کے سابق سربراہ آغا حسن عابدی کے افریقی پروگرام گلوبل ۲۰۰۰ کے تحت بہت کام ہو رہا ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے یہ پروگرام گھانا میں کافی کامیاب ہے۔

جلد از جلد تیار ہو کر میں اور میرا میزبان گیسٹ ہاؤس آئے۔ یہاں ناشتے کا کافی اچھا انتظام تھا۔ پھر ہم کنونشن میں گئے۔ جمعے کا دن تھا۔ چنانچہ نماز جمعہ کے قریب امام کی تقریر کے بعد کنونشن اختتام کو پہنچی۔ اور ہم سب دوسری مسجد میں نماز جمعہ کے لئے جمع ہوئے۔ یہ تین منزلہ مسجد ہے' کافی بڑی ہے۔ ابھی نامکمل ہے لیکن پوری

تینوں منزلیں نمازیوں سے بھری ہوئی تھیں- تل رکھنے کو جگہ نہ تھی- امام کی کوشش سے پرانی مسجد والوں نے بھی ہمارے ہمراہ اس مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی- نمازیوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے مسجد کے آگے پیچھے کی دونوں سڑکوں پر بھی لوگوں نے نماز ادا کی- ایک حصے میں عورتوں نے بھی باجماعت نماز ادا کی- مسجد کے سامنے دکانیں ہیں ان کی چھتوں پر بھی نماز جمعہ ادا ہوئی- یہاں لاؤڈ سپیکر کا انتظام تھا- لیکن بجلی ندارد-

انٹرنیشنل اسلامک کنونشن کا اختتام ابھی نہ ہوا تھا- ابھی تو الوداعی دعوت کا اہتمام گیسٹ ہاؤس میں تھا- وہاں سعودی اور مقامی خانساموں نے تقریباً دو سو افراد کے لئے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا' بیحد شاندار ضیافت تھی- مقامی' سعودی اور ولائتی کھانوں سے میز سجی ہوئی تھی- سالم بکرے بھی روسٹ کئے ہوئے تھے- حسب دستور بہت سے لوگ آئے اور انہوں نے سعودی ناظم الامور کی میزبانی کا لطف اٹھایا- یہ ایک بیحد کامیاب کنونشن کا بہت ہی پر تکلف اختتام تھا-

گیسٹ ہاؤس سے ایئرپورٹ کا راستہ صرف ۱۲ میل ہے- لیکن یہ فاصلہ عام طور پر جیپ کے ذریعے دو اڑھائی گھنٹوں میں طے ہوتا ہے- راستہ جو کبھی پکی سڑک ہوتا تھا- اب صرف ریت کے درمیان نشان ہے- سڑک عرصہ ہوا ٹوٹ پھوٹ چکی ہے- دوبارہ مرمت کی نوبت ہی نہیں آئی- اگر ڈرائیور اناڑی ہو تو باآسانی راستہ بھول سکتا ہے- اسی طرح اگرچہ عکرہ سے تمالی کا راستہ بذریعہ سڑک چار ساڑھے چار گھنٹے کا ہے لیکن یہ بھی کم ازکم بارہ گھنٹے میں طے ہوتا ہے اور راستے میں کوئی جگہ نہیں جہاں سستایا جا سکے- تمام راستہ اجاڑ ہے- نہ کوئی راستے میں چائے خانہ ہے نہ ریستوران نہ کوئی ایسی آبادی جہاں کوئی آسانی دستیاب ہو سکے- چنانچہ سڑک کے ذریعے سفر کرنے والے پانی تک ساتھ لے کر بس میں سوار ہوتے ہیں اور جو بس خراب ہو گئی- تو اللہ حافظ ہے- سڑک کے کنارے کھلے آسمان تلے قیام کے سوا چارہ نہیں تاوقتیکہ کمک نہ پہنچے-

تمالی میں قیام کے دوران ہی میں نے امام کو عکرہ میں اپنے ہاں دعوت کے لئے مدعو کر لیا اور وہیں سعودی ناظم الامور اور مصری سفیر کو بھی اطلاع کر دی۔ دونوں مساجد کے امام صاحبان کو بھی میں نے عکرہ مدعو کر لیا۔

۲۱ر فروری کی شام کو عکرہ پہنچے۔ اگلے دن میں نے اپنے سٹاف کے ممبران کی میٹنگ کی اور مدعوئین کی فہرست مرتب کر کے انہیں ۲۳ر فروری کی شام کے لئے اطلاع دینے کا کام شروع کر دیا۔ میرے سٹاف نے بہت تعاون کیا۔ تمام مسلمان ممالک کے سفارت خانوں میں مسلمان سفارت کاروں کو اسی شام گھروں پر بھی اطلاع کر دی گئی۔ جاپان موٹرز اور مسلمان لبنانیوں کو بھی اطلاع دی گئی۔ بی سی آئی کے مقامی مسلمان عملے کو بھی مدعو کیا۔ پھر باری آئی عکرہ میں مساجد کے امام صاحبان کی اور مسلمانوں کے امام صاحبان کی۔ ان سب کو بھی مدعو کیا۔

رات گئے جب گنتی کی گئی تو معلوم ہوا کہ مہمانوں کی تعداد ایک سو تک پہنچ چکی ہے۔ اگلے روز تمام وقت متوقع مہمانوں کو اطلاع کرنے میں صرف ہوا گھر پر طعام کا انتظام تھا۔ طعام کے بعد امام نے ایئرپورٹ جانا تھا اس لئے ضروری تھا کہ کھانا ٹھیک وقت پر کھا لیا جائے اور امام سہولت سے ایئرپورٹ جا سکیں۔ ظہر اور عصر کی نمازیں انہوں نے دو مختلف مساجد میں ادا کیں اور عین مغرب کے وقت میرے گھر پہنچ گئے۔ لیکن اس دوران ایک پاکستانی مسلمان نور کرمانی جو ورلڈ بنک کے پروگرام کے تحت مقیم تھے نے مہمان نوازی کے تمام آداب کے خلاف اپنی افتاد طبع کے عین مطابق ان مہمانوں کو اکگیخت کیا جو امام کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ امام تو آتے رہیں گے نماز مغرب کا وقت نکلا جا رہا ہے لہٰذا جماعت ہو جانی چاہئے۔ یہ صاحب لاہور سے ہیں اور ورلڈ بنک میں کسی عزیز کی وساطت سے مختلف ممالک میں ورلڈ بنک کی جانب سے کام کرنے پر نکل جاتے ہیں۔ وہ یہ فراموش کر گئے کہ امام اور ان کے ہمراہی اور دیگر مسلمان سفیر جو ان کے ہمراہ میرے ہاں آ رہے ہیں بحمد اللہ بخوبی جانتے ہیں کہ نماز مغرب کب اور کس وقت ادا ہونی چاہئے۔ بہرحال نور کرمانی کی قیادت میں پاکستانی اور

عکرہ کے چند مسلمانوں نے نماز مغرب کے لئے صف بندی کر لی۔ ابھی انہوں نے نیت ہی باندھی تھی کہ امامِ کعبہ تشریف لائے۔ ان کی قیادت میں دیگر تمام لوگوں نے نماز ادا کی۔ انہوں نے اس چیز کو نوٹس کیا کہ پاکستان ہاؤس میں مغرب کی دو جماعتیں ہوئی۔ انہوں نے ذکر تو نہ کیا لیکن ان کے ہمراہیوں میں سے ایک صاحب نے جو جدہ سے آئے ہوئے تھے مجھ سے اس بارے میں ذکر ضرور کیا۔ میرے پاس کوئی خاطرخواہ جواب نہ تھا' ٹال دیا۔ لیکن نور کرمانی کی اس حرکت سے طبیعت مکدر ہو گئی ان کا طرز عمل کسی طور پر بھی مناسب نہ تھا۔ اس میں انہیں بی سی سی آئی کے ایک افسر کی حمایت بھی حاصل تھی جو مجھے شیعہ ہونے کی وجہ سے پسند نہ کرتے تھے۔ میں اس واقعہ کے بعد ان دونوں کے بارے میں محتاط ہو گیا۔ یہ دعوت امام نے عین مہربانی فرما کر قبول کی تھی۔ دعوت منظور کرنے میں پاکستان کے ساتھ ان کی محبت کا دخل بھی تھا۔ سعودی عرب کے ساتھ پاکستان کے تعلقات تاریخی اور روایتی تو ہیں لیکن اگر کسی تیسرے ملک میں اس محبت اور اخوت کے تعلقات کا اظہار کیا جائے تو اس کے بہت بہتر نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ میں نے جو ان کے ساتھ تمالی کا دورہ کیا اور واپسی پر ان کے لئے دو روز کے اندر اندر دعوت کا انتظام کیا' تو یہ سراسر میرا فرض منصبی بھی تھا اور سعادت بھی۔ میں ایک گنہگار انسان ہوں اور مجھے احساس ہے کہ میں ان نوازشات کے قابل کبھی نہیں ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔ امام کا میزبان ہونا بھی میرے لئے ایک منفرد اعزاز ہے۔ دعوت کے اختتام پر جو انہوں نے تقریر میں پاکستان کے لئے دعائیہ کلمات کہے ان سے بخوبی ترشح ہوتا تھا کہ انہیں مدعو کرتے وقت جو مقصد میرے ذہن میں تھا' میں اس میں کامیاب ہو گیا تھا۔

مرتب کردہ فہرست کے مطابق اس دعوت میں سو کے لگ بھگ احباب کی شمولیت متوقع تھی لیکن ہوا یوں کہ مہمان آتے گئے اور کھانا چلتا رہا یہاں تک کہ کچھ لوگ امام کی روانگی کے بعد بھی تشریف لے آئے اور دعوت میں شامل ہو گئے۔ عکرہ میں مقیم ہر قابل ذکر مسلمان نے اس دعوت میں شمولیت کی اور مجھے عزت بخشی۔ یہ

دعوت دیگر مسلمان سفیروں کے لئے باعث رشک بنی اور چند روز عکرہ کے مقامی حلقوں میں اس کا تذکرہ بھی رہا۔ حکومتی حلقوں میں اس کا اچھا اثر پڑا جیسا کہ مجھے سعودی ناظم الامور نے بتایا' ریاض کے دفتر خارجہ میں بھی اس دعوت کو بنظر احسن دیکھا گیا۔

گھانا کے شمال کا تمام ریجن ۹۰ فیصد مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ بقیہ دس فیصد آبادی بھی نیم مسلمان ہے۔ عربی کی تعلیم عام ہے۔ قرآن شریف ناظرہ اور باترجمہ کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ عام طور پر آبادی پابند صوم و صلوۃ ہے۔ تمالی میں حسب معمول مسلمانوں کے درمیان بھی اختلاف رونما ہوا۔ لیکن ان کے درمیان صرف امامت کا جھگڑا تھا جس کے لئے حکومت کو مداخلت کی دعوت دی گئی۔ کچھ عرصہ ہوا یہ جھگڑا بھی ختم ہو چکا ہے کہ پرانی مسجد اور نئی مسجد کے اماموں کے درمیان حکومت کے مقامی نمائندے نے امام عبداللہ کی وساطت سے تصفیہ کرا دیا ہے۔ دونوں امام اب اپنی اپنی جگہ مطمئن ہیں۔ پرانی مسجد کے امام کا دعویٰ تھا کہ تمالی میں نئی جامع مسجد کی ضرورت نہیں ہے۔ جو رقم نئی مسجد پر خرچ کرنی مقصود ہے وہی رقم اگر پرانی مسجد پر خرچ کر دی جائے تو وہ پھر سے نئی ہو جائے گی۔ نئی مسجد کی بنا ڈالنے والوں کا موقف تھا کہ تمالی کی آبادی کے لحاظ سے دوسری جامع مسجد کی ضرورت ہے۔ دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر ڈٹ گئے اور ایک تنازعے کی شکل پیدا ہو گئی۔ ابتداء میں تو یہ مسئلہ شدید نہ تھا لیکن جب مسلمان ممالک نے نئی مسجد کی تعمیر کیلئے فنڈز دیئے تو پرانی مسجد کے امام نے گھانا حکومت کی طرف رجوع کیا۔ امن و امان میں خلل کا اندیشہ تو نہ تھا کہ گھانا کے باشندے ہاتھا پائی کرنے کی شہرت نہیں رکھتے۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ تمالی شہر اور قرب و جوار میں مسلمان قبائل کے درمیان ناخوشگوار بحث شروع ہو گئی۔

گھانا کی حکومت سیکولر ہے۔ مذہبی آزادی اور رواداری کا اصول ہر شعبہ زندگی پر اثر انداز ہے۔ لہٰذا حکومت وقت کے لئے مسلمانوں کے درمیان اختلاف ناخوشگوار صورت حال کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

عمرہ میں میرے قیام کے دوران پاکستان سے تبلیغی جماعت کے ارکان ہر سال تشریف لاتے رہے اور میں ذاتی طور پر جو ان کی خدمت کر سکتا تھا کرتا رہا۔ سفارت خانے کے پاکستانی سٹاف نے ہمیشہ ان سے دست تعاون بڑھایا اور تمامتر سہولتیں مہیا کیں۔ حج کے مہینے میں ان کے لئے حج کے ویزوں کا بندوبست کیا۔ عمرے کے لئے بھی سعودی ناظم الامور کے تعاون سے ان کے لئے بندوبست کرتا رہا۔ تبلیغی جماعت والے گروپ اللہ کی راہ میں سفر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے۔ ان کی خدمت میں کوشاں رہنا ہمارے لئے ثواب کا کام تھا اور اسی جذبے سے میں نے اور میرے سٹاف نے انہیں ہر وہ سہولت پہنچائی جو ہمارے بس میں تھی۔ میں نے ان کے ذریعے رائے ونڈ پیغام بھیجا کہ گھانا کے شمالی ریجن کے مسلمانوں کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے طور پر تبلیغی جماعت کی جانب سے ایک گروپ ضرور جانا چاہئے۔ تمالی کے قیام کے دوران وہاں کے مسلمانوں نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا۔ یہ ایک بیحد خوش آئند بات ہو گی اگر ہمارے ہاں سے کوئی گروپ یا وفد جائے اور پاکستان کی جانب سے اسلامی اخوت کا پیغام پہنچائے۔

افغانستان میں
آپ امریکہ کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں

وزارت خارجہ پاکستان کا مغربی افریقہ کی ساحلی ریاستوں سے رابطہ رسمی طور پر مختلف مواقع پر محض عید کارڈ کرسمس کارڈ اور سال نو کی مبارکباد کے کارڈوں کی ترسیل تک محدود ہے تجارتی تعلقات نہ ہونے کے برابر ہیں اور انہیں بڑھانے کے لئے اب تک کوئی مربوط یا غیر مربوط پالیسی بھی وضع نہیں کی گئی۔ ثقافت کا میدان ہم نے اپنے پڑوسی ملک کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔ سیاسی روابط میں ہم نیم دلانہ کاوش کرتے رہتے ہیں۔ ان ممالک کے ساتھ ہمارا رابطہ اس وقت سنجیدہ ہوتا ہے جب ہمیں ان کے ووٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم دفتر خارجہ کی جانب سے ووٹ مانگنے ایک سفیر خصوصی طور پر بھیجتے ہیں میں ۲۰ جولائی ۱۹۸۶ء کو گھانا پہنچا تھا دو تین ماہ کے بعد دفتر خارجہ کے ایڈیشنل سیکرٹری جناب محمد اکرم ذکی کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ مغربی افریقی ممالک کے دورے کے لئے وزیر اعظم پاکستان کے خصوصی سفیر کی حیثیت سے تشریف لانے والے ہیں ان کے دورے کا مقصد افغانستان کے مسئلے پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں ان ممالک سے پاکستان کے ریزولیوشن کی تائید حاصل کرنا ہے۔

محمد اکرم ذکی کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ فارمن کرسچین کالج لاہور کی یونین کے صدر ہوتے تھے گاہے گاہے لاہور میں کسی نہ کسی تقریب میں ان سے میری ملاقات ہو جاتی تھی آپ جناب عبدالمجید اصغر مرحوم سیشن جج لاہور کے

صاحبزادے ہیں اور انور زاہد چیف سیکرٹری کے بھائی ہیں۔

جولائی ۱۹۸۶ء میں جب میں لاہور سے عکرہ کے لئے روانہ ہوا تو ذکی اس وقت نائیجریا میں پاکستان کے سفیر تھے میں نے انہیں اپنی فلائٹ نمبر سے آگاہ کیا اور عرض کیا کہ وہ مجھے ایئرپورٹ پر ملیں چنانچہ وہ بکمال مہربانی ایئرپورٹ پر موجود تھے جہاز کوئی ایک گھنٹے کے قریب وہاں رکا رہا۔ اس دوران میری ان سے تفصیلی گفتگو ہوتی رہی میں نے ان سے سفارت کاری کے بارے میں رہنمائی چاہی انہوں نے اس سلسلے میں مجھے بہت کچھ بتایا اور کہا کہ انہوں نے اپنے تجربے سے جو سب سے زیادہ اہم شے معلوم کی ہے وہ یہ ہے کہ سفارت کار کو اپنی کارکردگی اور عدم کارکردگی دفتر خارجہ کو صاف صاف رپورٹ کرتے رہنا چاہئے یہ سب سے پہلی اور بنیادی بات ہے دوسرے یہ کہ اگر کوئی بھول چوک یا غلطی سرزد ہو جائے تو اسے چھپانا نہیں چاہئے بلکہ فوری طور سے دفتر خارجہ کو اس سے مطلع کر دینا چاہئے تیسرے یہ کہ ایک سفارت کار کا فرض منصبی دفتر خارجہ کی پالیسی کے مطابق عمل کرنا اور اس کا دفاع کرنا ہے نیز جہاں کہیں مناسب سمجھا جائے۔ اور بہتر تجویز نظر آئے۔ اس کے بارے میں دفتر خارجہ کو آگاہ کرنا بھی ایک سفیر کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ذکی نے ابتداء ہی میں جس طرح میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی وہ میرے بہت کام آئی اب میرے سفارت کے تین ماہ بعد جو دورے پر وہ یہاں آ رہے تھے تو اس سے میں بہت خوش تھا کہ اب میں ان سے مزید مشورہ حاصل کر سکوں گا۔

گھانا آنے سے پہلے ذکی کو برکینا فاسو BURKINA FASO پہنچنا تھا۔ یہ ملک بھی میرے ہی دائرہ کار میں شامل تھا انہیں وہاں افغانستان کے مسئلے پر ووٹ مانگنا تھا اور پھر عکرہ آنا تھا۔ اگرچہ برکینا BURKINA FASO کا دورہ سیاسی اعتبار سے میرے لئے بھی اہم تھا۔ مگر میں نے تو ابھی تک اس کا تعارفی دورہ بھی نہیں کیا تھا اور کاغذات تقرری بھی پیش نہ کئے تھے۔

اس لئے معاملے کی اہمیت کے پیش نظر میں نے خان غلام محمد لونڈ خور کے صاحبزادے کونسلر شیر محمد خان کو برکینا فاسو کے دارالحکومت "واگاڈوگو DOUGOU OAUGUA" بھیج دیا کہ وہ ذکی کا استقبال کریں اور تاکید کی کہ وہ ان کے ساتھ ساتھ رہیں۔ جب وہ وہاں سے فارغ ہوں تو پھر ان کے ساتھ چلے آئیں۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق محمد اکرم ذکی کو واگاڈوگو میں تین دن ٹھہرنا تھا اور جہازوں کی پروازوں کے شیڈول کے مطابق انہیں فارغ ہونے کے بعد عکرہ پہنچنے کے لئے کم سے کم دو روز کا وقفہ اور چاہئے تھا مگر وہ اپنے قیام کو مختصر کرتے ہوئے بہت پہلے ہی عکرہ تشریف لے آئے۔

اگرچہ گھانا کی حکومت نے ان کے قیام و طعام کا بندوبست کیا ہوا تھا تاہم انہوں نے میری دعوت قبول کی اور میرے پاس ہی ٹھہر گئے جو میری حوصلہ افزائی بھی تھی اور مناسب بھی۔

گھانا کی حکومت کی جانب سے ڈاکٹر محمد ابن چمباس (IBNE CHAMBAS MUHAMMAD) پی۔ این۔ ڈی۔ سی ڈپٹی سیکرٹری امور خارجہ نے ان کا استقبال کیا۔ سپریم کورٹ آف گھانا کے ریٹائرڈ جج اور پی۔ این۔ ڈی۔ سی کے رکن مسٹر جسٹس ڈی۔ ایف۔ انن (MR. D. F. AANNAN) کے ساتھ تبادلہ خیال ہوا جس میں منجملہ دیگر امور کے افغانستان کے مسئلے پر بھی گفتگو ہوئی اور محمد اکرم ذکی اس گفتگو سے مطمئن ہو کر افریقہ کے دوسروں ملکوں کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

بیشتر ازیں برکینا فاسو سے محمد اکرم ذکی کو مایوسی ہوئی تھی وہاں ان کا تمامتر تجربہ اور شگفتہ بیانی کچھ کام نہ آئی تھی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں پچھلے سال برکینا فاسو نے ہماری پیش کردہ قرارداد کے خلاف ووٹ دیا تھا

دفتر خارجہ کی ہدایت کے مطابق ۱۹۸۶ء کی جنرل اسمبلی میں تائید کے لئے محمد اکرم

ذکی کے عکرہ آنے سے پہلے میں نے ڈاکٹر پروفیسر عبید اساموا پی این ڈی سی سیکرٹری برائے امور خارجہ سے ملاقات کی میں ابھی افغانستان کے موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے تمہید باندھ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر موصوف بے ساختہ بولے ''گھانا کی حکومت افغانیوں کے حق خود ارادیت کی تائید و حمایت کرتی ہے اور اس اصول پر وہ جنرل اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں بھی پاکستان کی طرف سے پیش کردہ قرار داد کی پر زور تائید اور حمایت کرے گی۔''

گھانا کی حکومت کی طرف سے پاکستان کی پیش کردہ قرار داد کی تائید و حمایت کا مطلب صرف ایک ووٹ ہی نہیں تھا بلکہ پورے براعظم افریقہ کی سیاسی طاقت کا پاکستانی موقف کے حق میں ایک اظہار تھا۔ کیونکہ گھانا کی حکومت کو مغربی ذرائع ابلاغ کے معاندانہ رویے کے باوجود افریقہ کی قیادت میں نمایاں سیاسی حیثیت حاصل ہے افریقہ کے بیشتر ممالک نظریاتی اور علاقائی مشورہ و رہنمائی گھانا ہی سے حاصل کرتے ہیں۔

گھانا میں یوں تو انگریزی زبان کے بہت سے اخبارات و جرائد روز نامے اور ہفتہ وار شائع ہوتے رہتے ہیں مگر اشاعت کے لحاظ سے ان سب پر ''گھانین ٹائمز'' (DAILY GHANIAN TIMES) کو فوقیت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک روزنامہ ڈیلی گرافک (DAILY GRAPHIC) بھی شائع ہوتا ہے جس کی اشاعت بھی گھانین ٹائمز ہی کے لگ بھگ ہے ان دونوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں کی پالیسی اور حکمت عملی ایک ہی ہے اور حکومت کی طرف سے یہ دونوں پرچے اتنے ہی آزاد ہیں کہ جتنے تیسری دنیا کے ملکوں میں آزاد بتائے جاتے ہیں۔

اپریل ۱۹۸۷ء میں گھانا کے ایک اخبار میں مس ڈورس اوکانسی OKANCIE MS. DORICE کی جانب سے افغانستان کے بارے میں یکے بعد دیگرے کئی مضامین شائع ہوئے جن میں تیسری دنیا کے غیر جانبدار اسلامی ملک افغانستان پر روسی حملے کے خلاف نکتہ چینی کا بھرپور انداز میں دفاع کیا گیا تھا اور افغانستان میں روسی مداخلت کو صحیح اقدام ثابت کرنے کے لئے ایسے ایسے نکتے اور دلائل پیش کئے گئے جو روس کو

بھی کبھی نہیں سوجھے تھے مثلاً انہوں نے بتایا کہ روس کی فوجی مداخلت کے باعث افغانستان کی اقتصادی حالت کو استحکام حاصل ہو گیا ہے یہ کہ روسی مداخلت سے پہلے افغانستان میں زراعت نام کو بھی نہیں تھی روسی ٹیکنالوجی نے افغانستان کی کایا پلیٹ دی ہے اب افغانستان بہت جلد زرعی مصنوعات میں خود کفیل ہو جائے گا ایک مضمون میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا کہ روسی نظام حکومت کی بدولت اب افغانستان دنیا کے آزاد جمہوری ملکوں کی صف میں آ کھڑا ہوا ہے۔ افغانستان میں صنعتی ترقی کے بارے میں ایسے ہی بلند بانگ دعوے کئے گئے۔

الغرض روس کی فوجی مداخلت کی برکات مذکورہ مضامین میں نہایت موثر اور پر زور انداز میں بیان کی گئیں مس ڈورس اوکانسی MS. DORICE OKANCIE سیاسی طور پر اپنا ایک خاص اثر رکھتی ہیں گھانا میں ۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کے انقلاب کے بعد اس کے دفاع کے لئے جو ایک ہمہ مقتدرہ کمیٹی بنائی گئی (COMMITTEE FOR DEFENCE OF REVOLUTION) اس کے سربراہی دفتر میں ایگزیکٹو سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں علاوہ ازیں انقلاب افغانستان کی نویں سالگرہ کی تقریب میں گھانا سے جو وفد افغانستان گیا وہ اس کی سربراہ تھیں اس وفد میں دیگر ارکان کے علاوہ نوجوان اخبار نویس بھی شامل تھے یہ وفد عکرہ سے ایرو فلوٹ کی پرواز کے ذریعے پہلے ماسکو پہنچا۔ پھر وہاں سے چند روز قیام کر کے تاشقند پہنچ گیا۔ وہاں تھوڑی سی سیر و تفریح کر کے افغانستان کے جشن انقلاب کے عین موقع پر کابل پہنچ گیا۔ اس وفد کے سفر کے تمام اخراجات عکرہ میں روسی سفارت خانے نے اٹھائے۔

مس ڈورس اوکانسی نے اس دورہ کی روداد بڑی وضاحت اور تفصیل سے اپنے مضامین میں بیان کی مذکورہ مضامین کی اشاعت سے سیاسی اور سفارتی حلقوں میں یہ خیال پختہ ہو گیا کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں افغانستان کے مسئلے پر گھانا پاکستان کا ساتھ نہیں دے گا۔ میں نے مس ڈورس اوکانسی کے مضامین کا جواب لکھنے کی بجائے اپنی توجہ زیادہ تر گھانا دفتر خارجہ پر مرکوز رکھی۔ اس وقت قائم

مقام ڈائریکٹر جنرل مسٹر جے سی D JASIE تھے جو عہدے کے لحاظ سے ہمارے دفتر خارجہ کے سیکرٹری کے برابر تھے میں نے ان سے رابطہ قائم رکھا جو بڑا کارآمد ثابت ہوا میں نے انہیں افغانستان کے مسئلے پر لٹریچر مہیا کیا۔ اور انہیں مس ڈورس اوکانسی کے مضامین کے بارے میں ایک احتجاجی مراسلہ بھی بھیجا انہوں نے اس مسئلے میں ہماری مدد بھی کی اور رہنمائی بھی جو ان کی پاکستان کے ساتھ خیرسگالی کا مظہر تھی۔

میرا پروٹسٹ نوٹ بڑا طویل تھا جس میں افغانستان کے مسئلے کی تاریخ سیاق وسباق سے بیان کی تھی اس نوٹ کی ایک نقل اپنے ایڈیشنل فارن سیکرٹری کو بھی میں نے بھجوائی تھی یہ صاحب کوریا میں ہمارے سفیر رہ چکے تھے اور ان کی سفارت کاری بہت کامیاب ثابت ہوئی تھی مجھے یقین ہے کہ وہ میری ارسال کردہ رپورٹیں اور مراسلے بڑی توجہ سے دیکھتے تھے میرا پروٹسٹ نوٹ بھی انہوں نے خوب غور سے پڑھا اور تبصرہ کیا کہ سفارتی روایت اور آداب و معیار کے برعکس یہ بہت ہی طویل مراسلہ ہے لیکن یہ بھی لکھا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو جائے۔

میرا یہ پہلا اور آخری احتجاجی مراسلہ تھا جو میں نے تین برس کی سفارت کے دوران تحریر کیا تھا مشن میں سب سے زیادہ سیز افسر احتجاجی مراسلے میں جو میری رہنمائی کر سکتا تھا وہ شیر محمد کونسلر تھا مگر وہ مجھ سے بھی ناراض تھا اور دفتر خارجہ سے بھی۔ اس کے بیرون ملک تعیناتی کے اب چھ سال پورے ہو چکے تھے اور اسے واپس پاکستان آنا تھا مگر بوجوہ چند اسے روک لیا گیا اس کے تبادلے کے احکامات پہلی بار نومبر ۱۹۸۶ء میں آئے تھے میں نے اس خیال سے کہ میں اور سیکنڈ سیکرٹری محکمہ امور خارجہ میں نئے نئے وارد ہوئے ہیں اور دونوں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ملک سے باہر تعینات ہوئے ہیں لہٰذا میں نے ان کے تبادلے کے احکامات فروری تک کے لئے روک دینے کی سفارش کر دی۔ مگر دفتر خارجہ نے معلوم نہیں کس وجہ اور کس بنیاد پر ان کے تبادلے کو ماہ جون کے آخر تک ملتوی کر دیا۔

مشن کے افسر موصوف نے تبادلے کے التواء پر اب ایک اور چکر چلایا انہوں

نے دفتر خارجہ میں مختلف سطح کے افسروں سے رابطہ قائم کیا تاکہ ان کی جگہ کوئی دوسرا سفارت کار نہ متعین ہونے پائے وہ ہمہ وقت اسی کام کی تگ و دو میں لگے رہتے اور دفتر کے امور میں چنداں دلچسپی نہ لیتے تھے انہوں نے مجھ سے بھی دو ایک بار کہا کہ میں خارجہ امور کے سیکرٹری عبدالستار اور ایڈیشنل سیکرٹری بختیار علی صاحبان سے ان کی سفارش کروں جب انہوں نے میری طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہ پایا تو وہ مشن ہی کے کاموں سے بے تعلق ہو گئے۔

عین انہی دنوں جب میں احتجاجی مراسلہ ڈارفٹ کر رہا تھا ان کا کتا بیمار پڑ گیا وہ تقریباً دس دن تک روزانہ دفتر کا تھوڑی سی دیر کے لئے ایک پھیرا کرتے اور وٹیرنری ہسپتال کا کہہ کر چلے جاتے۔ آخرکار وہ نوٹ جو سفارت کاری کے طوالت معیار سے کہیں زیادہ تھا پیش آمدہ حالات میں اپنا کام کر گیا اور موثر ثابت ہوا جناب ڈاکٹر عبید اساموا DR. OBED ASAMOA نے جو گھانا حکومت کی وزارت خارجہ کے سیکرٹری جو ہمارے وزیر خارجہ کے درجے کے برابر ہیں تحریری طور پر یقین دہانی کرائی کہ گھانا کی حکومت نے ہمیشہ اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان کی حمائیت کی ہے لہٰذا افغانستان میں صورتحال تبدیل نہ ہونے کے باعث گھانا آئندہ بھی پاکستان کی قرار داد کی حمایت کرے گا۔

اس قسم کی یقین دہانی بالمشافہ گفتگو میں تو ہو جاتی ہے مگر تحریری طور پر نہیں ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم تھا کہ گھانا کی حکومت نے تحریری طور پر وعدہ کیا اس کے باوجود گھانا کے بارے یں شکوک و شبہات کلی طور پر یقین و اعتماد میں تبدیل نہ ہو سکے۔ اس ضمن میں لندن میں ہمارے سفیر جناب شہریا ایم خان بھی خصوصی سفیر کے طور پر عکرہ تشریف لائے گھانا حکومت کی طرف سے مسٹر جسٹس JUSTICE D F AMAN نے انہیں گھانا کی حمایت کا یقین دلایا ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ بہت ہو چکا۔ اب پاکستان کو چاہئے کہ وہ افغانستان کے مسئلے کا حل تلاش کرنے میں اقوام متحدہ کی امداد کرے۔ اس وقت گھانا کے امور

خارجہ کے سربراہ ڈاکٹر پروفیسر عبید اساموا نیو یارک گئے ہوئے تھے۔ بعد میں جناب شہریار ایم خان ٹوگو چلے گئے۔ میں ان کے ہمراہ تھا۔ ٹوگو سے پھر وہ نائیجریا چلے گئے اور میری ملاقات ان سے برکینا فاسو میں ٹھہری گھانا ٹوگو اور برکینا فاسو تینوں ممالک میرے دائرہ کار میں آتے تھے۔ اور میں نے ان ملکوں میں خاطر خواہ رابطہ قائم کئے رکھا تھا برکینا فاسو کے اس وقت کے صدر جناب ٹامس سنکارا سے تو میرے ذاتی مراسم بھی تھے اس بنیاد پر مجھے یقین تھا کہ برکینا فاسو میں بھی ہمارے خصوصی سفیر کو ضرور کامیابی حاصل ہو گی چنانچہ میں شہریار صاحب کے واگا ڈوگو پہنچنے سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور ان کا انتظار کرنے لگا۔ اگلے روز پھر انتظار کیا حتی کے انتظار کرتے کرتے پانچ دن گزر گئے میرا ان سے رابطہ ہو سکا نہ انہوں نے کوئی خبر دی۔ میں ستمبر کے آخری روز گھانا واپس آگیا۔ یہاں آتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عبید اساموا سیکرٹری خارجہ اقوام متحدہ سے واپس آ چکے ہیں اور ان سے ملاقات ہو سکتی ہے میں نے فوراً دفتر خارجہ کے پروٹوکول افسر سے رجوع کیا تو اگلے روز شام ۳ بجے ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا میں عین وقت پر پہنچا تو دیکھا کہ ڈاکٹر عبید اساموا دفتر خارجہ کی سیڑھیوں پر کھڑے ہیں میرا ماتھا ٹھنکا کہ شاید وہ کہیں باہر جا رہے ہیں اس لئے ملاقات ملتوی ہو جائے گی انہوں نے مجھے خوش آمدید کیا اور مجھے ساتھ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے ان کا دفتر تیسری منزل پر واقع ہے جہاں لفٹ کے ذریعے جاتے ہیں انہوں نے بتایا کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ لوڈشیڈنگ کی وجہ سے لفٹ استعمال نہ ہو سکے گی تو انہوں نے اپنے کمرے میں انتظار کرنے کی بجائے سیڑھیوں پر میرا استقبال کیا کہ وہ سیڑھیوں کے راستے اوپر جانے میں میرا ساتھ دے سکیں کیونکہ یہ ان کے اخلاق کا تقاضہ تھا ان کے دفتر میں پہنچے تو میرا سانس پھول چکا تھا گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے میں نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔ اور یوں مدعا بیان کیا۔

میں۔ میں بڑی شدت سے آپ کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا میری حکومت گھانا کی بے لوث دوستی پر فخر کرتی ہے سالہا سابقہ کی طرح

پاکستان گھانا سے توقع کرتا ہے کہ آپ کی سربراہی میں آپ کا نمائندہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہماری قرار داد کے حق میں ووٹ دے۔

ڈاکٹر اساموا۔ ایمبیسیڈر علی شیخ خوش آمدید۔ میں ابھی ابھی اقوام متحدہ سے واپس آیا ہوں وہاں فضا بہت تبدیل ہو چکی ہے وہ ممالک بھی جنہوں نے ماضی میں آپ کے ریزولیوشن کی حمایت کی تھی اب محسوس کرتے ہیں کہ آپ افغانستان میں امریکہ کی جنگ لڑ رہے ہیں یہ آپ کی اپنی جنگ نہیں بلکہ PROXY جنگ ہے جس میں امریکہ نے آپ کو آلہ کار بنا رکھا ہے۔

میں۔ جناب آپ کے علم و تجربہ کے پیش نظر میں کیا عرض کر سکتا ہوں افغانستان ہمارا پڑوسی ملک ہے اس کی ۹۵ فیصد آبادی مسلمان ہے یہ خود مختار آزاد ملک روسی جارحیت کا شکار ہو گیا ہے اور اگر گھانا جیسے آزاد خود مختار اور غیر جانبدار ممالک نے اس غیر وابستہ ملک پر جارحیت کی مذمت نہ کی تو بڑی طاقتوں کو کھلی چھٹی مل جائے گی کہ وہ حملہ کر کے کمزور ممالک کو فتح کر لیں اور وہاں اپنی مرضی کی حکومت مسلط کر دیں۔

ڈاکٹر اساموا۔ آپ کی بات درست ہے کہ افغانستان میں روس نے فوج کشی کی ہے یہ تمام عالم کو بھی معلوم ہے کہ روس نے افغانستان پر اپنی مرضی کی حکومت مسلط کر رکھی ہے لیکن آپ کے ریزولیشن کو غور سے پڑھیں تو اس میں روسی مداخلت کا ذکر ہے نہ ہی آپ نے اس پر جارحیت کا مرتکب ہونے کا الزام لگایا گیا ہے بلکہ آپ نے تو روس کا اس ریزولیشن میں ذکر ہی نہیں کیا۔

(یہ حقیقت ہے کہ قرار داد کے متن میں روس روسی فوج اور

روسی جارحیت کا سرے سے ذکر نہیں ہے)

میں۔ افغانستان کے بارے میں ہماری قرار داد جارحیت کی مذمت کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ غیر ملکی افواج وہاں سے نکل جائیں۔ دراصل ہماری خواہش تھی کہ ہم قرار داد کو ان ممالک کے لئے بھی قابل قبول بنائیں جو روس کی مذمت نہیں کرنا چاہتے یہ علیحدہ بات ہے کہ روسی جارحیت تمام عالم پر عیاں ہے۔

ڈاکٹر اساموا۔ ہم نے کافی برس اقوام متحدہ میں یہ بات کی ہے کہ افغانستان کا مسئلہ دو سپر پاورز کے درمیان باہمی رقابت کی وجہ سے الجھا ہے امریکہ اس جنگ کی طوالت کے حق میں ہے وہ چاہتا ہے کہ وہ کمبوڈیا میں اپنی شکست کا بدلہ لے کر روس سے اپنا حساب کتاب برابر کر لے ہمارے لحاظ سے روس اور امریکہ دونوں افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے مرتکب ہو رہے ہیں روس براہ راست ملوث ہے تو امریکہ بذریعہ پاکستان اتنا ہی مجرم ہے دونوں سپر پاورز کے ہاتھوں افغانیوں کا خون بہہ رہا ہے پاکستان کو چاہیئے کہ وہ افغانستان میں امریکی مفادات کی جنگ نہ لڑے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ مجاہدین پاکستان میں اپنے اڈوں کو استعمال کرتے ہیں پاکستان کی سرزمین سے افغانستان کے اندر تک اسلحہ پہنچایا جاتا ہے اگر پاکستان اپنی سرحد بند کر دے تو افغانستان کا مسئلہ چند ہی روز میں حل ہو جائے نہ باغی عناصر کو اسلحہ ملے گا نہ ہی افرادی قوت میسر ہو گی ہم یہ چاہتے ہی کہ افغانستان کے مسئلے کا کوئی سیاسی حل نکالا جائے پاکستان کو اس زاویئے سے بھی اس پرابلم کے بارے میں سوچنا چاہیئے۔

میں آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ تھرڈ ورلڈ کا تجربہ امریکہ کے

ساتھ چنداں خوشگوار نہیں ہے امریکہ انسانیت کی فلاح اور انسانی اقدار کی حفاظت کے لئے جنگ لڑنے کا قائل نہیں خود پاکستان کے ساتھ اس نے کبھی وفا نہیں کی بلکہ آپ تو اپنی تاریخ سے واقف ہیں آپ کو احساس ہونا چاہئے کہ افغانستان کا مسئلہ حل ہوتے ہی امریکہ آنکھیں پھیرلے گا۔ اور جب روس آپ کے ساتھ کسی مسئلے پر تنازعہ کھڑا کرے گا امریکہ آپ کی امداد کرنے کی بجائے روس کی حوصلہ افزائی کرے گا۔

میں۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں آپ سے اتفاق کروں لیکن میں اتنا ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم ایک چھوٹا سا ملک ہیں ہماری سرحدوں کو ہمیشہ سے خطرہ رہتا ہے افغانستان میں روسی افواج کی مسلسل موجودگی سے ہماری سرحد بھی مزید غیر محفوظ ہو جائے گی ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ افغانستان میں ایسی حکومت کا قیام ہو جائے۔ جو اگر ہماری دوست نہ ہو تو ہماری دشمن بھی نہ ہو۔

(میں نے اس موقع پر انہیں ظاہر شاہ سے نجیب اللہ کی حکومتوں کے بارے میں مختصراً بتایا تو ان کا ردعمل یوں تھا۔)

ڈاکٹر اساموا۔ جیسا کہ آپ نے ابھی بتایا ہے افغانستان کی حکومتوں نے آپ سے کبھی تعاون نہیں کیا اس لئے موجودہ یا آئندہ آنے والی حکومتوں کے عدم تعاون سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دیگر یہ کہ افغانستان میں کون حکومت کرتا ہے یہ افغانیوں کا اپنا مسئلہ ہے آپ اس معاملے میں ملوث نہ ہوتے تو اچھا تھا۔

پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ افغانستان میں اسلحہ پاکستان کے رستے جاتا ہے اور اگرچہ امریکہ اسلحہ سپلائی کرتا ہے پاکستان اس اسلحے کو

افغانستان پہنچانے کا ذمہ دار ہے اور مجاہدین کو تقسیم کرنے کی ذمہ داری بھی اس کی ہے۔

میں۔ یہ الزام سراسر روس کا پراپیگنڈا ہے آپ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحد کا نقشہ دیکھیں۔ یہ سرحد ایسے دشوار گذار راستوں پر مشتمل ہے کہ دونوں حکومتیں اگر چاہیں بھی تو اسے سیل نہیں کر سکتیں صدیوں سے یہ سرحد عام لوگوں کے استعمال میں ہے اور وہ قیام پاکستان سے پہلے بھی بلا روک ٹوک آتے جاتے رہتے تھے۔ اب بھی کوئی شخص جو راستوں سے واقف ہے باآسانی بلا اجازت و جوازِ سفر دونوں ملکوں کے درمیان سفر کر سکتا ہے یہ درست ہے کہ امریکہ مجاہدین کو اسلحہ دیتا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ مجاہدین کے زیر استعمال اسلحہ امریکی ساخت کا ہونے کے ساتھ ساتھ چینی روسی اور اسرائیلی ساخت کا بھی ہے پاکستان اسلحے کی سپلائی میں ملوث نہیں ہے نہ پاکستان میں مجاہدین کے اڈے موجود ہیں۔

ڈاکٹر اساموا۔ آپ ہماری حکومت کا نقطہ نظر اپنی حکومت کو پہنچا دیں ہماری نظر میں عدم مداخلت کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسرے ملک کے کسی بھی معاملے میں مداخلت نہ کریں اور اس ملک کے نظام حکومت و نظام سیاست کو اس کے باشندوں پر چھوڑ دیں۔ اقوام متحدہ کے ممبران کے پاس اس امر کا ثبوت مہیا کر دیا گیا ہے کہ افغان مجاہدین کو حکومت پاکستان کی اخلاقی اور مالی امداد میسر ہے پاکستان سے مجاہدین افغانستان میں حکومتی فوجوں سے معرکہ آرا ہوتے ہیں اسلحہ لے جاتے ہیں اور زخمیوں کی دوا دارو کا انتظام بھی پاکستان کے ذمے ہے آپ کے مطابق افغانیوں کو حق خودارادیت ملنا چاہئے اگر واقعی ایسا ہی ہے تو آپ کا طرز عمل افغانیوں کے حق خودارادیت کی نفی کرتا

ہے۔

غرضیکہ ڈاکٹر عبید اساموا کے ساتھ گفتگو انہی خطوط پر چلتی رہی اس ایک گھنٹے کی گفتگو میں ڈاکٹر اساموا نے ایک دیگر پہلو پر بھی گفتگو کی اور یہ پہلو وہی ہے جس کی طرف میں نے بارہا اشارہ کیا ہے کہ ہم ووٹ مانگنے تو چل نکلتے ہیں چاہے وہ کسی بین الاقوامی عہدے کے لئے ہو یا اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں کسی قرار داد پر لیکن جونہی ہمارا کوئی دوست ملک مثال کے طور پر گھانا ہماری امداد کا طالب ہو ہم دوستی نبھانے سے پہلو تہی کرتے ہیں ہمارا ریکارڈ اس معاملے میں خاصا خراب ہے اور سفیریا سفیر خصوصی کو شرمسار ہونا پڑتا ہے۔

بالاخر میں نے ان سے رخصت چاہی میں مایوس قطعاً نہ تھا کیونکہ نئے سال کی ایک تقریب میں صدر مملکت جناب جیری جے رالنگ نے واشگاف الفاظ میں کیا تھا کہ وہ جارحیت کو قابل مذمت قرار دیتے ہیں جہاں کہیں بھی ہو۔ جیسی بھی ہو۔ انہوں نے مزید فرمایا تھا کہ وہ افغانستان میں روسی اور نکاراگوا میں امریکی جارحیت کی یکساں شدت سے مذمت کرتے ہیں اس لئے مجھے بخوبی احساس تھا کہ سیکرٹری خارجہ کی گفتگو کے باوجود حکومت گھانا اقوام متحدہ کے اجلاس میں ہماری قرار داد کی حمایت کرے گی۔ ابھی ہماری قرار داد پر ووٹنگ چند روز بعد ہونی تھی اس دوران کچھ بھی ہو سکتا تھا بہرحال رخصت چاہتے ہوئے میں نے ڈاکٹر اساموا سے کہا۔

"میں آپ کے نظریات اور آپ کی حکومت کی رائے سے اپنی حکومت کو مطلع کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں آپ کی گفتگو من و عن رپورٹ کروں گا لیکن پھر بھی میری حکومت یہ معلوم کرنا چاہے گی کہ جنرل اسمبلی میں آپ کا ووٹ کس طرف ہو گا"۔ ڈاکٹر اساموا میری بات سن کر ہنس پڑے انہوں نے کہا ایمبسڈر شیخ آپ ہمارے جذبات اور رائے سے حکومت پاکستان کو آگاہ کریں یہ بھی کہیں کہ افغانستان کے مسئلے کا سیاسی حل بھی ضروری ہے رہا ووٹ کا سوال تو میں نے پہلے ہی اپنے

دستخطی خط میں آپکو مطلع کر رکھا ہے کہ آپ کے ریزولیوشن پر ہماری پالیسی سابقہ برسوں کے برعکس نہ ہو گی اور جب تک افغانستان سے روسی جارحیت ختم نہیں ہو جاتی ہم آپ کے ریزولیوشن کی حمایت کرتے رہیں گے۔

نتیجے کے لحاظ سے یہ ملاقات تو مثبت رہی لیکن ڈیڑھ گھنٹے کی گفتگو خاصی طویل اور اعصاب شکن تھی۔

قصہ مختصر گھانا حکومت نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ووٹ تو پاکستان کی قرار داد کے حق میں دیا لیکن ووٹ دینے سے پہلے گھانا کے نمائندے نے اپنی تقریر میں امریکہ اور پاکستان کے موقف کی دھجیاں اڑا دیں اس سے صاف ظاہر تھا کہ حکومت گھانا کی ہدایات کے مطابق نمائندے نے ووٹ تو پاکستان کی قرار داد کے حق میں دیا مگر اپنا موقف وہی پیش کیا جو گھانا کے مزاج کے مطابق تھا اور خود مختار آزاد ملک کی خارجہ پالیسی کا مظہر تھا اقوام متحدہ میں ہمارا مشن بالکل موثر نہ ہو سکا تھا اس نے ووٹ جارحیت کی مذمت کرتے ہوئے دیا تھا۔

مقامی طور پر رواں سال میں مجھے بہت محنت کرنا پڑی برطانیہ' امریکہ' کینیڈا' یورپین کمیونٹی' سعودی عرب' چین' جاپان اور امریکہ کے ہائی کمشنروں اور سفیروں سے میرا مسلسل رابطہ قائم رہا کوئی دن نہ جاتا تھا جب ان ساتھیوں میں سے کوئی نہ کوئی گھانا کے دفتر خارجہ سے رابطہ قائم نہ کرتا۔ روزانہ رپورٹ مجھے شام تک مل جاتی تھی اور یوں گھانا کی حکومت نے جس کے ووٹ کے بارے میں پاکستان کا دفتر خارجہ شکوک و شبہات میں مبتلا تھا جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ہماری قرار داد کے حق میں ووٹ دے کر ہمیں اپنی دوستی اور حمایت کا مزید ثبوت مہیا کیا۔

برطانیہ میں ہمارے سفیر جناب شہریار ایم خان کو وزیر اعظم نے افغانستان کے

مسئلے پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۱۹۸۷ء میں ہونے والے اجلاس میں ہماری قرار داد کے حق میں ووٹ لینے کے لئے خصوصی سفیر نامزد کیا تھا منجملہ دیگر افریقی ممالک کے انہیں گھانا ٹوگو اور برکینا فاسو کا دورہ بھی اس مقصد کے لئے مکمل کرنا تھا۔ یہ تینوں ممالک میرے دائرے کار میں شامل تھے۔ یہ بات عین مناسب تھی اور شاید میری یہ ذمہ داری بھی تھی کہ ان کے لئے ان تینوں ملکوں کے دورے کے انتظامات کروں۔ ان کے پروگرام کے مطابق انہیں نائیجریا کے دارالحکومت "لے گاس" میں ایک کانفرنس میں یکم یا دو ستمبر ۱۹۸۷ء میں شریک ہونا تھا چنانچہ وہ جب وہاں سے فارغ ہوئے تو انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور بتایا کہ وہ تین ستمبر تک عکرہ پہنچ جائیں گے ان ایام میں مسٹر جسٹس انن پی۔ این۔ ڈی۔ سی کے رکن ہی بیرونی ممالک سے آنے والے مقتدر حضرات سے گھانا حکومت کی جانب سے ملتے تھے چار ستمبر کی رات کو ان سے ہماری ملاقات کا پروگرام طے پا گیا جب میں نے دیکھا کہ مسٹر شہریار تین ستمبر کی رات کی پرواز سے نہیں آئے تو میں نے چار ستمبر کی صبح کو ان سے فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر لائن کی خرابی سے نہ مجھے ان کی کوئی کال مل سکی نہ میری کال انہیں ملی وہ بذات خود بیحد پریشان تھے اور لے گاس سے عکرہ کے لئے فون پر مسلسل کوشش کرتے رہے آخر کار لندن سے اطلاع آئی کہ گھانا ایئرویز کی جس پرواز پر وہ لے گاس سے عکرہ آرہے تھے وہ اس پر سوار ہونے سے رہ گئے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ لے گاس سے عکرہ آنے کے لئے جناب شہریار بروقت ایئرپورٹ پہنچ گئے تھے اور جہاز کا انتظار کرتے رہے مگر جہاز نہ آیا کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد جب استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ گھانا ایرویز کا جہاز لے گاس سے OVER FLY کر کے گھانا بھی پہنچ چکا ہے۔ اس طرح یہ جہاز اپنی آمد کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے عکرہ پہنچ گیا جب ہم لوگ ان کے استقبال کے لئے مقررہ وقت پر ایئرپورٹ پہنچے تب اصل بات کا پتہ چلا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ گھانا ایئرویز نے اوورفلائی کی یہ حرکت کچھ پہلی بار نہ کی بلکہ اس کا یہ معمول بن چکا ہے

اور یہ کہ اوورفلائی کی یہ حرکت صرف "گھانا ایئرویز" ہی تک محدود نہیں دوسرے ایئرلائن والے بھی ایسا ہی کرتے رہتے ہیں مثلاً میرا تجربہ بھی "مصر الطیران" کے ساتھ کچھ زیادہ مختلف نہ تھا قاہرہ جانے کے لئے مصری ایئرلائن کا جہاز عکرہ لے گاس LAGOS کانو KANO اور قاہرہ CAIRO کا راستہ اختیار کرتا ہے لے گاس نائیجیریا کی ایئرپورٹ ہے نائیجیریا کے شمال میں دوسری ایئرپورٹ کانو ہے بارہا ایسا ہوا کہ EGYPT AIR کی پرواز کانو سے اوورفلائی کر گئی اور مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے قاہرہ پہنچ گئی۔

قصہ مختصر جناب شہریار ایم خان لے گاس سے اپنے پروگرام کے مطابق عکرہ نہ پہنچ سکے اب انہوں نے لندن کے راستے اپنا پروگرام دیا جس کے مطابق انہیں آٹھ ستمبر کی شام کو عکرہ پہنچنا تھا اور وہاں سے روانگی لے گاس کے لئے گیارہ ستمبر کی صبح کو ٹھہری میں نے پروٹوکول کی مدد سے ان کی ملاقات دفتر خارجہ میں ہر سطح کے افسروں سے ۹ ستمبر کے لئے طے کر دی۔ ۱۰ ستمبر کو ان کے اعزاز میں ایک ڈنر کے دعوت نامے بھی دوست ممالک کے سفیر صاحبان اور پروٹوکول کے چیدہ چیدہ افسران کو بھجوا دیئے۔ میں نے ان انتظامات کو مکمل کر کے ابھی اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ شہریار ایم خاں کی طرف سے پیغام آگیا کہ وہ بجائے آٹھ تاریخ کے ۶ تاریخ کو عکرہ آ رہے ہیں۔

اور ۷ کو وہ دفتر خارجہ میں سیکرٹری امور خارجہ اور ڈاکٹر عبید اساموا سے ملاقات کریں گے پروگرام تبدیل ہو جانے پر فوری طور پر جب متعلقہ احباب سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے مثبت جواب دیا اور اس طرح شہریار صاحب کی ملاقاتیں ۷ ستمبر کے لئے طے ہو گئیں۔ اب اس طرح ڈنر کا اہتمام بھی دس تاریخ کے بجائے سات تاریخ پر ملتوی ہو گیا کیونکہ شہریار صاحب آٹھ تاریخ کو لے گاس جانے پر مصر تھے ناسپاس گذاری ہو گی اگر یہ نہ کہوں کہ اس تمام رد و بدل میں گھانا کے محکمہ خارجہ۔ پروٹوکول اور سفیر صاحبان نے مجھ سے بیحد تعاون کیا۔ اور پروٹوکول نے پروگرام کی

تبدیلی کو خوشدلی سے قبول کیا مزید یہ کہ ہمارے خصوصی سفیر کی سہولت کے پیش نظر اور سفر کے پروگرام کے مطابق دفتر خارجہ میں قائمقام ڈائریکٹر‘ نے (D.F ANNAN ممبرپی- این- ڈی- سی کے ساتھ ملاقات کا بندوبست کر دیا سفیر (MR. JUSTICE صاحبان نے مجھ سے اس طرح تعاون کیا کہ سب حضرات نے بلااستثنا ڈنر میں شرکت کی- یہ ڈنر آٹھ بجے سے بارہ بجے رات تک جاری رہا اور جناب شہریار ایم خان نے اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ افغانستان کے بارے میں پاکستان کے موقف کی بات کی انہوں نے اس موقع پر دوسرے ممالک کے دوروں کے بارے میں بھی اپنے تاثرات پیش کئے اور عالمی مسائل پر اظہار خیال کر کے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بہت اچھے اثرات ذہنوں پر مرتب کئے-

اگلی صبح یعنی ۸ تاریخ کو لے گاس کے لئے گھانا ایرویز AIR WAYS GHANA کی پرواز کا وقت ۳۰ - ۱۰ مقرر تھا لہٰذا ہم لوگ ۳۰ - ۹ کے قریب وی- آئی- پی لاونج میں پہنچ گئے جہاں پریس- ٹی-وی- پروٹوکول کے علاوہ ڈاکٹر محمد ابن چمباس MUHMMAD IBNE CHAMBAS پی- این- ڈی- سی ڈپٹی سیکرٹری امور خارجہ پہلے سے موجود تھے- پریس کے ساتھ ہمارے سفیر خصوصی مسلسل گفتگو کرتے رہے پاکستان اور گھانا کے درمیان تعلقات کے بارے میں سیر حاصل گفتگو ہوئی پریس والے یہ جاننے کے لئے بے تاب تھے کہ پاکستان گھانا کے لئے کیا کر رہا ہے اور کیا کر سکتا ہے لیکن وہ کوئی مثبت بات ہمارے سفیر خصوصی سے نہ اگلوا سکے- دراصل ہم نہ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ کچھ کرنے کی نیت ہے تو وہ جواب کیا دیتے-

گھڑی نے ساڑھے دس بجا دیئے مگر فلائٹ کا ابھی تک اعلان ہی نہ ہوا تھا اس عرصے میں سامان چیک ان ہو چکا تھا بورڈنگ کارڈ بھی مل چکا تھا مگر جہاز کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا کوئی گیارہ بجے کے قریب وی- آئی پی لاونج میں یہ اطلاع ملی کہ جہاز کی جس پرواز سے شہریار خاں صاحب کو روانہ ہونا تھا وہ سینگال ہی میں منسوخ ہو چکی ہے نہ کوئی دیگر پرواز اس روز لے گاس کے لئے دستیاب ہے

معلوم ہوا کہ اگلے روز بھی کوئی پرواز نہ مل سکے گی۔ لہٰذا چارو ناچار محترم سفیر خصوصی کو ابھی دو دن تک عکرہ میں ٹھہرنا پڑے گا انہیں اپنے پروگرام کے مطابق پہلے لے گاس سے بنین پہنچنا تھا۔ اب لے گاس کے لئے ان کی روانگی ناممکن تھی اس لئے ایئرپورٹ ہی پر یہ پروگرام بنا لیا گیا کہ دو روز عکرہ میں ضائع کرنے کی بجائے ٹوگو چلنا چاہئے ایئرپورٹ سے ہم سیدھے دفتر آئے اور وہاں سے ٹیلکس کے ذریعے ٹوگو کے دفتر خارجہ اور پروٹوکول سے طے شدہ پروگرام میں تبدیلی ہو جانے پر معذرت کرتے ہوئے اسی روز ٹوگو پہنچنے کی اطلاع دی یہ درخواست بھی کی کہ آمد کے اگلے روز وزیر خارجہ اور صدر مملکت سے ملاقات کے لئے وقت لیا جائے ہم نے اس پروگرام کے متعلق گھانا میں ٹوگو کے چارج ڈی افیرز یعنی ناظم الامور کو مطلع کر دیا یہ تمام انتظامات مکمل کرنے کے بعد ہم بذریعہ کار ٹوگو کے لئے چل پڑے کوئی دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم ٹوگو کے صدر مقام لومے LOME پہنچ گئے پہلے ہم ٹوگو کے دفتر خارجہ گئے پھر وہاں سے پروٹوکول دفتر آ گئے جہاں چیف آف پروٹوکول سے ہماری ملاقات ہوئی انہوں نے وعدہ کیا کہ اگلے روز صبح دس بجے ٹوگو کے وزیر خارجہ اور کیبنٹ کے سیکرٹری کے ساتھ بھی انشاء اللہ تعالیٰ ہماری ملاقات ہو جائے گی۔

دوسرے دن پروگرام کے مطابق ہم لوگ وزارت خارجہ کے دفتر پہنچ گئے جہاں کیبنٹ سیکرٹری سے جو خود بھی ایک وزیر ہیں ہماری بڑی تفصیل سے ملاقات ہوئی اور عین توقع کے مطابق انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ افغانستان کے مسئلے پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ٹوگو کا رویہ ہمارے ریزولیوشن کے بارے میں حسب سابق مثبت رہے گا میری دانست کے مطابق سابقہ تجربے کی روشنی میں ٹوگو کی جانب سے یہ پختہ یقین دہانی کافی تھی لیکن سفیر خصوصی کے پاس وزیر اعظم کی جانب سے ایک خط اسی مسئلے پر محفوظ تھا جو وہ چاہتے تھے کہ وہ خود اسے صدر مملکت جنرل ایڈما EYEDMA GEN. کی خدمت میں پیش کریں ان کی دوپہر کی ملاقات وزیر خارجہ سے طے تھی اور امید تھی کہ صدر مملکت انہیں شام کو یا رات کو ملاقات کا شرف بخشیں گے بعد از

دوپہر وزیر خارجہ سے تو ملاقات ہو گئی جو نتیجے کے اعتبار سے مثبت رہی مگر صدر مملکت سے ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ وہ ویک اینڈ گزارنے بذریعہ ہیلی کاپٹر اپنے گاؤں چلے گئے اور چیف آف پروٹوکول سے کہہ گئے کہ وہ پاکستان کے سفیر اور خصوی سفیر سے سوموار کو ملیں گے جب یہ بات شہریار خان کے علم میں آئی تو وہ بہت مضطرب ہوئے اور سوچنے لگے کہ عکرہ سے لومے کے لئے بھاگ کر جو دو دن بچائے تھے وہ ضائع ہو گئے اب صدر مملکت کی طرف سے یہ اطلاع آنے کے بعد لومے سے واپس جانا کسی طرح بھی مناسب نہ تھا مجبوراً وہیں قیام کیا اور سوموار کو صدر مملکت سے ملاقات ہو گئی۔ جس میں ہمارے خصوصی سفیر نے بڑی قابلیت سے غیر مبہم الفاظ میں پاکستان کا موقف بیان کیا جس پر جوابی تقریر میں صدر مملکت نے نہایت کھلے انداز میں پاکستان کے موقف کی حمایت کا اعلان کیا اور کہا کہ پاکستان کسی بھی مسئلے پر کسی بھی وقت ٹوگو کی حمایت پر بھروسہ کر سکتا ہے۔

ملاقات کے بعد پریس اور ٹی وی نے اس ملاقات کو پورا کوریج دیا اور اگلے روز ملکی اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ اس ملاقات کی تفصیلات شائع کیں۔

مذکورہ ملاقات میں جناب شہریار خاں نے صدر مملکت سے ذکر کیا کہ پاکستان کے سفیر کو ابھی تک سرکاری طور پر اپنی اسناد سفارت پیش کرنے کا موقع نہیں ملا۔ شہریار صاحب کی اس بات سے صدر مملکت بہت محظوظ ہوئے اور بولے کہ اس کے بغیر بھی ایمبیسڈر شیخ ہمارے پاس آتے ہیں اور ہمیشہ ہمارا ووٹ لے جاتے ہیں۔ اور ہم ان کے بے تکلف انداز کو پسند کرتے ہیں۔ اب چونکہ باتوں باتوں میں صدر مملکت کو اسناد سفارت سے متعلق توجہ دلا دی گئی تھی اس لئے انہوں نے پروٹوکول اور وزیر خارجہ کو ہدایات جاری کر دیں کہ رسمی تقریب کا جلد اہتمام کیا جائے تاکہ ایمبیسڈر شیخ اپنی اسناد سفارت پیش کر سکیں۔

اس سے اگلے روز شہریار خانصاحب کار کے ذریعے بینن کے دارالحکومت کوتونو KOTOUNO کی جانب روانہ ہو گئے۔ وہ چونکہ میرے سفارتخانے کی کار لے کر

گئے تھے اس لئے مزید سواری کا انتظام نہ ہو سکنے کے باعث مجھے لومے میں ایک رات مزید رہنا پڑا۔ شام کو کار واپس آ گئی تو میں اگلے روز گھانا واپس آیا کیونکہ گھانا اور ٹوگو کے درمیان سرحد چھ بجے شام کو بند ہو جاتی ہے۔ اور کار بینن سے چھ بجے شام کے بعد واپس آئی تھی۔

الغرض اگلے روز میں گھانا پہنچ گیا۔ یہ ایک دن میری سفارتی مصروفیات کے لحاظ سے فالتو تھا جو میں وہاں رہا لیکن لومے میں رات بسر کرنے کی مجبوری تھی جس کی وجہ میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی میں نے یہ مناسب خیال نہیں کیا کہ خصوصی سفیر لومے سے کوتونو ٹیکسی کے ذریعے سفر کریں اس لئے میں نے انہیں اپنی کار سونپ دی اور خود انتظار میں بیٹھ گیا۔ جب گاڑی واپس آئی تب میں گھانا آ سکا۔ خصوص سفیر کو اس معاملے میں اپنے اوپر ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت کوتونو جانے کے لئے کوئی فلائٹ بھی نہ مل سکتی تھی دراصل اس روز سرے سے کوئی فلائٹ تھی ہی نہیں۔ پھر یہ کہ اگلے روز صبح سویرے انہیں بینن کے صدر سے بھی ملنا تھا اس لئے پروگرام سے ایک روز پہلے ان کا وہاں پہنچنا ضروری تھا۔

لیکن میں جو لومے میں ایک روز مزید ٹھہرا تو وزارت امور خارجہ اور خزانہ کے قواعد کے خلاف تھا۔ جمعرات کو ہم لومے پہنچے تھے سوموار کی شام کو سفیر خصوصی لومے سے کوتونو چلے گئے اور منگل کے دن میں عکرہ واپس آ گیا۔ اپنے مستقر سے کل چھ دن باہر رہا جبکہ قواعد کے مطابق مجھے پانچویں دن واپس آ جانا چاہئے تھا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا پہلے سے خدشہ تھا۔ اگلی ڈاک میں چیف اکاؤنٹس افسر کے ہاں سے چھٹے دن قیام کرنے پر اعتراض آ گیا اور حکم ہوا کہ فالتو دن کا ڈیلی الاؤنس مجھ سے وصول کیا جائے۔ اگرچہ اس ضمن میں چھٹے روز تک اپنے مستقر سے باہر قیام کرنے کی میں نے تفصیل سے وضاحت کر دی تھی لیکن اعتراض برابر قائم رہا۔

بعد از خرابئ بسیار غالباً خصوصی سفیر شہریار کی رپورٹ پر جس سے چھٹے روز تک لومے میں میرے قیام کرنے کی بخوبی وضاحت ہو گئی ہو گی یہ اعتراض جاتا رہا۔ مگر اس

سے جو مجھے ذہنی کوفت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔

لومے سے روانہ ہونے سے پہلے خصوصی سفیر شہریار سے یہ طے پایا تھا کہ ہم برکینا فاسو BURKINA FASO دو ہفتے تک پہنچیں گے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں ایک دن پہلے ہی واگہ ڈوگو OUAGA DOUGO پہنچ گیا۔ اگلے روز جناب شہریار کے لئے گاڑی بھیجی گئی مگراس روز جہاز نہیں آیا۔ پھر بار بار گاڑی بھیجی گئی کہ شاید اگلے جہاز سے آجائیں لیکن ہربار گاڑی خالی واپس آئی۔ چیف پروٹوکول افسر نے مجھے بتایا کہ صدر مملکت کیپٹن ٹامس سنکارا کی ہدایت کے مطابق اگر سفیر خصوصی جناب شہریار ہفتے کے دن بھی پہنچ جائیں تو انہیں مطلع کیا جائے۔ کہ پاکستان اور برکینا فاسو کے درمیان نئے دوستانہ تعلقات کی رعایت سے صدر مملکت ان سے اتوار کو بھی ملاقات کرلیں گے۔

چیف آف پروٹوکول کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی کیونکہ اس کی ہفتے اور اتوار کی چھٹی غارت ہو جاتی ہے۔ یہ مجھے معلوم ہوا کہ اگرچہ صدر مملکت ویک اینڈ پر گاؤں کی طرف نکل جاتے ہیں مگر جب انہیں خصوصی سفیر کے آنے کی اطلاع ملے گی تو وہ اپنا ارادہ ملتوی کر دیں گے اور اتوار کو ملاقات کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے مگر کسی وجہ سے خصوصی سفیر جناب شہریار نہ آسکے اور میں چند روز قیام کر کے واپس آ گیا۔

دراصل افریقہ میں سفر کے لئے کوئی ڈھنگ کا نظام اور ذریعہ نہیں سڑک کے ذریعے سفر طویل اور دشوار گزار ہے۔ سینگال سے ایک سڑک افریقن ہائی وے کے نام سے دس سال کے عرصے سے بن رہی ہے۔ اس کے مختلف سیکٹر ہیں۔ بے حد سست رفتاری سے سڑک تعمیر ہو رہی ہے لیکن جتنی بنی ہے بے حد عمدہ اور مضبوط ہے۔ باقی حصے جو ہنوز بن رہے ہیں مزید دس سال میں مکمل ہوں گے۔ دوسرا ذریعہ سفربذریعہ ہوائی جہاز ہے مغربی افریقہ کے لئے دوسرے ممالک سے بین الاقوامی پروازیں کافی ہیں مثلاً کے ایل۔ ایم برٹش ایرویز، سوس ایر، ایر فرانس،

مصر ایطران' ایئر افریقہ کے علاوہ دوسری ایئر لائینس بھی اس علاقے کو دنیا سے ملاتی ہیں۔ لیکن مغربی افریقی ممالک کے درمیان رابطہ گھانا ایئر لائنز کے ذریعے ہی آسان ہے۔ SIERRA LEONE سیرالیون کے پاس ایک ہی جہاز تھا مگر وہ بھی اتنی خراب حالت میں تھا کہ اس کی کسی طرح بھی مرمت نہیں کی جا سکتی تھی اور وہ سیرا لیون کی ایئرپورٹ پر ہی کھڑا رہتا۔ گھانا ایئر لائنز مغربی افریقہ کے ممالک کے درمیان فوکر فرینڈ شپ چلاتی ہے اور اس کے پاس بھی تین چار ہی جہاز ہیں۔

بین الاقوامی خطوط پر لندن براستہ فرینکفرٹ اور پیرس کے لئے ہفتہ وار پروازیں بھی ہیں۔

ایئر وفلوٹ کی مہینے میں صرف ایک پرواز ہوتی ہے۔ بلکان BALKAN ایئرلائن کی بھی مہینے میں پرواز ایک بار ہے پی۔ آئی۔ اے کی اس خطے میں کوئی پرواز نہیں۔ پاکستان سے مغربی افریقہ جانے کے لئے کسی اور ایئرلائن کو بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ الغرض اس خطے میں سفر کرنے کے لئے تو چانس لینا پڑتا ہے یعنی جو پرواز بھی مل جائے غنیمت ہے اور اس کے لئے ذہنی طور پر تیار رہنا پڑتا ہے کچھ ایسا ہی معاملہ جناب شہریار ایم خان کو بھی پیش آیا میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ کہ انہوں نے اس سے پہلے کبھی افریقہ میں سفر کیا ہو لیکن مغربی افریقہ میں تو یقیناً ان کا یہ پہلا سفر تھا۔ نہ معلوم وہ کہاں پھنس کر رہ گئے اور برکینا فاسو نہ پہنچ سکے۔

میرے ذرائع نے مجھے بتایا تھا کہ کامریڈ کیپٹن ٹامس سنکارا کو اگر مناسب طریقے سے بریف کیا جائے تو افغانستان کے مسئلے پر مثبت ووٹ مل جائے گا پچھلے سال ۱۹۸۶ء میں برکینا فاسو نے ہمارے ریزولیوشن کے خلاف ووٹ دیا تھا ہوا یوں کہ جنرل اسمبلی کے اجلاس سے تھوڑا عرصہ پہلے گورباچوف کی دعوت پر کیپٹن کامریڈ سنکارا روس کے دورے پر تشریف لے گئے تھے معتبر ذرائع کے مطابق گورباچوف نے اپنی گفتگو کے دوران سرسری طور سے ذکر کیا تھا کہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ سویٹ یونین اور برکینا فاسو نظریاتی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں لیکن افغانستان کے مسئلے پر ووٹ

جنرل اسمبلی میں سوویٹ یونین کے موقف کے خلاف جاتا ہے۔ اس پر کامریڈ سنکارا پریشان ہو گئے اور یوں ۱۹۸۵ء کے مقابلے میں ۱۹۸۶ء میں ووٹ ہماری قرارداد کے خلاف چلا گیا۔ کامریڈ سنکارا ۱۹۸۳ء میں برسر اقتدار آئے تھے۔ اگلے تین برسوں میں انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ استحصالی قومیں صرف مغربی سامراج تک ہی محدود نہیں بلکہ سوویٹ یونین اور اس کے حواریوں کو برکینا فاسو اور اس کے حکمرانوں کے نظریات کے ساتھ کم ہی واسطہ ہے بلکہ اصل دلچسپی تو برکینا فاسو کی معدنیات سے ہے۔ سونا' تانبہ' مینگانیز جیسی قیمتی دھاتیں اس غریب ملک میں افراط سے ہیں اور مغرب و مشرق کی نظریں ان معدنیات پر ہیں کامریڈ سنکارا کو لائن پر رکھنے کے لئے مختلف ملکوں نے کافی تگ و دو کی لیکن بحیثیت ایک قومی رہنما اور لیڈر کے وہ ۱۹۸۷ء میں اپنے قتل تک اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ ان کے ملک کی دولت صرف اس کے باشندوں کے لئے ہے۔ نظریاتی دوستی کا تقاضا ان کے نزدیک یہ تھا کہ ان کے دوست ممالک برکینا فاسو کا استحصال نہ کریں۔ بلکہ انسانی جذبے کے تحت ان کی امداد کریں جس کا فائدہ ان کی قوم کو پہنچ سکے۔ کامریڈ سنکارا آئیڈیلسٹ تھے۔ اس لئے وہ ملک و قوم کی بہبودی اور ترقی کو تمام کاموں پر ترجیح دیتے تھے انہیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مشرق و مغرب کے ممالک کے درمیان استحصال کرنے میں کوئی زیادہ فرق نہیں میری ان سے ملاقاتیں رہیں۔ میں نے انہیں ایک مخلص' بے لوث اور صاف دل انسان پایا۔ وہ دو ٹوک اور صاف صاف بات کرنے کے عادی تھے۔ ۱۹۸۳ء میں جب انہوں نے اپنے ملک کی باگ ڈور سنبھالی وہ ایک نوجوان آدمی تھے۔ اس وقت ان کی عمر بمشکل تمام تیس برس تھی۔

کامریڈ سنکارا ذاتی طور پر گھانا کے سربراہ فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ سے بے حد متاثر تھے۔ وہ انہیں اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے اور ان کے جیری جے رالنگ سے اتنے گہرے اور بے تکلفانہ مراسم تھے کہ نجی ملاقاتوں میں گفتگو کرتے ہوئے انہیں "بڑا بھائی" کہہ کر ہی مخاطب ہوتے تھے۔ دو ہمسایہ ملکوں کے سربراہوں کے درمیان یہ

ایک مثالی دوستی تھی۔ گھانا چونکہ خود بھی استحصالی قوتوں سے برسرپیکار رہا ہے اور اب بھی ہے اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ جب کامریڈ سنکارا کو اپنے اردگرد استحصالی قوتیں ہی چھائی ہوئی نظر آئیں وہ ان سے بددل ہو گئے نیز بڑی طاقتوں کے درمیان ایک نئی ابھرتی ہوئی منی پاور MINI POWER سے بھی وہ الرجک تھے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ انہوں نے برکینا فاسو کے لئے جو راستہ ڈھونڈا کیا اسے ROAD MIDDLE OF THE کہا جا سکتا ہے۔ یہ مشکل کام تھا۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۶ء تک وہ اس راستے کو ڈھونڈتے رہے۔ افریقہ استحصالی قوتوں کی سازشوں کا شکار تھا۔ اگرچہ تمام ممالک آزاد ہو چکے تھے اور غلامی کے دور سے نکل کر آزادی کے دور میں بتدریج داخل ہوئے لیکن سامراجی طاقتوں نے انہیں اقتصادی غلامی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ چنانچہ کامریڈ سنکارا کا فارمولا صرف اور صرف یہ تھا کہ افریقہ غلامی سے اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہ اقتصادی طور پر مضبوط نہ ہو گا۔ ساؤتھ ساؤتھ کوآپریشن SOUTH SOUTH COOPERATION کو وہ محض ایک کھوکھلا نعرہ سمجھتے تھے اور دو مملکتوں کے درمیان دو طرفہ تعلقات پر یقین رکھتے تھے بشرطیکہ دونوں کے تعلقات باہمی عزت اور وقار پر مبنی ہوں اور دونوں ملک ایک دوسرے کے ساتھ مساوی طور پر اشتراک عمل کے لئے تیار ہوں اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ اور ایک دوسرے کا استحصال نہ کریں۔

کامریڈ سنکارا پاکستان کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے بڑے مخدوش اور نامساعد حالات کے باوجود ترقی کی ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں اسے کامیابی نصیب ہوئی ہے وہ اس بات کو بھی سراہتے کہ پاکستان میں جمہوریت اور آمریت کے درمیان آنکھ مچولی ہوتے ہوئے بھی ترقیاتی کام جاری رہے ہیں۔

وطن عزیز میں زراعت، صنعت، صحت اور تعلیم کے شعبوں میں جو ترقیاتی کام ہوئے ہیں ان سے کامریڈ سنکارا بہت متاثر تھے۔ روس۔ امریکہ۔ برطانیہ۔ بھارت اور

کیپٹن کمپاری صدر مملکت برکینا فاسو اور سفیر پاکستان   الوداعی ملاقات پر

ان کے حواریوں سے وہ الرجک تھے تین برس کے تلخ تجربات نے انہیں سکھا دیا تھا کہ یہ ممالک ان کی معدنیات کو تو استعمال میں لانا چاہتے تھے مگر وہ مقامی باشندوں کو اس سے حاصل ہونے والے مفادات میں حصہ دار نہیں بنانا چاہتے تھے۔

کامریڈ سنکارا نے کوشش کی کہ برکینا فاسو کی ترقی کے پروگرام میں پاکستان اس کا ہاتھ بٹائے اور اس خواہش کا اظہار انہوں نے جنرل ضیاء الحق سے ایک ملاقات میں کیا تھا۔ لیکن اس بارے میں پاکستان کی جانب سے کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔

برکینا فاسو میں روئی کافی مقدار میں ہوتی ہے مگر مقامی طور پر اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اس غریب ملک کو دو ٹیکسٹائل یونٹوں کی ضرورت تھی۔ او۔ آئی۔ سی کی میٹنگ کے موقع پر دونوں ملکوں کے سربراہوں کی ملاقات پر جنرل ضیاء الحق مرحوم نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ٹیکسٹائل یونٹ مہیا کر دیں گے۔ مگر کامریڈ سنکارا کی طرف سے بار بار یاد دہانیوں کے باوجود ہم نے اس کے لئے کچھ نہ کیا۔ اسی طرح کامریڈ سنکارا کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ برکینا فاسو کے دار الحکومت واگہ ڈوگو میں سڑکیں بنانے میں پاکستان امداد کرے مگر صدر ضیاء الحق مرحوم نے دو ٹوک جواب دے دیا اور کہا کہ سڑکیں بنانے کے معاملے میں تو خود پاکستان مسائل سے دوچار ہے اس لئے وہ کچھ نہ کر سکیں گے۔ کامریڈ سنکارا اس بات سے خوش تھے کہ صدر ضیاء الحق نے ان سے کوئی جھوٹا وعدہ نہ کیا تھا۔

میری ایک ملاقات کے دوران کامریڈ سنکارا نے اس بات کی تعریف کی کہ جنرل محمد ضیاء الحق نے صاف گوئی سے کام لیا اور امید ظاہر کی کہ برکینا فاسو میں پاکستان دو ٹیکسٹائل یونٹ ضرور لگائے گا۔ پاکستان کے ساتھ تعلقات کو استوار کرنے کے لئے کامریڈ سنکارا بے حد کوشاں رہے وہ ۱۹۸۳ء میں برسر اقتدار آئے تھے تین چار برس میں انہیں بخوبی معلوم ہو گیا کہ کوئی بھی ملک اپنے قومی مفادات کو نظر انداز کر کے برکینا فاسو کی ترقی میں مدد بہم پہنچانے کے لئے تیار نہیں۔

پاکستان کے ساتھ روابط قائم کرنے اور تعلق بڑھانے کا خیال ان کا اپنا تھا اب

وہ تیار تھے کہ وہ آئندہ جنرل اسمبلی کے اجلاس میں افغانستان کے مسئلے پر اپنی پالیسی کا ازسرنو تعین کریں۔ چنانچہ مجھے قوی امید تھی کہ اس مرتبہ برکینا فاسو اپنے سابقہ فیصلے پر نظرثانی کرے گا اور ہماری قرار داد کے حق میں ووٹ دے گا میرا اندازہ تھا کہ جناب شہریار ایم خان ہمارے سفیر خصوصی جو اس مہم پر نکلے ہیں کی کامریڈ سنکارا سے ملاقات ہو جائے گی تو اس مسئلے پر زیادہ حتمی انداز میں بات ہو جائے گی کیونکہ صدر جنرل جناب ضیاء الحق کے ساتھ کامریڈ سنکارا کی ایک ملاقات میں جناب شہریار بھی موجود تھے لیکن جناب شہریار جب برکینا فاسو نہ پہنچ سکے تو میں عکرہ واپس آ گیا صدر مملکت سے تن تنہا ملاقات کرنا میں نے مناسب نہ جانا میں نے اس سلسلے میں اسلام آباد لکھا جس کا جواب چند روز میں آیا کہ جناب شہریار نے افریقہ کا باقی پروگرام منسوخ کر دیا ہے اور اب وہ لندن واپس پہنچ چکے ہیں۔

میں فکر مند ہوا کہ برکینا فاسو سے مثبت اشارے ملنے کے باوجود ہم دفتر خارجہ اور کامریڈ سنکارا سے کوئی رابطہ قائم نہ کر سکے حالانکہ افغانستان کے مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر ضروری تھا کہ رابطہ قائم کیا جاتا۔ مجھے دفتر خارجہ سے کوئی رہنمائی حاصل نہ ہو سکی کیونکہ سب کے سب پالیسی وضع کرنے والے افسر عازم نیویارک ہو چکے تھے۔

وسط اکتوبر کی بات ہے کہ رات کے گیارہ بجے کی خبروں میں بی بی سی نے بتایا کہ برکینا فاسو میں انقلاب برپا ہو چکا ہے کامریڈ سنکارا کا کوئی علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ اور انقلاب برپا کرنے والے فوجی اب کیپٹن کمپاری BLLAISE COMPARE CAPTAIN کی قیادت میں کامریڈ سنکارا کے حامی فوجیوں سے لڑ رہے ہیں۔ مگر اصل صورتحال یہ تھی کہ کیپٹن بلیز کمپاری کے حامی فوجی ایوان صدر پر حملہ کر کے تقریباً دو سو فوجیوں سمیت کامریڈ سنکارا کو قتل کر چکے تھے اور حکومت پر اب ان کا قبضہ تھا۔ یہ واقعہ ۱۶ اکتوبر کو رونما ہوا۔

برکینا فاسو کے نئے صدر نے حکومت بنانے کی کوشش کی اور سابق صدر کی کیبنٹ میں سے کچھ لوگوں کو دعوت دی لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی اور بہت دیر تک

نئی وزارت نہ بن سکی آخرکار نومبر کے پہلے ہفتے میں وزارت بن گئی اور یونیورسٹی کے پروفیسر پالم PROFESSOR PALM کو وزارت خارجہ کا قلمدان سونپ دیا گیا۔ موصوف اس سے پہلے کبھی کسی سیاسی عہدے پر فائز نہ ہوئے تھے۔ ملنسار، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور منکسرالمزاج آدمی تھے۔ سیاسی وابستگی صرف اور صرف ملک و قوم سے تھی۔

۱۶۔ اکتوبر کے اس خونی انقلاب پر دنیا بھر عام طور پر اور افریقی ملکوں میں خاص طور پر سخت احتجاج ہوا۔ گھانا میں سات دن تک کامریڈ سنکارا کا سوگ منایا گیا۔ اور برکینا فاسو کی نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کامریڈ سنکارا برکینا فاسو کا نہیں گھانا کا صدر تھا۔

گھانا نے کامریڈ سنکارا کو گھانا کا فرزند زمین قرار دیا۔ اور پورے افریقہ نے اسے روشن خیال پروگریسو اور سنجیدہ مزاج انقلابی رہنما کا لقب دیا اس انقلاب کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ اس کے پیچھے کوٹ ڈی ایوار COTE DE IVOIRE (آیوری کوسٹ) کے حکمران ہمفٹ بوانئی HOUMPHET BOI-GNE کا ہاتھ تھا یہ افواہیں گرم تھیں اور برکینا فاسو کی نئی حکومت شناخت کی تلاش میں تھی گھانا اور برکینا فاسو کی مثالی دوستی ختم ہو گئی تھی ۱۹۸۳ء میں جب کامریڈ سنکارا برسراقتدار آئے انہیں بیرون ملک امداد گھانا نے بہم پہنچائی تھی بلکہ جس جیپ کار میں انہوں نے دارالحکومت کی طرف سفر کیا وہ جناب فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ کی مہیا کردہ تھی۔ اور اندرون ملک جیل سے رہا کر کے کامریڈ سنکارا کو صدر بنانے میں کامریڈ کیپٹن بلیز کمپاری اور اس کے ساتھی فوجیوں ہی کا ہاتھ تھا۔ یہ دونوں یعنی کامریڈ سنکارا اور کامریڈ کمپاری اسکول کے زمانے کے دوست تھے۔ اور پھر فوج میں بھی یہ دوستی قائم رہی۔ کامریڈ سنکارا ذرا زیادہ ہی انقلابی تھے۔

جب کامریڈ سنکارا نے برکینا فاسو روڈ ٹرانسپورٹ میں ملازم ایک خاتون سے شادی کی تو کامریڈ کمپاری جو ابھی تک کنوارے تھے۔ انہی کے گھر کے ہو رہے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے کامریڈ سنکارا کے ساتھ دائمی دوستی کا اعلان کرتے ہوئے پریس کو بتایا کہ

ایک لمحہ بھی اپنے دوست کے بغیر گذارنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ پھر یہ بھی کہا کہ انہیں احساس ہے کہ ان کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ بیگم سنکارا کے ہاتھوں پکے ہوئے کھانوں کا نتیجہ ہے شاید اسی پریس انٹرویو میں جو بعد میں لاموندے LE-MONDE میں شائع ہوا کسی اخبار نویس نے کامریڈ سنکارا سے ان کی ذاتی سیکورٹی کے بارے میں بات کی اور پوچھا کہ آیا وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی حکومت کو کوئی اندرونی یا بیرونی خطرہ ہے تو کامریڈ سنکارا نے بڑے اعتماد سے کہا کہ نہیں بالکل نہیں۔ دوسرے سوال کے جواب میں انہوں نے اسی لہجے میں جواب دیا کہ ان کی حکومت مضبوط ہے اور فوجی انقلاب کا بھی کوئی خطرہ نہیں اس بات پر اسی اخبار نویس نے کیپٹن کمپاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ اگر کیپٹن کمپاری آپ کے خلاف ہو جائیں تو کیا پوزیشن ہو گی؟ اس پر کامریڈ سنکارا نے بلا تامل جواب دیا کہ جس روز کیپٹن کمپاری ان کے خلاف کھڑا ہو جائے گا وہ ان کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔ یہ الفاظ بعینہٖ درست ثابت ہوئے بلکہ یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہو گا کہ یہ الفاظ پیشگوئی ثابت ہوئے۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۷ء کے روز جب کیپٹن بلیز کمپاری اپنے جگری دوست کامریڈ سنکارا کے خلاف اٹھے تو وہ دن واقعی سنکارا کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوا۔ کیپٹن بلیز کمپاری نے عنان حکومت سنبھالتے ہی گھانا اور دوسرے ہمسایہ ملکوں کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ کامریڈ سنکارا کے قتل میں ان کا کوئی ہاتھ نہ تھا بلکہ کچھ فوجیوں نے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی جسے کامریڈ سنکارا کے ذاتی محافظوں نے دبانے کی ناکام کوشش کی۔ انہوں نے بے حد افسوس کا اظہار کیا کہ ملک ایک ہونہار فرزند سے محروم ہو گیا رات کی تاریکی میں اس انقلاب کے نتیجے میں مرنے والوں میں سے سات اہم افراد کو واگا ڈوگو سے باہر کچھ فاصلے پر دفن کر دیا گیا اور کسی بھی قبر پر مدفون کا نام و نشان نہ لکھنے دیا گیا قبروں کے اردگرد پہرہ لگا دیا گیا کہ لوگوں کا وہاں ہجوم نہ ہو سکے۔ اور نہ ہی کسی مدفون کی شناخت ہو سکے۔

لیکن باوجود سختی اور پابندی کے بیشمار لوگ کامریڈ سنکارا کی قبر پر زیارت کے لئے اس دور افتادہ قبرستان میں پہنچے جہاں وہ اپنے ہمراہوں کے ساتھ دفن تھے کسی باہمت اور دلیر شخص نے کاغذ پر لکھ دیا کہ یہاں افریقہ کا فرزند عظیم دفن ہے اور سنکارا کی قبر کے سرہانے ایک سوکھی لکڑی گاڑ کر اس پر یہ کتبہ چسپاں کر دیا۔

دن میں تو لوگوں کی آمدورفت کے باعث یہ کاغذ کا کتبہ اتارا نہیں جا سکتا تھا رات کو فوجی پہرے دار اسے اتار دیتے تھے۔ لیکن پراسرار طریقے سے اگلے روز پھر وہی کاغذ لٹکا ہوتا تھا۔ بین الاقوامی پریس اس فوجی انقلاب کی تہہ تک پہنچنے میں کوشاں تھا اور جتنا کیپٹن بلیز کمپاری اس معاملے میں اپنی بریت ثابت کرنے کی کوشش کرتے اتنا ہی وہ اس جال اور دلدل میں پھنستے اور دھنستے جا رہے تھے۔ کیپٹن بلیز کمپاری کی مشکلات کچھ کم نہ تھیں۔ وہ خود ہی ۱۹۸۳ء سے کامریڈ سنکارا کے آخری دم تک حکومت کے SECOND MAN تھے۔ اور معدودے چند ان سربرآوردہ افراد میں شمار ہوتے تھے جو حکومت کی پالیسی تیار کرتے تھے۔ بلکہ کیپٹن سنکارا سے دوستی اور گہرے روابط کی بنیاد پر وہ ہمہ مقتدر بھی کہلاتے تھے۔

عوام اور پریس کا یہ خیال تھا کہ کیپٹن بلیز کمپاری لاکھ بار کہیں کہ ان کا کیپٹن سنکارا اور ان کے ساتھیوں کے قتل میں کوئی ہاتھ نہیں ان کا انکار ہرگز قابل قبول نہیں ہے چنانچہ کیپٹن بلیز کمپاری جب کبھی پریس کانفرنس منعقد کرتے ان سے چبھتے ہوئے سوالات کئے جاتے۔ آخر ایک مرتبہ انہوں نے تنگ آ کر کہا۔

WHAT COULD I HAVE DONE. IT WAS HIS NECK OR MINE

کامریڈ سنکارا اور کیپٹن کمپاری بچپن کے دوست تھے۔ انہوں نے اکٹھے تعلیم پائی۔ بھائیوں جیسے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کے نظریات سے بخوبی واقف تھے۔ ۱۹۸۳ء میں کامریڈ سنکارا کو جیل سے نکال کر کیپٹن کمپاری نے ہی انہیں صدر مملکت بنایا تھا اور آخری وقت تک دونوں کے درمیان کوئی ذاتی یا نظریاتی اختلاف پیدا نہیں

ہوا تھا۔

کیپٹن کمپاری نے کبھی اپنے دوست کی کسی پالیسی سے اختلاف نہیں کیا تھا بلکہ حکومت کے پیچھے موثر طاقت انہی کی تھی۔ اس خونیں انقلاب کا جواز کیا تھا؟ دونوں کے درمیان کیا اختلافات رونما ہوئے؟ اور کیوں ایسا ہوا کہ زندگی بھر کے دوست ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے اگرچہ پاور پالیٹکس میں تو ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن ان دونوں رہنماؤں کی دوستی بھی مثالی تھی۔ پھر کامریڈ سنکارا صحیح معنوں میں ایک قومی رہنما تھے۔ اور فرزند افریقہ (SON OF AFRICA) کہلاتے تھے۔

کیپٹن کمپاری کو کہیں سے بھی اپنی تائید و حمایت حاصل نہ ہوئی تھی۔ اور گھانا تو مطلق انہیں توجہ کے لائق نہ سمجھتا تھا۔ انہوں نے جب گھانا کے صدر مملکت سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو انہیں واضح طور سے بتا دیا گیا کہ گھانا کے عوام ان کی آمد کو پسند نہیں کریں گے اور ہرگز اس شخص کو خوش آمدید نہیں کہیں گے جس کے ہاتھ اپنے جگری دوست کے خون سے رنگے ہوں۔ آخر کار جب فلائٹ لیفٹیننٹ جے جے رالنگ کا غصہ کچھ کم ہوا تب کیپٹن کمپاری کو گھانا آنے کی اجازت ملی۔ مگر اس کے ساتھ انہیں یہ واضح طور سے بتا دیا گیا کہ ان کا دورہ سرکاری سطح پر ہرگز نہیں ہو گا۔ اس لئے وہ استقبال جو سرکاری دورے پر آنے والے سربراہان مملکت کے لئے مخصوص ہے کے بغیر تشریف لانا چاہیں تو آ جائیں مزید یہ کہ ان کا جہاز دارالحکومت کی ایئرپورٹ کی بجائے عکرہ سے کوئی ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر کماسی KUMASI میں اترے گا۔ اور اسی ایئرپورٹ پر فلائٹ لیفٹیننٹ جے جے رالنگ اور ان کے ساتھیوں سے ملاقات ہو گی اخبارات میں اس دورے کی ایک معمولی سی خبر شائع ہوئی بلکہ یہ خبر HUSH HUSH کے زمرے میں ڈال دی گئی تھی۔

اگرچہ کیپٹن کمپاری سے جو طرز عمل روا رکھا گیا وہ حوصلہ شکن تھا تاہم وہ مایوس نہ ہوئے بلکہ جلد ہی انہوں نے دوسرے افریقی ملکوں کے دورے کا پروگرام بنا لیا۔ اور ان ملکوں میں انہوں نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ یہ

ایک مشکل کام تھا اور انہیں اپنی حکومت کو تسلیم کروانے میں بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ وہ کامریڈ سنکارا کی سابقہ پالیسوں سے انحراف کرنے میں دقت محسوس کرتے تھے۔ ماضی میں ان کا جو کردار تھا اس کی نفی نہ کر سکتے تھے۔ وہ نہ کہہ سکتے تھے کہ تمام سابق وزراء بددیانت تھے۔ ملک و قوم کی معاشی و اقتصادی بدحالی کا الزام بھی وہ پچھلی حکومت پر نہیں ڈال سکتے تھے۔ وہ خود بھی تو سابقہ حکومت میں پالیسی بنانے والوں میں شمار ہوتے تھے اور اس حکومت کے اچھے برے کاموں کے ذمہ دار تھے اس لئے اب وہ کیسے یہ کہہ سکتے تھے کہ کامریڈ سنکارا نے جو اقدامات کئے وہ ملکی مفادات کے خلاف تھے۔

کیپٹن کمپاری کو اپنی کابینہ بنانے میں کافی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ ۱۶ اکتوبر کو انہوں نے تخت سنبھالا اور نومبر کے پہلے ہفتے تک اپنی کابینہ کی تشکیل نہ کر سکے اور ادھر جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع تھا ۱۰ نومبر کو افغانستان کے بارے میں ہماری قرار داد پر ووٹنگ ہونا تھی اور مجھے فکر لاحق تھی کہ انقلابی حکومت سے رابطے کی کیا صورت ہو گی۔

کامریڈ سنکارا جن کے دل میں پاکستان کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا اور پاکستان کے موقف کے بارے میں جن کا نقطہ نظر بہت واضح تھا اب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے نئی حکومت کے سیاق و سباق کا ابھی کوئی علم نہیں تھا۔ اور عالمی سطح کے معاملات کے بارے میں بھی نئی حکومت کا ردعمل معلوم نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود میرا یہ اندازہ تھا کہ اگر میں برکینا فاسو کے صدر مقام واگہ ڈوگا OAUHA DIUGOU چلا جاؤں تو اس موقع پر جب کہ کیپٹن بلیز کمپاری اور ان کی حکومت جو دنیا بھر میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا محسوس کر رہی ہے۔ پاکستان کی جانب سے میری آمد کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دے گی یہ بھی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ واگا ڈوگو میں مقیم سفیر صاحبان کے علاوہ کوئی دوسرا سفیر بیرون برکینا فاسو سے ابھی تک واگا ڈوگو نہیں پہنچا۔ میں نے فارن آفس اسلام آباد سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ سفیر خصوصی جناب شہریار ایم خان لندن

واپس جا چکے ہیں اور ان کا پروگرام افریقہ واپس آنے کا نہیں میں نے گھانا میں برکینا فاسو کی سفیر مادام اوتارا MS. OUATARA سے نئی حکومت کے بارے میں کوئی اطلاع حاصل کرنے کی کوشش کی تو حوصلہ افزا ردعمل نہ ملا یہ محترمہ ایک مسلمان سفارت کار تھیں اور کامریڈ سنکارا کی بیگم کی سہیلی تھیں کامریڈ سنکارا بھی ان پر بہت اعتماد کرتے تھے اور گھانا کے صدر مملکت بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے مجھے احساس تھا کہ واگاڈوگو کی نئی حکومت انہیں کچھ زیادہ پسند نہیں کرے گی کیونکہ وہ پرانی حکومت کے بہت قریب تھیں جس میں کمپاری بھی حکومت کے دوسرے درجے پر فائز تھے۔

محترمہ سے میرا رابطہ قائم ہوا تو پتہ چلا کہ خود وہ بھی اگلے روز صبح کے جہاز سے واگاڈوگو جا رہی ہیں۔ کیونکہ نئی حکومت نے اپنے تمام سفیروں کی کانفرنس بلا رکھی ہے۔ صبح ہم دونوں ایک فلائٹ پر عکرہ سے روانہ ہوئے پروگرام کے مطابق چالیس منٹ کی فلائٹ کے بعد آیوری کوسٹ IVORY COAST کی ایرپورٹ عابد جان سے واگاڈوگو کے لئے پرواز بعد از دوپہر ملنے کا امکان تھا۔

ہم عابد جان اترے تو وی۔ آئی - پی روم کی میزبان نے بتایا کہ واگاڈوگو کے لئے پرواز دس منٹ میں روانہ ہونے والی ہے بڑا تعجب ہوا مگر افراتفری میں لوگ ایر ایوار کی طرف بھاگ رہے تھے ہم بھی ادھر کی طرف دوڑے سامنے دکھائی دے رہا تھا کہ جہاز سے زینہ ہٹا لیا گیا ہے۔ دروازہ بند کیا جا رہا ہے اب وہ پرواز کرنے کو بالکل تیار ہے ہم دونوں ٹارمیک پر دوڑتے بھاگتے جہاز کے قریب پہنچے تو زینہ دوبارہ لگایا گیا اور جہاز کا دروازہ کھولا گیا فوکر کے چلتے ہوئے انجنوں کے غبار میں ہم جہاز میں سوار ہو گئے۔

اس وقت نہ بورڈنگ کارڈ لیا گیا نہ امیگریشن کا چکر چلا۔ نہ ٹکٹ کا کوپن لیا گیا۔ جہاز میں سوار ہونا اہم کام تھا جو ہو گیا اور پتہ چلا کہ جہاز کی پرواز کا وقت بدل گیا تھا اب پرواز دوپہر کی بجائے صبح سویرے ہی عابد جان سے واگاڈوگو کے لئے روانہ ہو

جاتی ہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وی آئی پی روم کی میزبان نے ہمیں بروقت اطلاع دے دی تھی چنانچہ اس فلائٹ سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم واگا ڈوگو پہنچ گئے۔ ہوٹل پہنچتے ہی میں نے پروٹوکول والوں سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے ایک ہی گھنٹے کے بعد نئے وزیر خارجہ پروفیسر پالم سے ملاقات کا وقت لے دیا۔ دفتر خارجہ میں ان سے تین گھنٹے تک ملاقات رہی ان کے ہمراہ وزارت خارجہ کے سیکرٹری بھی تھے۔ میں نے دونوں حضرات کو افغانستان کے بارے میں تفصیلات مہیا کیں انہوں نے مجھے بتایا کہ شاید اسی روز کسی وقت صدر مملکت سے میری ملاقات ہو جائے۔ چنانچہ میں ہوٹل چلا گیا شام پانچ بجے سے کچھ دیر پہلے مجھے فون پر اطلاع دی گئی کہ صدر مملکت سے ملاقات کا وقت پانچ بجے طے ہو گیا ہے جلدی جلدی تیار ہوا۔ عین وقت پر صدر مملکت کے دفتر پہنچ گیا اور اسی وقت مجھے صدر مملکت کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

صدر مملکت نے بڑے اطمینان و سکون سے میری معروضات کو سنا اور وعدہ کیا کہ اسی شام کیبنٹ میٹنگ میں یہ معاملہ طے کر دیا جائے گا باہر آئے تو مادام پیریز (مترجم) نے مجھے بتایا کہ ان کے اندازے کے مطابق برکینا فاسو اس مرتبہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں افغانستان کے بارے میں پاکستان کی قرار داد کے خلاف ووٹ نہ دے گا۔

مادام نے اپنے تجربے کے پیش نظر جو اندازہ لگایا وہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا رات کے ساڑھے گیارہ بجے مجھے فون پر ہوٹل میں فارن آفس سے ایک محترم دوست نے مطلع کیا کہ کیبنٹ نے اس مرتبہ افغانستان کے مسئلے پر پاکستان کی قرار داد کے بارے میں غیر جانبدارانہ طرز عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے یہ ایک اچھی بات اور کامیابی تھی کیونکہ پچھلے سال برکینا فاسو نے پاکستان کی قرار داد کے خلاف ووٹ دیا تھا۔

دیوتاؤں کی سرزمین برکینا فاسو

BURKINA FASO

عکرہ میں برکینا فاسو کی سفیر مادام میمونہ ونتارا نے مجھے اگست ۱۹۸۶ء کے اوائل میں اطلاع دی کہ اس ماہ کے آخر میں مجھے برکینافاسو کے دارالحکومت واگا ڈوگو جانے کے لئے تیار رہنا چاہیئے تاکہ میں اپنی تقرری کی اسناد صدر مملکت کامریڈ کیپٹن ٹامس سنکارا کے روبرو پیش کروں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس تقریر کی نقل جو مجھے اس موقع پر کرنا ہے اور اسناد سفارت کی نقول بھی مجھے دفتر خارجہ کو ابھی سے مہیا کر دینی چاہئیں۔

میں نے یہ تمام دستاویزات پہلے سے ہی واگا ڈوگو بھجوا دی تھیں لیکن مادام میمونہ نے اس کے باوجود مجھے تاکید کی کہ یہ تمام نقول دوبارہ بھیجنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے ایک ایک نقل تمام دستاویزات کی از سر نو بذریعہ ہوائی ڈاک براہ راست واگا ڈوگو پھر بھیج دی اور دوسرا سیٹ میں نے مادام میمونہ کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اپنے ڈپلومیٹک بیگ سے اپنی حکومت کو بھیج دیں۔

پہلی مرتبہ جب میں نے اپنی تقریر اور اسناد سفارت کی نقول بھیجی تھیں تو وہ انگریزی زبان میں تھیں لیکن میں نے اب تمام دستاویزات کا فرانسیسی ترجمہ کروا کر بھجوانا مناسب سمجھا کیونکہ برکینافاسو کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔

برکینا فاسو گھانا کا ہمسایہ ملک ہے۔ یہ چاروں طرف سے مالی (MALI) ایوری

کوسٹ (IVORY COAST) بنین (BENIN) نائیجر (NIGER) اور ٹوگو (TOGO) وغیرہ سے گھرا ہوا ہے۔ سمندر سے اس کا رابطہ ہمسایہ ممالک ٹوگو کی بندرگاہ لومے (LOME) اور بنین کی بندرگاہ کوتونو (KOUTOUNOU) کے ذریعے قائم ہے۔ گھانا کے ساتھ بے انتہا گہرے تعلقات کے باوجود گھانا کی بندرگاہیں ٹاکوراڈی (TAKORADI) اور ٹیما (TEMA) دور واقع ہونے کی وجہ سے زیادہ سودمند نہ ہیں۔

۱۹۱۹ء سے پہلے برکینا فاسو کا دنیا کے نقشے پر کوئی وجود نہ تھا۔ فرانس نے اس سال بوجوہ ایوری کوسٹ (IVORY COAST) مالی (MALI) اور نائیجر (NIGER) کے کچھ حصے ملا کر ایک ملک تشکیل دیا جس کا نام اپروولٹا رکھا گیا لیکن اس نوزائیدہ ملک کی زندگی صرف تیرہ سال تھی۔ ۱۹۳۲ء میں اپروولٹا کو توڑ دیا گیا تھا۔ اور پڑوسی ملکوں میں اس کے حصے بخرے بانٹ دیئے گئے۔

۱۹۴۷ء میں اس ملک کو از سرنو زندگی عطا ہوئی اور یہیں سے اس کی نئی تاریخ کا آغاز ہوا۔ پہلی اکھاڑ پچھاڑ فرانس کی صوابدید پر ہوئی تھی اور اب بھی اسی نے نئے سرے سے یہ ملک بنا دیا۔ ۵ر اگست ۱۹۶۰ء کو اپروولٹا کو آزادی نصیب ہوئی۔ آزادی کے بعد موسیو یامنگو (MAURIC YAMENGO) اس نوآزاد ملک کے پہلے صدر بنے پھر ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخاب میں انہیں ننانوے فیصد ووٹوں کی اکثریت سے دوبارہ صدر چنا گیا۔ لیکن ۳ر جنوری ۱۹۶۶ء میں ٹریڈ یونین' طلبہ اور فوج نے ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

انقلاب کے بعد فوجی کرنل سنگولی لا میزانا (LT. COL SANGOULE LAMIZONA) نے عنان حکومت سنبھال لی اور جنرل کا عہدہ بھی۔ اس فوجی انقلاب نے بعد میں متعدد فوجی انقلابات کو جنم دیا۔ اپروولٹا کو پھر امن نصیب نہ ہوسکا۔ تاآنکہ ۶ر اگست ۱۹۸۳ء کو کیپٹن سنکارا CAPTAIN SANKARA نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور عنان حکومت اپنے دوست کیپٹن کمپاری (CAP. BLAISSE COMPARI

کی مدد سے سنبھال لی۔ اسی روز نئے صدر کیپٹن ٹامس سنکارا نے اپر وولٹا کا نام تبدیل کر کے اسے برکینافاسو کا نام دے دیا۔ برکینافاسو مقامی زبان کے دو لفظوں کا مرکب ہے جس کے معنی "دیوتاؤں کی سرزمین" کے آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ملک کا ترانہ اور جھنڈا بھی تبدیل کر دیا۔

ایک کابینہ بھی تشکیل کی گئی لیکن اصل اقتدار کیپٹن سنکارا کی معیت میں فوج کے افسروں یعنی کیپٹن سنکارا' کیپٹن کمپاری' کیپٹن زونگو اور میجر لہنگانی کے ہاتھ میں تھا۔ فوج کے ان چار افسروں میں سے کیپٹن سنکارا اور کیپٹن بلیز کمپاری آپس میں بچپن کے دوست اور ہم جماعت رہ چکے تھے۔ وہ باہم رازدار' ہمدرد اور دوست دار تھے۔ فوج کے ان چاروں افسروں کی ٹیم بیحد ایماندار' محب وطن اور ملکی و قومی اتحاد' یکانگت' استحکام اور سالمیت پر یقین رکھنے والوں پر مشتمل تھی۔

یہ ٹیم اس بات پر مصر تھی کہ برکینافاسو کو اپنے ذرائع اور قوت بازو پر ہی انحصار کرنا چاہیئے۔ کیپٹن سنکارا بھی اسی جذبے کے ساتھ اپنی زندگی بہت سادگی سے بسر کرتے رہے حتیٰ کہ اس معاملے میں وہ نہ صرف خود سختی سے کاربند رہے بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی اسی راہ پر اپنے ساتھ لے کر چلتے رہے۔

صدر بننے سے پہلے کیپٹن سنکارا کے پاس ذاتی استعمال کے لئے صرف ایک بائیسکل اور ایک پرانے ماڈل کی پیجو کار تھی۔ ان کی اہلیہ روڈ ٹرانسپوٹ میں ملازم تھیں۔ صدر ہونے کے بعد انہیں سرکاری طور پر مرسڈیز کار دی گئی جسے وہ بہت کم ہی استعمال کرتے تھے۔ مسز سنکارا پہلے کی طرح روڈ ٹرانسپوٹ میں ملازم رہیں۔ نہ تنخواہ بڑھی نہ ترقی ہوئی۔

میں نے کیپٹن سنکارا کو بیحد ذہین اور بااعتماد پایا۔ انہیں بخوبی ادراک تھا کہ برکینافاسو کے لئے انہیں کیا کرنا ہے۔ بڑی طاقتوں سے وہ سخت نالاں تھے۔ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ براعظم افریقہ اگرچہ کم وبیش سب کا سب آزاد ہو چکا ہے لیکن سامراجی قوتیں ابھی اس نوآزاد خطہ زمین کو غلام بنائے رکھنے پر مصر ہیں۔ وہ اس بات

کے لئے کوشاں تھے کہ ان کے ملک کی تمام معدنی دولت ملک ہی کے کام آئے۔ فرانس، امریکہ، بھارت اور مشرقی بلاک کے ممالک پر وہ اس ضمن میں اعتماد نہ کرتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق توسیع پسند ممالک سے مرمر کر افریقہ کی گلو خلاصی ہوئی اب ان سے کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ آکر بھلائی اور بہتری کے لئے کوئی کام کریں گے اب اگر انہیں پھر بلایا گیا تو بدو کے اونٹ والا معاملہ ہو گا۔ ایسے جذبات کا اظہار وہ برملا کرتے تھے۔ اور ذرا بھی نہ جھجکتے تھے۔

کیپٹن سنکارا پاکستان کی دل سے قدر کرتے اور اس کی مختلف سمتوں میں ہونے والی ترقی کو بیحد سراہا کرتے تھے۔ ان کے لئے پاکستان ایک مثالی ملک تھا اور اس کے شہری قابل صد تعریف تھے کہ ناسماعد حالات اور تین خونی جنگوں کے باوجود ان لوگوں کا پاکستان پر یقین محکم قائم رہا اور ہر جہت میں اس تھرڈ ورلڈ ملک نے ترقی کی ہے۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ پاکستان جیسا وسیع وسائل والا ملک اقتصادی معاشی مشکلات میں محض اور محض استحصالی قوتوں کی وجہ سے پھنسا ہوا ہے۔ جو نوآبادی تسلط کا نیا طریقہ واردات ہے۔ ان کی سادگی اور سادہ زندگی بسر کرنے کا اثر ان کی کابینہ کے ارکان پر بھی کافی تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے دور حکومت میں کابینہ کے ارکان دیانتدار اور عوام ایماندار تھے۔

"واگاڈوگو" میں ہمارا مشن قائم نہیں۔ عکرہ میں مقیم سفیر کو "واگاڈوگو" میں پاکستان کے مفادات کی نگرانی کرنی ہوتی ہے۔ برکینافاسو میں کوئی پاکستانی بھی مقیم نہیں اس لئے وہاں ہمارا کوئی عوامی رابطہ بھی قائم نہیں۔ سوائے اس کے کہ عکرہ میں مقیم سفیر عام طور سے "واگاڈگو" کا دورہ کرتا رہے اور کوئی راستہ نہیں مگر یہ بھی محکمانہ قیود کی وجہ سے ناممکن ہے۔ کفایت شعاری کے پیش نظر اور کسی فرسودہ قاعدے کے تحت عکرہ میں مقیم سفیر سال بھر میں صرف دو مرتبہ اپنے دائرہ کار میں آنے والے ممالک کا دورہ کرسکتا ہے۔ یہ قاعدہ اور ضابط اب تک قائم ہے تبدیل نہیں ہوا نہ ہوسکتا ہے۔ دفتر خارجہ کے بزرجمہروں کو کیا معلوم کہ

برکینا فاسو کے صدر کیپٹن کمپاری

سال بھر میں صرف دوبار مختصر دورے کرنا دوستانہ تعلقات کو استوار اور قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں۔

کامریڈ کیپٹن سنکارا کو اس بات کا بہت شوق تھا کہ ان کے عہد میں برکینافاسو نے جو ترقی کی ہے وہ بیرون ملک سے آنے والے لوگ خاص طور پر سفیر صاحبان خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ انہوں نے اپنی افتاد طبع سے یہ دلچسپ فیصلہ بھی کیا کہ ائندہ وہ اسناد سفارت دارالحکومت "واگاڈوگو" میں وصول نہیں کریں گے بلکہ برکینافاسو کے کسی دور دراز گاؤں میں اسناد سفارت وصول کرنے کی تقریب منعقد ہوا کرے گی۔

مجھ سے پہلے سفیر محمدراول دریامانی "واگاڈوگو" سے تقریباً دوسو میل دور ایک گاؤں میں اس مقصد کے لئے گئے اور اسناد سفارت پیش کیں۔ میں جب اپنی اسناد سفارت پیش کرنے گیا تو مجھے اطلاع دی گئی کہ اگلے روز مجھے تقریباً ۸۰ میل دور ایک گاؤں میں جاکر اسناد سفارت پیش کرنی ہوں گی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہنگری' ویت نام اور آیوری کوسٹ کے سفیر صاحبان بھی اس مقصد کے لئے آچکے ہیں اور وہیں جاکر اپنی اسناد سفارت پیش کریں گے۔ یہ سفیر صاحبان بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں میں ٹھہرا تھا۔ اگلے روز صبح آٹھ بجے ہم چاروں سفیر علیحدہ علیحدہ کاروں میں عازم سفر ہوئے اور ٹھیک دس بجے اس گاؤں میں پہنچ گئے جہاں تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گاؤں کی سڑک پاکستان کے دیہات کی سڑکوں ایسی تھی۔ اس کے دونوں طرف پختہ وناپختہ مکان تھے۔ سبزہ اور ہریالی بہت کم تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں پاکستان ہی کے کسی شہر سے گاؤں کی طرف جا رہا ہوں۔ بعد میں ایک دو مقامات پر جہاں سے میں گزرا بگولے اور تیز گرد آلود ہوا کا مجھے سامنا کرنا پڑا۔ دھول اور سوکھی گھاس ہوا میں ہر طرف اڑ رہی تھی۔

گاؤں کے باہر تمام لوگ جمع تھے۔ کامریڈ کیپٹن سنکارا اپنی کابینہ کے چند ارکان کے ساتھ سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھے تھے اور پہلے سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم سب مہمان سفیروں کو تھوڑے سے فاصلے پر نیم کے ایک گھنے درخت کے نیچے

بٹھایا گیا تھا اور وہیں پر ہماری خاطر مدارات کے لئے کوکا کولا۔ فانٹا اور سیون اپ وغیرہ ٹھنڈے مشروبات کا اہتمام کیا گیا تھا۔ برف خاص طور پر "واگاڈوگو" سے منگوائی گئی تھی۔ تھوڑا وقت گزرا تھا کہ لاؤڈ سپیکر پر مقامی موسیقی کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہمارے استفسار پر معلوم ہوا کہ لاؤڈ سپیکر بھی "واگاڈوگو" سے منگوایا گیا ہے اور یہ بھی کہ گاؤں میں بجلی نہیں اس لئے بیٹری کے زور پر چل رہا ہے۔

اب اسناد سفارت پیش کرنے کی تقریب کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ سب سے پہلے ہنگری کے سفیر کو چیف آف پروٹوکول صدر مملکت کے سامنے لے کر گئے۔ انہوں نے اپنی اسناد سفارت پیش کیں اور خیر سگالی کے جذبات پر مبنی ایک تقریر کی۔ پھر اس کے جواب میں صدر مملکت نے تقریر کی۔ پھر ویت نام کے سفیر کو پیش کیا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے یہ سلسلہ مجھ تک پہنچا۔اور مجھے بھی اسی طریقے کے مطابق صدر مملکت کامریڈ سنکارا کے سامنے لے جایا گیا۔

میں نے صدر مملکت کو اپنی اسناد سفارت پیش کیں ۔ قاعدے کے مطابق مجھے تقریر کی دعوت دی گئی۔ میں نے سفارتی آداب کے مطابق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ میری تقریر انگریزی زبان میں تھی جس کا مادام پیریز جو ایک حاضر فوجی کرنیل کی بیگم تھیں' ساتھ ساتھ مقامی زبان میں ترجمہ کر کے سناتی جاتی تھیں۔

میری تقریر کے بعد پھر صدر مملکت نے جوابی تقریر کی جو مقامی زبان میں تھی اس کا ترجمہ بھی ساتھ ساتھ مادام پیریز نے کیا جو انگریزی زبان میں تھا۔مادام پیریز کے بارے میں پتہ چلا کہ انہوں نے پیرس کی کسی یونیورسٹی سے فرانسیسی زبان میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ وہ نہایت پڑھی لکھی قابل اور قابل اعتماد مترجم تھیں۔

کامریڈ سنکارا نے حاضرین سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ موسیو علی شیخ پاکستان کے سفیر ہیں۔ اس پاکستان کے جہاں گیہوں اور چاول بھاری مقدار میں اگتا ہے اور یہ چاول جو آپ کھاتے ہیں یہ پاکستانی چاول ہے۔ انہوں نے اس امید کا اظہار بھی کیا کہ وہ دن دور نہیں جب وہ بھی اپنی محنت اور زور بازو سے پاکستان کی تقلید میں

اپنی قوم کے لئے فاضل اناج اگا سکیں گے۔

ہماری تقریریں ختم ہوئیں تو کامریڈ سنکارا میرے ساتھ والی کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ یہ ایک عام کرسی تھی۔ اس میں ایسی کوئی تزئین و آرائش اور انفرادیت نہیں تھی جس سے کوئی تخصیص و امتیاز پیدا ہو۔ پھر ہم دونوں کو مشروب پیش کیا گیا جس میں سے ایک گھونٹ لیکر صدر مملکت نے حلوہ کدو کے چھلکے کا پیالہ میری طرف بڑھایا۔ چیف آف پروٹوکول نے مجھے اشارہ کیا کہ پروٹوکول کے مطابق دوستی کے اظہار کے لئے مجھے بھی اس میں سے ایک گھونٹ پی لینا چاہئے۔ میری ہچکچاہٹ کو بھانپتے ہوئے صدر کامریڈ سنکارا نے خوبصورت انگریزی میں مجھے مخاطب کر کے کہا! ایمبیسڈر علی شیخ! بے خوف ہو کر پی لیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اسلام میں شراب پینا حرام ہے۔ اس لئے ہم نے آپ کے اور اسلامک ری پبلک آف پاکستان کے احترام میں اس برتن میں الکحل کی بجائے ناریل کا پانی ڈال رکھا ہے۔

حلوہ کدو کے چھلکے کے پیالے میں واقعی خالص ناریل کا پانی تھا۔

میرے بعد آیوری کوسٹ کے سفیر نے اسناد سفارت پیش کیں بعد میں

تمام مہمانوں کو چائے پلائی گئی۔ بسکٹ اور چائے سے خاطرمدارت اور تواضع ہوئی۔ اسی دوران یوکلپٹس کے درختوں کے پودے بھی پہنچ گئے۔ صدر کامریڈ سنکارا نے تمام مہمانوں کو اور برکینافاسو کی حکومت کے ارکان کو دعوت دی کہ سب لوگ یوکلپٹس کے درخت لگائیں۔ میرے اندازے کیمطابق اس روز دوسو کے قریب درخت لگائے گئے۔ درختوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے یہ اختراع صدر مملکت کی اپنی ہے۔

برکینافاسو میں آبپاشی کا کوئی نظام نہیں۔ بارش جب ہوتی ہے تو موسلادھار ہوتی ہے اور اگر نہیں ہوتی تو پورا سال گزر جاتا ہے۔ بارش کی ایک بوند بھی نہیں گرتی۔ اگر بارش وقت پر ہو جائے تو چاول کی کاشت ہو جاتی ہے جو ملکی ضرورت سے بیحد کم ہوتی ہے یعنی ریکارڈ فصل کی مقدار پندرہ ہزار ٹن ہے جبکہ ملکی ضرورت کے لئے ساٹھ ہزار ٹن چاول کی ضرورت ہے۔ حکومت کم از کم پینتالیس ہزار ٹن چاول درآمد

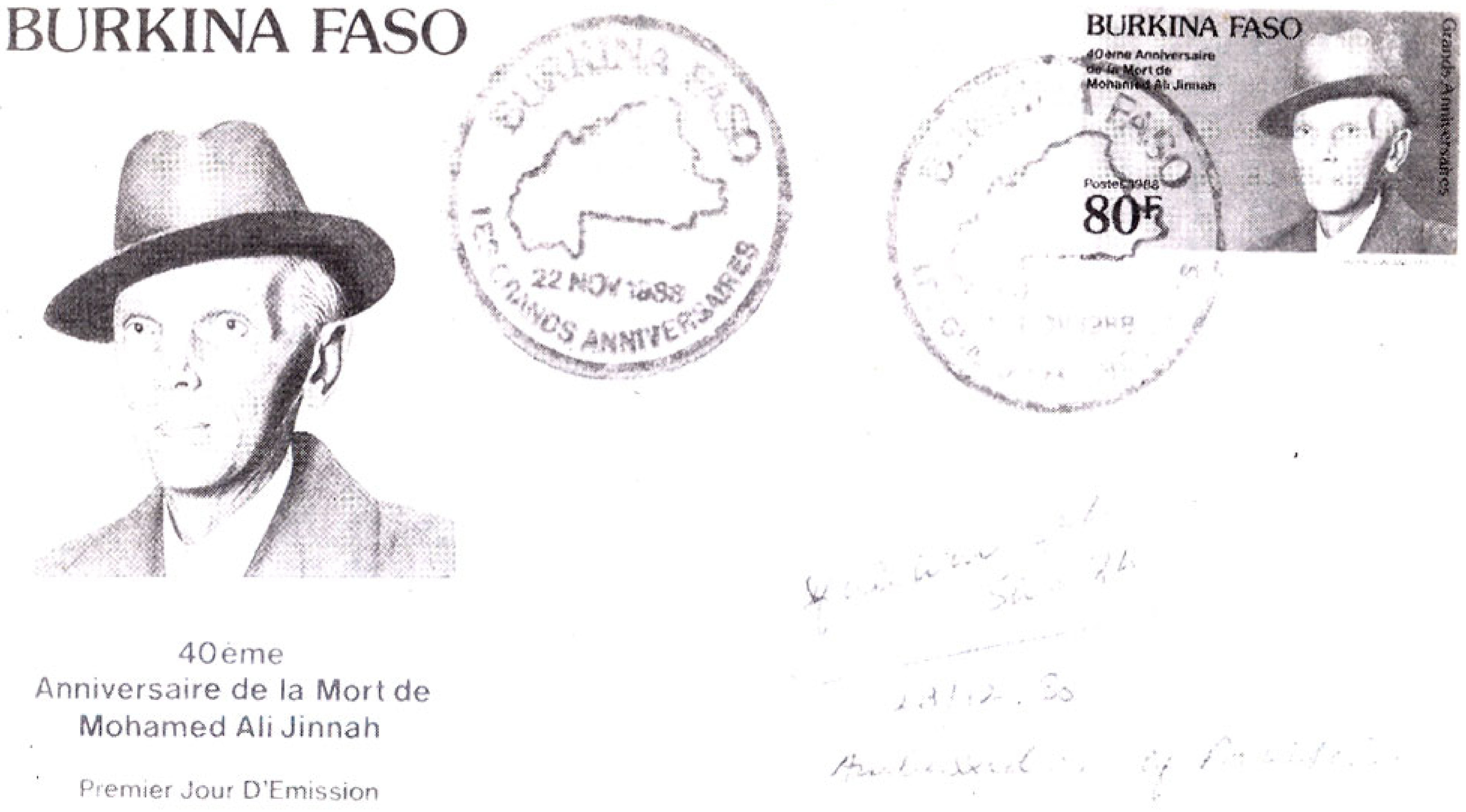

برکینا فاسو نے قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر والے ڈاک کے ٹکٹ جاری کئے

کرنا ہوتا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے چاول ملک میں لایا جاتا ہے۔ یہ عام طور سے پاکستانی چاول کی قسم کا موٹا چاول ہوتا ہے اور وہی پسند کیا جاتا ہے۔

میں ایک مرتبہ "واگاڈوگو" کے دورے پر تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ برکینافاسو کا محکمہ ڈاک اس فکر اور سوچ میں ہے کہ دنیا کے کسی تاریخ ساز شخص کی تصویر ڈاک کے ٹکٹ پر شائع کی جائے۔ میں نے مناسب لابی کر کے فیصلہ کروالیا کہ قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر ڈاک ٹکٹ پر شائع کی جائے۔اب اس بات کی تلاش ہونے لگی کہ تصویر کونسی ہونی چاہیے۔

میں نے پاکستان کے محکمہ ڈاک کو براہ راست خط لکھ کر اس سے یہ استدعا کی کہ قیام پاکستان سے لے کر موجودہ تاریخ تک ہمارے محکمہ ڈاک نے قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر والے ڈاک کے جتنے ٹکٹ شائع کئے ہیں ہمیں ان کا ایک البم مہیا کر دیا جائے۔

محکمہ کے جنرل منیجر نے فوراً ہی میری استدعا پر دو مکمل البم مہیا کر دیئے۔ اسی بات سے متعلق میں نے جو ایک خط محکمہ خارجہ کو بھی لکھا تھا وہ شاید ردی کی ٹوکری میں پڑا ہو گا۔ بہرکیف برکینافاسو کی کابینہ نے قائداعظم محمد علی جناح کی ایک تصویر اس مقصد کے لئے پسند کی۔ یہ تصویر انہیں لندن سے ان کے سفیر نے بھیجی تھی۔ لندن میں گول میز کانفرنس کے لئے آزادی سے پہلے قائداعظم جب لندن تشریف لے گئے تھے تو کسی نے ایرپورٹ پر ان سے پوچھا کہ آپ ہمارے لوگوں کے لئے کیا لائے ہیں؟ عین اسی وقت سورج نے گھرے بادلوں کے درمیان میں سے جھانکا تو قائداعظم نے معاً کہا میں اہل لندن کے لئے چمکتی دھوپ کا مژدہ لے کر آیا ہوں۔ اس موقع پر لی گئی تصویر کا انتخاب کیا گیا اور وہ شائع ہوئی۔

مجھے قائداعظم کے اس فوٹو والے ڈاک ٹکٹ پر دستخط کرنے کے لئے واگا ڈوگو بلایا گیا۔ چنانچہ میں وہاں گیا اور دستخط کئے۔ پاکستانی پریس میں تو ان تصویری ڈاک ٹکٹوں کی بڑی پذیرائی ہوئی مگر ہمارے دفتر خارجہ نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور نہ

حکومت پاکستان ہی نے برکینافاسو کی حکومت سے شکریہ کہنے کے لئے کوئی رابطہ قائم کیا۔ یہ ان کا اپنا انداز فکر ہے شاید ہمارے دفتر خارجہ اور خود حکومت پاکستان نے اپنے ملک کے بانی کی عزت افزائی کا کوئی نوٹس لینا مناسب نہ سمجھا۔ شاید اس لئے بھی کہ ایک نان کیریر سفیر کی کارگزاری کا ایک عمدہ پہلو لوگوں کے سامنے آ جائے گا۔

انگریزی روزنامہ مسلم کو یہ تصویر پسند نہ آئی۔ اس نے اس پر ایک نیم مزاحیہ سا نوٹ لکھا اور قائداعظم محمد علی جناح کی ٹکٹ پر شائع شدہ تصویر کے بارے میں یہ تاثر دیا کہ وہ کچھ اچھی نہیں تھی جبکہ اس سے بہتر کئی تصویریں موجود تھیں اور برکینافاسو حکومت ان میں سے کسی ایک تصویر کو بھی شائع کر سکتی تھی۔ مزید کہا کہ اگر سفیر محترم کوشش کرتے تو قائداعظم کی قومی لباس والی کوئی ایک تصویر مہیا کر کے شائع کرواسکتے تھے۔

مبصر کی یہ اپنی ذاتی رائے تھی جس سے اختلاف یا اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک اہم بات یہ تھی کہ ہزاروں میل دور ایک ملک نے جس کے ساتھ ہمارا رابطہ محض کاغذی کاروائی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اور یوں پاکستان اور پاکستانی قوم کی جانب خیرسگالی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔

تصویر کے بارے میں بنیادی بات یہ تھی کہ برکینا فاسو کی حکومت اس تگ و دو میں تھی کہ قائداعظم محمد علی جناح کی کوئی ایسی تصویر چھاپی جائے جو پہلے نہ چھپی ہو اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوئے کہ جو تصویر انہوں نے ڈھونڈ نکالی وہ کسی ڈاک ٹکٹ کی پہلے زینت نہ بنی تھی۔

تقریب اسناد سفارت
سیرالیون

SIERRA LEONE

اکتوبر ۱۹۸۶ء کی تیسری یا چوتھی تاریخ کو سیرالیون سے پیغام آیا کہ مجھے وہاں اکتوبر آٹھ تاریخ کو اپنی سفارت کی اسناد پیش کرنا ہے اور یہ کہ میں بریفنگ اور ریہرسل کے لئے اکتوبر کی چھ تاریخ کو وہاں پہنچ جاؤں اس دوران مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ سیرالیون میں چند گنتی ہی کے پاکستانی مسلمان آباد ہیں۔ دو یا تین پاکستانی تو بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل میں ملازم ہیں۔ ان کے علاوہ ایک پاکستانی تاجر حسیب خالد بھی ہیں جو کافی مدت سے وہاں نجی طور پر تجارت کر رہے ہیں۔ موصوف کا ہمارے مشن سے مسلسل رابطہ قائم رہا ہے۔ محترمہ مس کشور جان سابق سفیر نے بھی مجھ سے ان کی بڑی تعریف کی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اپنے دور سفارت میں حسیب خالد کے خلوص و محبت کے پیش نظر جو ملک و قوم کے لئے وہ اپنے دل میں رکھتے ہیں وزارت امور خارجہ پاکستان سے یہ سفارش کی تھی کہ حسیب خالد کو پاکستان کے اعزازی کونسل کے طور پر سیرالیون میں نامزد کر دیا جائے۔ مشن کے ریکارڈ سے محترمہ مس کشور جان کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ بھی ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ میرے پیشرو کے دور سفارت میں دفتر خارجہ نے مذکورہ سفارش کو رد کر دیا تھا اور اس کا سبب یہ قرار دیا کہ حسیب خالد پاکستانی شہری ہیں اور دفتر

خارجہ کی پالیسی کے تحت کسی پاکستانی یا پاکستانی نژاد کو اعزازی کونسل نامزد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پالیسی کب بنی اور کس بزرجمہر نے بنائی نہیں معلوم! قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ صدی کے اوائل میں یہ پالیسی وضع کی گئی اور آزادی کے بعد ہمارے دفتر خارجہ کے دانش وروں نے زمانے کے حالات اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا کبھی مطالعہ نہ کیا اور دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے پر بھی نظرثانی کی کبھی ضرورت محسوس نہ کی۔

میں نے اپنے دور سفارت میں ضرور اس بات کی کوشش کی کہ مذکورہ معاملے اور مسئلے پر دفتر خارجہ نظرثانی کرے اور چند ایک خطوط لکھنے لکھانے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم پاکستان کے ابتدائی دور ہی میں یہ فیصلہ ہو گیا کہ پاکستانی شہری یا پاکستانی نژاد کو بھی اعزازی کونسل بنایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اس عہدے کے لئے دیگر مطلوبہ شرائط پر پورا اترتا ہو یہ ایک انقلابی فیصلہ ہے اور اس کے دور رس نتائج برآمد ہوں گے۔ اس فیصلے کے بعد میں نے حسیب خالد کے کیس کو نئے سرے سے مرتب کر کے دفتر خارجہ کی منظوری کے لئے بھیجا تھا۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ دفتر خارجہ میں یہ فائل ابھی تک غور طلب ہے۔

۶ اکتوبر کو مجھے سیرالیون پہنچنا تھا تاکہ ۸ اکتوبر کو اسناد سفارت جناب جوزف سیدو موموح صدر مملکت کے روبرو پیش کر سکوں۔ نرگس اور میرے لئے گھانا ایرویز کی بعد از دوپہر کی پرواز میں نشستیں محفوظ کرائی گئیں۔ جب جہاز نے مقررہ وقت پر پرواز نہ کی تو استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی وی۔ آئی پی کا انتظار ہے۔ جب صاحب موصوف تشریف نہ لا سکے تو کوئی پینتالیس منٹ کی تاخیر کے بعد جہاز روانہ ہوا۔

اب ہم نے سکون و اطمینان کا سانس لیا مگر رن وے پر تھوڑی دور چل کر جب جہاز رک گیا تو پھر ہمارا سکون و اطمینان جاتا رہا۔ ہمیں فکر ہوئی کہ اگر جہاز آج نہ

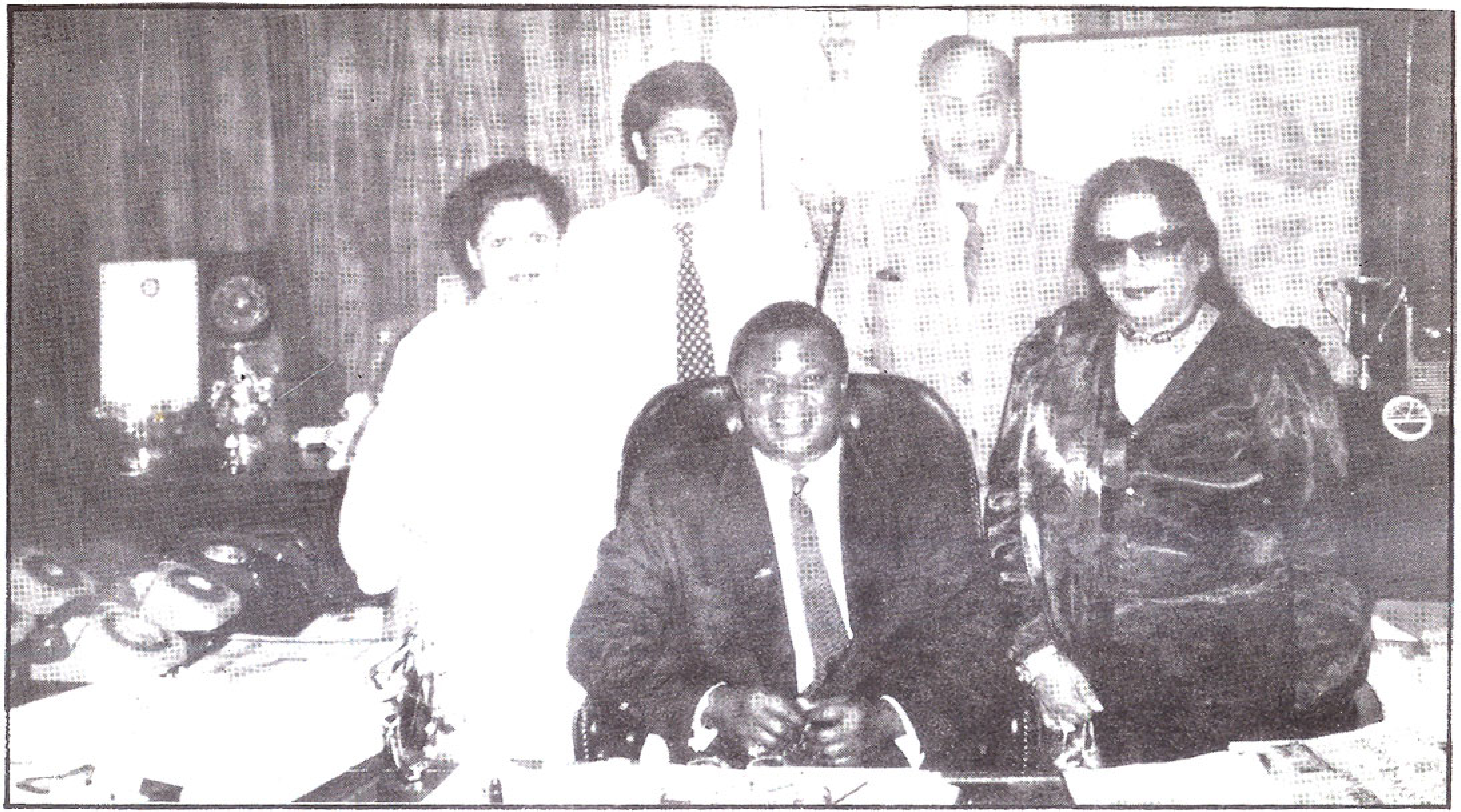

سیرالیون کے صدر مملکت جوزف سیدو مومو کے ساتھ ایک تصویر نرگس۔ افتخار علی شیخ۔ صدر مملکت۔ حسیب خالد۔ یاسمین حسیب

روانہ ہو تو سات اکتوبر کو سیرالیون کے دارالحکومت فری ٹاؤن ہم کیسے پہنچیں گے۔ کیونکہ اس روز عکرہ سے فری ٹاؤن کے لئے کوئی بھی اور کسی بھی ایئرلائنز کی پرواز نہیں تھی۔ بالفرض محال اگر ہم پہنچ بھی گئے تو بہت ہی کم وقت میں ریہرسل کیسے ہو گی۔ ہم نے یہ بھی سنا تھا کہ اگر آٹھ اکتوبر کو اسناد پیش کرنے کے لئے میں وہاں نہ پہنچ سکا تو پھر یہ موقع شاید اگلے سال ہی میسر آسکے۔

ذہن میں ایک خیال آتا دوسرا جاتا۔ یہ سلسلہ اسی طرح سے ابھی جاری تھا کہ معاً کھڑکی سے باہر ایک صاحب پر میری نظر پڑی۔ وہ سر پر ہاتھ رکھے اپنا ہیٹ سنبھالے سرپٹ جہاز کی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے جہاز کی سیڑھی آ رہی تھی اس سے چند قدم پیچھے ایک اور صاحب اپنے ہاتھ میں بریف کیس لئے بھاگتے چلے آ رہے تھے جب یہ سب لوگ جہاز کے قریب پہنچے تو جہاز کا دروازہ کھلا۔ سیڑھی لگی ہیٹ والے صاحب نے بریف کیس اور بیگ لانے والے صاحب سے یہ دونوں چیزیں لیں اور ہانپتے ہوئے جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ صاحب وہی وی۔ آئی۔ پی تھے جن کے لئے جہاز کچھ دیر کے لئے رکا رہا۔ اب جہاز کا دروازہ بند ہوا اور ہم سوئے منزل رواں ہوئے۔

سیرالیون کے لئے ہوائی جہاز اس کے بین الاقوامی ایئرپورٹ لنگی پر اترتے ہیں ایئرپورٹ عین سمندر کے بیچ ایک جزیرے پر واقع ہے۔ لنگی ایرپورٹ اور دارالحکومت فری ٹاؤن کے درمیان خاصا فاصلہ ہے۔ ہیلی کاپٹر سروس بھی ہے اور فیری سروس بھی۔ فیری سروس ناقابل اعتبار ہے اور کسی وقت بھی سمندر کے عین درمیان کسی ٹاپو پر یا کسی فنی خرابی کے باعث رک سکتی ہے اور اسے دوبارہ سفر کرنے میں کئی کئی گھنٹے لگ سکتے ہیں۔

ہیلی کاپٹر سروس مہنگی تو ہے لیکن اس میں باقاعدگی ہے۔ ایک طرف کا کرایہ

ساٹھ ڈالر ہے۔ چھ تاریخ کو ہم عابد جان منرووِیا سے ہوتے ہوئے لنگی ایرپورٹ پر پہنچ گئے۔ ایرپورٹ پر حسیب خالد اور ان کی بیگم یاسمین اور پروٹوکول کے افسران بھی موجود تھے۔ ہیلی کاپٹر ہی کے ذریعے ہم فری ٹاؤن پہنچے تو ہوٹل پہنچتے ہی میں نے حسیب خالد کے ساتھ آئندہ سفر کا پروگرام ترتیب دے دیا۔

دراصل ہوا یوں کہ ابھی میں عکرہ سے فری ٹاؤن کا پروگرام طے کر رہا تھا کہ گھانا میں لائبیریا کے کونسلر نے مجھے اطلاع دی کہ مجھے دس اکتوبر کو جنرل ڈاکٹر سیموئیل۔ کے۔ ڈو کے روبرو اپنی اسناد سفارت پیش کرنا ہے لہٰذا میں ۸ اکتوبر کو پہنچ جاؤں تاکہ ۹ اکتوبر کو ریہرسل ہو سکے۔ اس پر میں نے اس سے کہا یہ تو بہت ہی تھوڑا وقت ہے اور دوسرے مجھے سیرالیون میں اتنی ہی اہم مصروفیت ہے۔ شاید میں وقت پر نہ پہنچ سکوں۔ اس نے مشورہ دیا کہ میں یہ موقع ضائع نہ کروں جیسے بھی ہو وہاں پہنچ جاؤں۔ اگر میں ۹ اکتوبر کو بھی لائبیریا پہنچ جاؤں تو دس اکتوبر کو کسی بھی وقت اسناد سفارت پیش کرنے کی تقریب منعقد ہو سکتی ہے اور اس کے لئے ریہرسل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

چنانچہ میں نے اس پروگرام کو حتمی طور پر کنفرم کر دیا اور اس سے کہا کہ ہم انشاء اللہ ضرور وہاں پہنچ جائیں گے۔ میں نے مزید تصدیق کے لئے چیف آف پروٹوکول کو بھی اس پروگرام سے بذریعہ ٹیلکس مطلع کر دیا۔ اب میں نے فری ٹاؤن پہنچتے ہی فوری طور پر منرووِیا کی جانب روانگی کے انتظامات پر توجہ دی۔ سیرالیون ایئر لائن کے پاس صرف ایک ہی جہاز ہے اور عکرہ سے روانگی سے قبل ہی میں نے اسی ایئرلائن سے اپنی اہلیہ نرگس اور اپنے لئے آٹھ اکتوبر کی شام ساڑھے سات بجے کی نشستیں محفوظ کروا لی تھیں۔

سات اکتوبر کو صبح سویرے ہی میں نے سیرالیون کی ایئرلائن کے دفتر سے رابطہ

قائم کرنے کی کوشش کی مگر فون پر رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ آخرکار میں نے دفتر کا رخ کیا۔ حسن اتفاق سے دفتر کھلا تھا اور سیرالیون ایئرلائنز کے اکاؤنٹنٹ نے بلا حیل و حجت کنفرمیشن دے دی۔ پرواز کا وقت ساڑھے سات بجے شام تھا۔ انہوں نے تاکید کی کہ ہمیں ایئرپورٹ ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جانا چاہئے۔ پھر ان کے دفتر ہی سے ہم نے ہیلی کاپٹر سروس والوں سے رابطہ پیدا کیا اور آٹھ اکتوبر کی شام چھ بجے کی پرواز سے فری ٹاؤن سے لنگی ایئرپورٹ کے لئے نشستیں محفوظ کروا لیں۔

اب میں مطمئن تھا کہ انشاء اللہ تعالیٰ اگلے روز سیرالیون سے بخیرو خوبی روانہ ہو سکوں گا اور لائبیریا میں ۹ اکتوبر کی ریہرسل کے لئے بروقت پہنچ جاؤں گا۔ اس روز دوپہر میں اور نرگس ہوٹل کے کھانے کے کمرے میں لنچ کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک صاحب تشریف لے آئے انہوں نے اپنا تعارف کرایا کیپٹن بیگ اپنا نام بتایا۔ میں نے انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اپنا مزید تعارف کراتے ہوئے کہ کہ پی آئی اے کے ریٹائرڈ کیپٹن ہیں اور اب سیرالیون ایئرلائنز کے اکلوتے جہاز کے کپتان ہیں۔ انہوں نے یہ معلوم کرکے کہ اگلی شام ہم ان کے ہمسفر ہوں گے' بیحد خوشی کا اظہار کیا۔

رات کو کھانے پر کیپٹن بیگ سے پھر ملاقات ہوئی۔ گپ شپ چلتی رہی۔ مقامی حالات کے بارے میں انہوں نے ہمیں بہت مفید اور دلچسپ باتیں بتائیں۔ معلوم ہوا کہ سیرالیون کی حکومت اپنے ہوائی بیڑے میں اضافے کی خواہش رکھتی ہے اور یہ بھی چاہتی ہے کہ پی آئی اے اس سلسلے میں ان سے تعاون کرے۔ پاکستان سے تربیت یافتہ عملے کے بارے میں بھی انہوں نے سیرالیون ایئرلائنز کی دلچسپی کا اظہار کیا۔

اگلے روز صبح مجھے ہوٹل سے قصر صدارت لے جایا گیا۔ جنرل جوزف سیدو موحوح صدر مملکت کے روبرو میں نے اسناد سفارت پیش کیں۔ پھر ہم دونوں نے اپنی

سیرالیون کے صدر مملکت جوزف سیدو موموح کے ہمراہ پاکستان کے سفیر

اپنی حکومت کی جانب سے ایک دوسرے کو خیر سگالی کے جذبات اور باہمی دلچسپی کے امور سے آگاہ کیا۔ اس موقع پر وزیر خارجہ الحاج عبدالکریم کروما کے علاوہ صدر مملکت کی کیبنٹ کے اہم وزراء صاحبان بھی موجود تھے اور اس طرح میں دوپہر سے پہلے ہی اس تقریب سے فارغ ہو گیا۔

جنرل جوزف سیدو موموح سے ملاقات بے حد خوشگوار ماحول میں ہوئی ان کے دل میں پاکستان کے لئے بیحد احترام ہے۔ انہوں نے پاکستان کا دورہ کرنے کی خواہش کا مجھ سے اظہار بھی کیا اور اس بات پر بھی زور دیا کہ پاکستان اور سیرالیون اسلامی ملکوں کی تنظیم کے رکن ہونے کی حیثیت سے رشتہء اخوت میں بندھے ہوئے ہیں اور یہ کہ سیرالیون نے جارحیت کے خلاف پاکستان کے موقف کی ہمیشہ حمایت کی ہے۔ اس لئے بھی یہ ضروری ہے کہ پاکستان اور سیرالیون کے درمیان تعلقات کو مزید استوار کیا جائے اور مضبوط بنایا جائے۔

جنرل جوزف سیدو موموح نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اسلامی ممالک کی تنظیم میں پاکستان کو چاہئے کہ وہ سیرا لیون سے زیادہ سے زیادہ تعاون کرے اور اپنے اثر و رسوخ کو اس افریقی ریاست کے حق میں استعمال کرے ان دنوں سیرا لیون کو ٹرانسپورٹ کے بارے میں بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ سیرا لیون میں سڑکیں بہت ہی تھوڑی ہیں۔ یونیورسٹی کی عمارت فری ٹاؤن سے باہر واقع ہے تعلیم مفت ہے طلبہ کو فری ٹاؤن لے جانے وہاں سے واپس لانے کے لئے بہت سی دشواریاں تھیں مثلاً بسیں پرانی اور بوسیدہ ہونے کے باعث ناکارہ ہو چکی تھیں۔ اس لئے وہ طلبہ کی ضروریات کو پورا کر سکتی تھیں نہ عوام کی ضروریات کو۔

اگرچہ ہم ہر سال کسی نہ کسی مسئلے پر افریقی ملکوں سے ووٹ حاصل کرنے کے درپے رہتے ہیں لیکن جب کبھی ان ملکوں میں سے کسی نے ہماری طرف مدد کے لئے

دیکھا' ہم سے رجوع کیا' ہم نے بلا سوچے انکار کر دیا۔ سیرالیون ٹرانسپورٹ کے وزیر کے بقول زیادہ سے زیادہ چھ بسوں سے ان کی تکالیف کا ازالہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ہمارے دفتر خارجہ اور اسلامی ملکوں کی تنظیم نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ شاید ان کی ترجیحات بہت ہی مختلف ہیں جن میں افریقی ملکوں کی امداد کرنا شامل نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری تمام تر توجہ ان ملکوں کی طرف ہے جن کے باشندوں کی جسمانی رنگت اور جلد ہم لوگوں سے زیادہ سفید ہے۔ ہم بلاشبہ احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور یہی احساس ہماری اقتصادی' معاشی' سیاسی اور خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہوتا ہے۔

افریقہ ایک مکمل براعظم ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ۵۳ ارکان افریقی ہیں۔ رنگ نسل اور علاقائی بندھن ان ملکوں کے درمیان ایک مضبوط رشتے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تیسری دنیا میں اس براعظم کا ایک خاص مقام ہے۔ یہ تمام افریقی ممالک افریقی اتحاد کی تنظیم ''آرگنائزیشن آف افریقن یونٹی'' کے اراکین ہیں۔ یہ غیر جانبدار ملکوں کی تنظیم کے بھی اراکین ہیں۔ سوائے نائیجریا کے مسلمان آبادی والے ممالک او آئی سی کے بھی ممبر ہیں۔

براعظم افریقہ کے بعض ممالک کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے۔ ان سب ملکوں کی پاکستان کے بارے میں شدید خواہش ہے کہ پاکستان کے ساتھ ان کے محبت اور خیر سگالی کے تعلقات زیادہ سے زیادہ گہرے ہونے چاہئیں اور یہ کہ پاکستان کے بارے میں انہیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ استحصالی عزائم نہیں رکھتا۔ عالمی سطح پر ان ممالک نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔ لیکن ہم تو لین دین پہ خاک محبت پاک پر یقین رکھے ہیں۔

میری دانست میں آئندہ پندرہ سال کے لئے براعظم افریقہ ہماری مصنوعات کی

برآمدگی کے لئے بیحد مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ وزارت خارجہ وزارت تجارت، ایکسپورٹ پروموشن بیورو اور دورے ادارے جن کا فرض منصبی سیاسی اور تجارتی روابط کو فروغ دینا اور انہیں قائم رکھنا ہے۔ براعظم افریقہ کے ساتھ کوئی رابطہ پیدا کرنے کو تیار نہیں۔

سیرالیون ہماری ہی طرح غریب ہے

جولائی ۱۹۸۶ء سے جولائی ۱۹۸۹ء تک مجھے کئی بار سیرالیون آنے جانے کا اتفاق ہوا۔ ضرورت اور آبادی کے لحاظ سے اس ملک میں بجلی کی بے حد کمی ہے۔

بجلی پیدا کرنے کے وسائل محدود ہونے کے باعث بجلی میں کفایت شعاری کی مہم براہ راست صدر جنرل جوزف کی نگرانی میں چلائی جا رہی ہے اس مہم میں ساری قوم خوش دلی کے ساتھ حکومت سے تعاون کر رہی ہے۔ دکانیں اور تمام تجارتی ادارے شام پانچ بجے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ شام کے بعد بجلی جلانے کی ضرورت نہ ہو۔

ملک بھر میں آرائشی روشنیوں کی قطعی ممانعت ہے۔ ہوٹل اور ریستوران بجلی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے نجی جنریٹر استمال کرتے ہیں۔ دن میں کسی بھی وقت لوڈشیڈنگ کی جا سکتی ہے۔ عوام کو حکومت کی مشکلات کا بہت احساس ہے اس لئے لوڈشیڈنگ کے خلاف کبھی کسی نے صدائے احتجاج بلند نہیں کی کیا وزیر کیا مشیر' کیا بادشاہ کیا فقیر یعنی چھوٹے بڑے ہر طبقے کے سبھی افراد قانون پر چلنے اور فالتو بجلی کی خرچ کرنے سے احتراز اور اجتناب کرتے ہیں۔

مجھے کئی مرتبہ جناب الحاج عبد الکریم کروما وزیر خارجہ کے گھر جانے کا موقع ملا ہے۔ موصوف پچھلے بارہ سال سے پارلیمنٹ کے رکن چلے آتے ہیں اور گزشتہ آٹھ سال سے وزیر خارجہ کے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک اچھے مسلمان اور عالم و فاضل انسان ہیں۔ انہیں بین الاقوامی امور پر عبور حاصل ہے۔ انہوں نے دنیا بھر کی سیاحت کی ہے ماسوائے پاکستان کے کہ انہیں یہاں سے کبھی دعوت نامہ ہی نہیں ملا۔

(نوٹ ـ مارچ ۱۹۹۲ء میں وہ پہلی بار پاکستان آئے تھے اور شاید آخری بار۔ اب سیرالیون میں فوجی حکومت کا قبضہ ہے چنانچہ اب وہ نئی حکومت میں وزیر نہیں ہیں۔)

سیرالیون اور مسلم ممالک کے درمیان تعلقات کو صحیح خطوط پر الحاج عبدالکریم کروماہی نے استوار کیا ہے اسرائیل کو سیرالیون سے باہر رکھنے میں انہی کا عمل دخل ہے۔ ۱۹۷۳ء کو جب اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا تھا تو تمام افریقی ممالک نے اسرائیلی جارحیت کے خلاف اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات ختم کر دیئے تھے۔ مصر نے تو بعد ازاں کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے پر دستخط بھی کئے اور کئی ایک افریقی ممالک نے اسرائیل سے دوبارہ سفارتی تعلقات قائم کر لئے مگر سیرالیون نے اب تک ایسا نہیں کیا۔ حتیٰ کہ جب اسرائیل نے اس کے متعلق سلسلہ جنبانی کی تو یہ الحاج عبدالکریم کروماہی کا کیبنٹ پر اثر تھا کہ اسرائیل کی درخواست یکسر مسترد کر دی گئی اور اسرائیل سے یہ کہا گیا کہ چونکہ یہ ایک اہم اور نازک قومی اور اسلامی مسئلہ ہے اور سیرالیون بھی اسلامی ملکوں کی تنظیم کا ایک رکن ہے اس لئے حکومت ریفرنڈم کے ذریعے عوام کے جذبات معلوم کر کے ہی کوئی فیصلہ کر سکے گی۔

الحاج عبدالکریم کروما انفرادی حیثیت سے بھی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت بھلائی اور بہتری کے لئے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں وہ اپنے حلقہ انتخاب میں بہت بڑی مسجد بنا رہے ہیں جس کے ساتھ ایک مدرسہ اور لائبریری بھی ہو گی۔ وہ مسجد کی تعمیر کے لئے کسی سے مالی امداد اور چندہ نہیں مانگتے وہ سب کچھ اپنی گرہ سے خرچ کر رہے ہیں مسجد کی تعمیر میں ان کا جذبہ مخلصانہ ہے۔ اس سلسلے میں نہ انہیں کسی ستائش اور صلے کی تمنا ہے نہ شہرت و ناموری کی ضرورت میں نے ان کے مخلصانہ دینی جذبات کا اندازہ لگاتے ہوئے انہیں پاکستان سے مختلف اسلامی موضاعات پر بہت سی کتابیں منگوا کر دیں اور قرآن مجید کے ایسے نسخے بھی منگوا دیئے جن کے ترجمے انگریزی زبان میں ہیں۔

الحاج عبدالکریم کروما کے حسن اخلاق اور جذبہ اخوت نے ہم دونوں کے درمیان

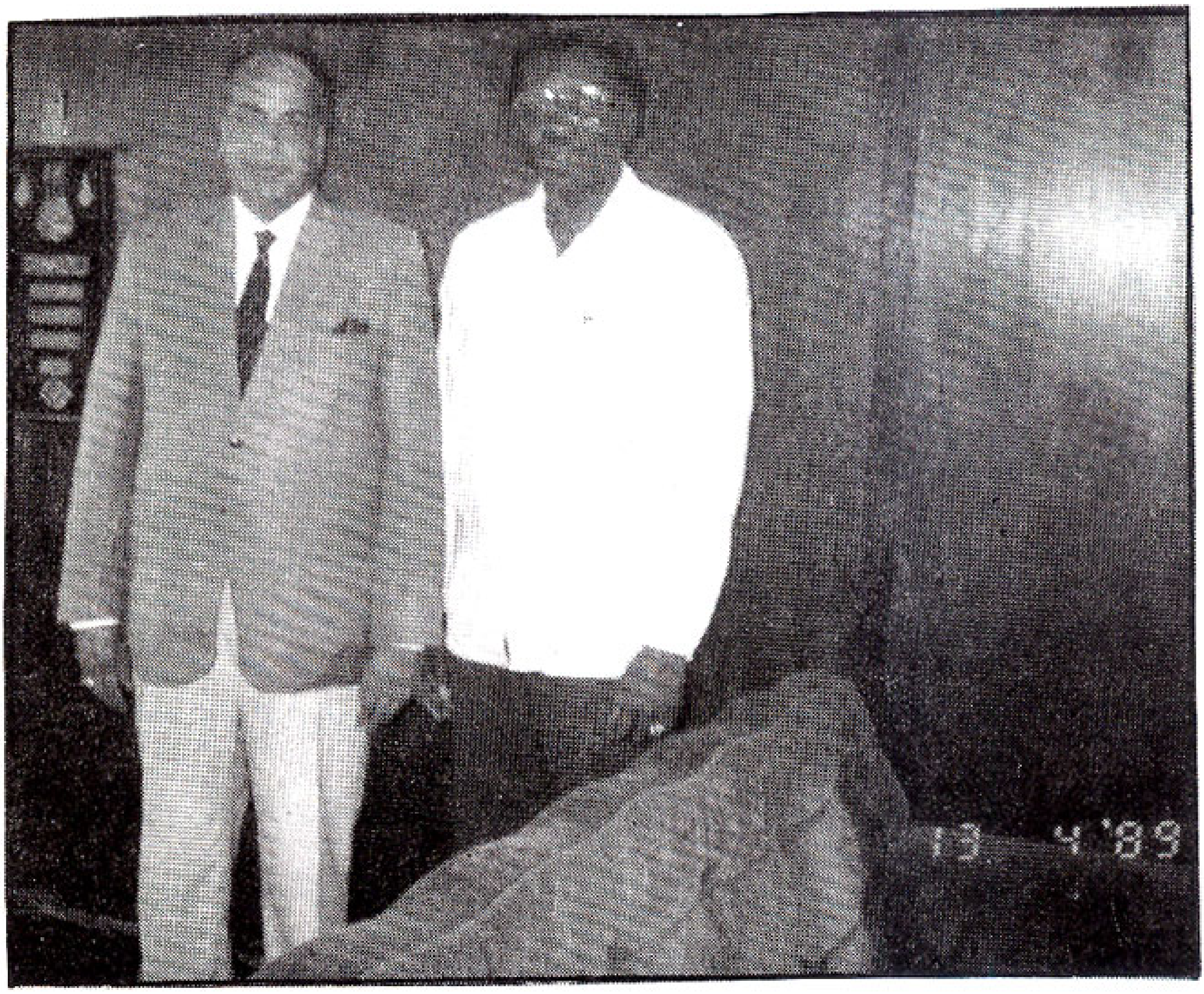

سیرالیون کے وزیر خارجہ عبدالکریم کروما اور پاکستان کے سفیر

پروٹوکول کے علاوہ دوستی کا رشتہ استوار کر دیا تھا۔ ان کی یہ شدت سے خواہش رہی کہ سیرالیون میں میرے سفارتی دورے زیادہ سے زیادہ رہیں۔ تاکہ ہم دونوں کو باہم مل بیٹھنے کے مواقع زیادہ سے زیادہ میسر آتے رہیں۔ مگر دشواری یہ تھی کہ ہمارے دفتر خارجہ کے قواعد و ضوابط کے مطابق یہ دورے مسلسل جاری نہیں رکھے جا سکتے۔ اگر کوئی بیحد ضروری مشن پیش بھی آ جائے تو اس کے لئے وزارت خارجہ سے پیشگی اجازت لینا ضروری ہوتا ہے۔

وزارت خارجہ کا حال یہ ہے کہ اجازت طلب کرنے پر اول تو کوئی جواب ہی نہیں دیا جاتا اور اگر پیہم اصرار پر جواب آتا بھی ہے تو وہ اکثر نفی میں ہوتا ہے اس تلخ حقیقت کا مجھے بھی تجربہ ہو چکا ہے وہ اس طرح کہ ایک بار حاجی عبد الکریم کروما نے اقوام متحدہ کے ایک اجلاس سے واپس آ کر بذریعہ ٹیلکس مجھے دعوت نامہ بھیجا کہ میں اور میری اہلیہ نرگس دو چار دن کے لئے سیرالیون پہنچیں تاکہ فرصت کے لمحات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں ممالک کے باہمی تعلقات مضبوط کرنے کے لئے چند تجاویز پر غور کیا جا سکے۔ میں نے اس دعوت نامہ کے پیش نظر دفتر خارجہ سے دورے کی اجازت مانگی جس کا متوقع طور پر جواب نفی ہی میں آیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہاں سے پھر ٹیلکس آیا جس میں سیرالیون کے یوم آزادی کی تقریب میں مجھے مدعو کیا گیا تھا میں نے اس مرتبہ پھر وزارت خارجہ سے رجوع کیا اور تقریب میں شمولیت کی اجازت مانگی مگر وہاں سے بھی نفی ہی میں جواب آیا۔ اس مسئلے پر میں نے وزارت خارجہ کی جان نہیں چھوڑی علاوہ دیگر باتوں کے میں نے استفسار کیا کہ اس قسم کی ناروا پابندیوں کے ہوتے ہوئے یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے۔ کہ میں سیرا لیون کی حکومت کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھ سکوں تاکہ حکومت پاکستان ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ ایک بار وزیر خارجہ کی ذاتی دعوت میں شریک نہ ہو سکا دوسری بار صدر مملکت نے یوم آزادی پر بلایا اور میں نہ جا سکا۔ آخر باہمی روابط اور تعلقات دونوں ملکوں یعنی سیرالیون اور پاکستان کے درمیان کیونکر پیدا ہوں گے جب کہ اس کی کسی دعوت پر آپ کی جانب

سے لبیک کہنے کی اجازت نہیں۔

وزارت خارجہ کی طرف سے میرے سوال کا جواب باصواب کچھ اس طرح سے آیا کہ سیرالیون بھی چونکہ ہماری طرح ایک غریب اور اقتصادی بدحالی کا شکار ملک ہے۔ اس لئے وہاں کی حکومت ہماری مالی مشکلات کا احساس کرے گی اور اس کی تقریبات میں میری عدم شرکت کو نظرانداز کر دے گی اور برا نہیں مانے گی۔ یہ منطق عام آدمی کی فہم سے بالاتر ہے بہرحال ہماری وزارت خارجہ کے سوچ کے انداز عام آدمی کی عقل و فہم سے مختلف ہیں۔

میرے دو مرتبہ کے سفر پر صرف دو ہزار ڈالر سے زیادہ خرچ نہ آتا۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے محمد خان جونیجو کو جو اس وقت وزیر اعظم پاکستان تھے' ایک خط لکھا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کے عہد حکومت میں سفیر صاحبان اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر سکیں اور کامیابیوں سے ہمکنار ہو سکیں تو اس قسم کی بے جا اور ناروا پابندیوں کو اٹھا دیا جائے جن کے باعث ہم لوگ بے دست و پا ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میں نے مزید لکھا کہ سفیر صاحبان کو مقامی حالات کے مطابق کسی معاملے کا ازخود فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تاکہ وہ بروقت کوئی ٹھوس عملی قدم اٹھا لیا کریں اور اس کے لئے کسی کی طرف سے اجازت کے محتاج نہ ہوں۔ اور یہ بھی لکھا کہ سفیر صاحبان کو کس ملک میں کتنی بار آنا جانا ہے اور کہاں نہیں جانا ہے یہ سب کچھ ان کی ذاتی صوابدید پر موقوف ہونا چاہئے۔

مجھے یقین ہے کہ میرا یہ خط ان کی نظر سے ضرور گزرا مگر انہیں اس کے سیاق و سباق کا ادراک ہوا نہ کوئی اندازہ وہ تو اس وقت جرنیلوں کو سوزوکی کاروں میں بٹھانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ میں نے انہیں تجویز پیش کی تھی کہ ملک سے باہر جاتے ہوئے وہ اپنے ہمراہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد نہ لے جایا کریں بلکہ پاکستان کے معاشی حالات کے پیش نظر جس قدر ہو سکے ہمراہیوں کی تعداد کم کر دیں۔ اسی طرح

وزرائے کرام کے غیر ملکی دوروں کو کم کر دیا جائے اور ان کے حاشیہ نشینوں کی تعداد بھی گھٹا دی جائے نیز اقوام متحدہ میں ہمارے اراکین کی تعداد کو بھی محدود کر دیا جائے۔ الغرض اس طرح جتنی بھی بچت ہو سکے وہ کریں۔ پھر اسی رقم کو سفیر صاحبان کے اخراجات کے لئے مختص کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی سفارتی ذمہ داریوں کو بخوبی پورا کر سکیں اور اپنے فرائض منصبی سے بہ تمام و کمال عہدہ برآ ہو سکیں۔

کفایت شعاری کے حکم کی جس طرح تعمیل کرائی گئی وہ نہایت بھونڈا طریقہ ثابت ہوا سفیر صاحبان کو حکم دیا گیا کہ وہ سفر کرتے وقت جس قدر ممکن ہو کفایت شعاری سے کام لیں۔ ہمیشہ اکانومی کلاس میں سفر کریں۔ اس حکم کے کیا عوامل تھے اور اس سے کتنی بچت ہوئی یہ تو وزارت خزانہ ہی جانتی ہے البتہ شواہد و قرئن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر بہت ہی تھوڑی بچت ہوئی۔ یہ محض سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے ایک سطحی اقدام تھا اور ایک کھوکھلا نعرہ تھا۔

میں بلا خوف تردید یہ بات دعوی سے کہہ سکتا ہوں کہ جہاں واقعی کفایت شعاری سے کام لینے کی ضرورت تھی وہاں کفایت شعاری کے لئے جناب محمد خان جونیجو نے بالکل کوئی توجہ نہیں دی جس سے ملکی خزانے پر سے بوجھ کم ہوا نہ ہی اس اقدام سے محمد خان جونیجو کی شہرت ہی میں کوئی اضافہ ہو۔

اگر محمد خان جونیجو سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھاتے اور ملکی وسائل اور ذرائع پیداوار کو کسی اچھے منصوبے کے تحت استعمال میں لاتے تو عوام بچت کی سکیموں کو عملی جامہ پہنانے میں ان کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے۔ مگر کفایت شعاری کے احکام پر عملدر آمد بجلی کے مناسب استعمال کے بارے میں بھی نہ ہوا۔ یہ کس قدر تضاد ہے کہ عوام تو لوڈشیڈنگ میں تڑپیں اور سرکاری تقریبات میں بجلی کا لا محدود استعمال جائز سمجھا جائے۔

وزیروں' مشیروں اور بااثر لوگوں کے ہمارے ہاں نجی تقریبات میں بجلی کا استعمال بے تحاشا ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے زراعت کے لئے مناسب مقدار میں بھی بجلی مہیا

نہیں ہو سکتی۔ عرصہ دراز سے یہی وطیرہ چلا آتا ہے جو بھی کوئی برسراقتدار آتا ہے اس کی حکومت یہ اعلان کرتی ہے کہ پاکستان عنقریب ہی بجلی کے معاملے میں خود کفیل ہو جائے گا لیکن اے بسا آرزوئے کے خاک شدہ

وزیراعظم اور صدر مملکت ہر مرتبہ قوم کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ چند ہفتوں میں گھر گھر بجلی مہیا کر دی جائے گی صنعت اور زراعت کے لئے بھی سپلائی میں کوئی کمی نہ آنے دی جائے گی اور یہ کہ لوڈشیڈنگ اول تو ہو گی ہی نہیں بفرض محال اگر ہو بھی گئی تو وہ بہت ہی کم ہو گی نہ ہونے کے برابر لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیداوار میں اضافے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ بجلی کی پیداوار میں اضافہ کرنے کی بجائے قیمت میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور اس طرح بجلی کے استعمال میں کفایت شعاری کی مہم بھی ناکام ہوجاتی ہے۔ کیونکہ زیادہ نرخوں کی وجہ سے بجلی اسی تناسب میں چوری ہوتی ہے۔

ارباب اقتدار تو اپنی طرف سے بجلی کی کفایت شعاری کی اپیل کر دیتے ہیں مگر خود اپنی ضرورت کو کم کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے ارباب اقتدار کے قول و فعل کے اس تضاد نے قومی سطح پر ہر شعبہ حیات کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ یہ ایک المیہ ہے اور ہمیں اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

لائبیریا

LIBERIA

میں نے ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء کو عکرہ میں گھانا حکومت کے ہاں اسناد سفارت پیش کیں۔ برکینافاسو۔ لائبیریا۔ سیرالیون اور ٹوگو کے امور خارجہ کے دفاتر کے ساتھ بھی رابطہ کر رکھا تھا۔ اور ان سے درخواست کی تھی کہ کوئی نزدیکی تاریخ اسناد سفارت پیش کرنے کے لئے مقرر کر دی جائے۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے اوائل میں مجھے سیرالیون اور لائبیریا کے دفاتر امور خارجہ سے اطلاع ملی کہ مجھے سیرالیون میں ۸ اکتوبر کو اسناد سفارت صدر مملکت جوزف سیدو موموح کے روبرو پیش کرنے ہیں اور لائبیریا سے آمدہ اطلاع کے مطابق مجھے صدر مملکت ڈاکٹر سیموئل کے ڈو کے روبرو ۱۰ اکتوبر کو اسی مقصد کے لئے پیش ہونا ہے۔ یہ پروگرام کچھ دشوار نظر آتا تھا۔ مغربی افریقہ کے اس ریجن میں ہوائی سفر کے علاوہ دوسرا کوئی مناسب ذریعہ سفر نہیں ہے۔ اب اگر مجھے ۸ اکتوبر کو سیرالیون کے دارالحکومت فری ٹاؤن میں اسناد سفارت پیش کرنا ہیں۔ تو مجھے عکرہ سے ۶ اکتوبر کو روانہ ہونا تھا۔ ۸ اکتوبر کو وہاں سے فارغ ہو کر مجھے لائبیریا کے دارالحکومت منروویا اسی شام پہنچ جانا چاہئے تھا۔ جس کے لئے سیرالیون ایر لائنز کی شام کی فلائٹ سے سفر کرنا تھا۔ ۸ اکتوبر کو اسناد سفارت پیش کرنے کے بعد میں ہوٹل بینتومانی BANTOMANI میں اپنی اہلیہ۔ حسیب خالد اور ان کی اہلیہ کے ہمراہ کھانا کھا رہا تھا کہ کیپٹن بیگ بڑی سرعت سے ہماری میز پر تشریف لائے۔ وہ کچھ پشیماں سے تھے انہوں نے ہمیں بڑے تاسف سے بتایا کہ سیرالیون ایر لائنز کی شام

کی پرواز منسوخ کر دی گئی ہے اور وہ ہمیں منرودیا نہ لے جا سکیں گے۔ کسی بھی ایرلائن کی کوئی بھی پرواز منسوخ ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ لیکن ۸ اکتوبر کی اس شام کو میرا اور نرگس کو منرودیا پہنچنا ضروری تھا۔ اگلے روز مجھے اسناد پیش کرنے کے لئے ریہرسل میں شامل ہونا تھا۔ شام کی پرواز سے سفر کی اطلاع میں نے پروٹوکول کو دے رکھی تھی۔ میرے استفسار پر کیپٹن بیگ نے بتایا کہ پرواز منسوخ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جہاز کے لئے اس وقت تک صرف تین مسافروں نے نشستیں حاصل کی ہیں اور ایر لائن کے مطابق ۳۵۰ نشستوں والے جہاز میں تین مسافروں کو لے جانا کچھ مناسب نہیں لگتا۔ یہ ایسی صورت حال تھی جس کے لئے ہم تیار نہ تھے۔ منرودیا میں ہونے والی تقریب کے پیش نظر مجھے تشویش بھی ہوئی لیکن میری تشویش اور بڑھ گئی جب کیپٹن بیگ نے بتایا کہ اس روز منرودیا کے لئے کسی دیگر ایرلائن کی پرواز بھی نہیں ہے۔ البتہ اگلے روز بعد دوپہر کے ایل ایم کی ایک پرواز فری ٹاؤن سے ہوتی ہوئی منرودیا جائے گی۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اور حسیب خالد کے ایل ایم کے دفتر میں پہنچے اور اگلے روز کے لئے دو نشستوں کے لئے فرمائش کی۔ مقامی منیجر نے بتایا کہ وہ اس بارے میں اگلے روز صبح ہی کچھ بتا سکے گا اور کوئی دوسری پرواز بھی میسر نہ تھی۔ عجیب بے یقینی کی کیفیت تھی۔ بہرحال کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ۹ اکتوبر کو صبح ہی سے حسیب خالد نے فری ٹاؤن سے منرودیا کے لئے روانگی کیلئے تگ و دو شروع کر دی۔ دفتر امور خارجہ کے پروٹوکول افسر کو بھی ملوث کر لیا۔ اور اس کے ذریعے کے ایل ایم کے صدر دفتر اور مقامی دفتر کے علاوہ سینگال کے دارالحکومت ڈاکار کے دفتر سے بھی رابطہ کیا۔ اور بالآخر دو نشستیں لینے میں کامیاب ہو گئے۔ جونہی یہ نشستیں کنفرم ہوئیں۔ ہم نے اس پرواز کے متعلق لائبیریا کے دفتر امور خارجہ کو بذریعہ ٹیلکس اطلاع کر دی۔ بعد دوپہر کی اس پرواز سے میں اور نرگس منرودیا پہنچ گئے۔

ایئرپورٹ پر پروٹوکول افسر آیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ اگلے روز کی تقریب کے لئے ریہرسل کا وقت گزر چکا ہے۔ دراصل ریہرسل سرے سے نہ ہو سکی تھی۔ ۱۰ اکتوبر کے لئے چار سفیروں کو بلایا ہوا تھا۔ لیکن کوئی بھی نہ پہنچ سکا تھا۔ کار کی جانب روانہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ ایک اور سفیر بھی کشاں کشاں معہ سامان کے آ رہے ہیں۔ یہ سینگال سے تشریف لائے تھے اور ہمارے ساتھ ہی جہاز میں سوار تھے۔ منرودیا میں ان کا انتظار نہ تھا۔ کیونکہ انہوں نے جہاز میں نشست نہ ملنے کی وجہ سے معذرت کر لی تھی۔ مگر عین آخری وقت پر انہیں بھی نشست مل گئی اور وہ بھی تقریب کے لئے تشریف لے آئے۔ ہم سب کو ایک ہی گاڑی میں لادا گیا۔ سواریاں زیادہ تھیں اور گاڑی ایک ہی تھی۔ ہوٹل پریذیڈنٹ پہنچے۔ یہ ہوٹل سرکار کی ملکیت ہے۔ ایک پہاڑی پر واقع ہے ایئرپورٹ سے اس ہوٹل تک کا فاصلہ تقریباً ۵۰ کلومیٹر ہے۔ تنگ سی سڑک گھنے جنگلوں کے درمیان سے بل کھاتی ہوئی گزرتی ہے۔ ہوٹل میں لائبیریا کی دفتر امور خارجہ کی سینئر ڈپٹی چیف آف پروٹوکول سے ملاقات ہوئی۔ جس نے مجھے اگلے روز کے پروگرام کے بارے میں آگاہ کیا۔ یہ محترمہ صدر مملکت ڈاکٹر سیموئل کے ڈو کے مزاج میں دخل رکھتی تھیں انہوں نے بتایا کہ صدر سیموئل ڈو پاکستان اور اس کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اگلے روز جاننا چاہیں گے کہ پاکستان ان کے ملک کے لئے کیا کر سکتا ہے۔ اگلے روز گارڈ آف آنر کے بعد میں صدر مملکت کے روبرو پیش ہوا۔ اسناد سفارت پیش کیں۔ رسمی مکالمے ادا ہوئے۔ خیر سگالی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا گیا۔ اس موقع پر چیف آف پروٹوکول سینئر ڈپٹی چیف آف پروٹوکول۔ وزیر امور خارجہ۔ وزیر خزانہ موجود تھے۔

تقریب کے بعد چائے کی میز پر بیٹھے تو صدر سیموئل ڈو نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

صدر۔ ایمبیسڈر علی شیخ کیا آپ مسٹر بھٹی کو جانتے ہیں

میں ۔ جی ہاں ایکسیلنسی ۔ مسٹر بھٹی رات ہوٹل میں مجھے ملنے کے لئے آئے تھے۔
صدر ۔ مسٹر بھٹی کے لئے میرے دل میں بڑی قدر و منزلت ہے۔ بے حد خوش خلق اور ملنسار شخص ہیں۔ محنتی ہیں' پاکستان سے جب بھی آتے ہیں۔ میرے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتے ہیں۔ پھر انہوں نے آنکس کے بنے ہوئے ایک ٹیلیفون سٹینڈ کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔
"یہ تحفہ وہ پچھلے ہفتے میرے لئے لائے تھے۔ دراصل میں اپنے ملک میں مقیم پاکستانیوں کے ساتھ بے حد خوش ہوں۔ سب کے سب محنتی ہیں۔ مقامی قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔"
میں ۔ ایکسلنسی۔ میں حکومت پاکستان کی جانب سے آپ کے نیک جذبات کے اظہار کے لئے بے حد شکرگزار ہوں۔ لائبیریا میں مقیم پاکستانی اس ملک کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور ان کا فرض ہے کہ وہ اس وطن کی ترقی کے لئے کوشاں ہوں۔
صدر ۔ میں آپ کے صدر کا بہت معترف ہوں۔ وہ بڑے دلیر ہیں اور طاقتور حکمران ہیں۔ پہلی ملاقات میں ہی انہوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ انہیں میرا سلام دیں اور یقین دلائیں کہ لائبیریا اور پاکستان کی دوستی باہمی خلوص اور محبت پر قائم رہے گی۔
میں ۔ میں بے حد شکرگزار ہوں۔
صدر ۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ صدر جنرل ضیاء الحق کبھی لائبیریا میں ہمارے مہمان ہوں۔
میں ۔ جناب عالی۔ میں آپ کا پیغام صدر مملکت تک پہنچا دوں گا۔

صدر مملکت کے ساتھ میرا انٹرویو اب اختتام کو پہنچا اور میں ہوٹل واپس آگیا۔ اس روز صدر نے تین دوسرے سفیر صاحبان سے اسناد سفارت بھی وصول کئے۔ پہلی ہی اس ملاقات میں صدر نے جس طرح لائبیریا میں مقیم پاکستانیوں کا ذکر کیا اور صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی تعریف کی۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ مسٹر بھٹی جن کا ذکر

صدر ڈو نے کیا تھا- پاکستان سے ۳۰ برس قبل لائبیریا آئے تھے- وہ منٹگمری روڈ پر کسی موٹر ورکشاپ میں "چھوٹے" تھے- یعنی ورکشاپ میں کام کرنے والے کاریگروں کی مدد پر مامور تھے- اپنی ملازمت سے تنگ آ کر وہ بھاگ نکلے- اور کراچی سے ایک سمندری جہاز میں چپکے سے سوار ہو گئے- جہاز جب لائبیریا پہنچا تو انہیں جہاز سے اتار دیا گیا- یوں ان پر در لائبیریا کھلا- یہاں انہوں نے ابتدا میں چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں- ایک تو وہ غیر قانونی طور پر لائبیریا آئے تھے- ملازمت کا پروانہ نہ مل سکتا تھا- دوسرے وہ مسلمان تھے اور پھر ان پڑھ تھے- ملازمت دینے والے متعصب ہندو تھے- اس لئے بھٹی صاحب یہاں بھی تنگ ہی رہے- لیکن ہمت نہ ہارے- کسی قبائلی چیف کے ہاں ملازم ہو گئے- وہ انہیں اپنے فارم پر لے گیا- محنت اور دیانت نے راہبری کی اور جس وقت میں ان سے ملا وہ دو لائبیرین بیویوں- آٹھ بچوں اور وسیع و عریض کافی فارم کے مالک تھے- ایشیائی اور افریقی لوگوں میں یکساں طور پر مقبول - باثر اتنے کہ صدر مملکت انہیں ذاتی طور پر جانتے تھے- سماجی طور پر وہ بہت ہردلعزیز ہیں- اور ارباب اقتدار کے ساتھ ان کے مضبوط رابطے استوار ہیں- یہ فقط ان کی محنت' لگن' دیانتداری اور مولیٰ کریم کی مہربانی ہے کہ ایک مفلوک الحال بچہ دیار غیر میں پاکستان کا نام روشن کئے ہوئے ہے-

جمہوریت پاکستانی سٹائل

لائبیریا کے صدر مملکت جنرل ڈاکٹر سیموئیل کے ڈو SAMUEL K. DOE ۱۲ اپریل ۱۹۸۰ء کو برسراقتدار آئے۔ اس روز انہوں نے اپنے بارہ نان کمشنڈ افسروں کی امداد سے منتخب صدر ولیم ٹالبرٹ کو برطرف کر کے قتل کر دیا۔ دستور کو منسوخ کر کے ۱۵ رکنی کابینہ تشکیل دی اور خود صدر مملکت بن بیٹھے۔ وہ خود بھی اس وقت نان کمشنڈ افسر تھے۔ صدر کے بینڈ میں ماسٹر سارجنٹ تھے۔ صدر مملکت کے ساتھ ساتھ انہوں نے لائبیریا کی افواج کے کمانڈر انچیف کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ منتخب صدر ولیم ٹالبرٹ نے ۱۹۷۱ء میں اپنے پیش رو ولیم ٹب مین کی وفات پر یہ عہدہ سنبھالا تھا۔ اگلے سال وہ عام انتخاب میں صدر منتخب ہوئے تھے۔ ولیم ٹب مین ۱۹۴۳ء میں صدر منتخب ہوئے تھے اور ۱۹۷۱ء میں اپنی وفات تک آٹھ مرتبہ لائبہ ا
تھے۔ ولیم ٹب مین اور ولیم ٹالبرٹ امریکی نژ
جو امریکہ سے فرار ہو کر لائبیریا میں آباد
صدر سیموئل کے ڈو مقامی افریقی تھے اور
بڑے فخر سے پیش کرتے تھے۔ صدر ڈو نے دستور منسوخ کر دیا تھا۔ اب ایک نیا دستور بنایا گیا۔ اس نے خود تو اسے ۱۲ اپریل ۱۹۸۳ء کو منظور کر لیا۔ بعد میں قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ ۳ جولائی ۱۹۸۴ء کے ریفرنڈم میں قوم نے بھی اس دستور کی منظوری دیدی۔ نئے دستور کے تحت لائبیریا میں درمیانی مدت کے لئے ایک مجلس شوریٰ تشکیل دی گئی۔ اس کے تمام ممبران صدر مملکت نے نامزد کئے۔ صدر مملکت

نے یہ بھی اعلان کیا کہ عام انتخابات اکتوبر ۱۹۸۵ء میں ہونگے۔ ساتھ ہی انہوں نے سیاسی پارٹیوں اور سرگرمیوں سے پابندی اٹھا لی۔ انتخابات کے قوانین کے تحت البتہ یہ پابندی لگا دی گئی کہ انتخابات میں حصہ لینے کے لئے سیاسی پارٹیوں کو رجسٹر ہونا ہو گا۔ رجسٹریشن کے لئے حکومت نے ڈنڈی ماری اور سیاسی پارٹیوں کی حوصلہ شکنی کے لئے بہت سے اقدامات کئے کل چھ پارٹیوں نے رجسٹریشن کے لئے درخواستیں دیں۔ ان میں سے صرف چار کو رجسٹر کیا گیا اور ان چار میں سے دو کو تو عین الیکشن سے ایک روز پہلے رجسٹریشن سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ انتخابات کا نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ صدر مملکت کو ۹۵ فیصد ووٹ ملے اور وہ صدر منتخب ہو گئے۔ ان کی پارٹی کو سینٹ کی ۲۶ میں سے ۲۱ نشستیں ملیں اور قومی اسمبلی کی ۶۹ میں سے ۴۵ نشستیں ملیں۔ صدر مملکت پر انتخابی دھاندلیوں کا الزام لگایا گیا۔ امریکہ نے بھی ان الزامات کی تائید کی اور صدر مملکت پر دباؤ ڈالا کہ وہ انتخابات دوبارہ کرائیں۔ لیکن صدر ڈاکٹر ڈو نہ مانے۔ ۱۲ نومبر ۱۹۸۵ء کو صدر ڈو کو انقلاب کے ذریعے ہٹانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ باغیوں نے دارالحکومت کا محاصرہ کر لیا۔ ان میں فوجی اور سویلین بھی شامل تھے۔ صدر مملکت کے دفاتر کا گھیراؤ کر لیا گیا اور انہیں کہا گیا کہ وہ اپنے ہمراہوں کے ہمراہ دفتر سے باہر آ جائیں اور سرنڈر کر دیں۔ یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ صدر کے ذاتی محافظوں کو پہلے ہی گرفتار کیا جا چکا تھا۔ لیکن باغیوں سے ایک معمولی سی لغزش ہو گئی۔ انہوں نے صدر کے دفاتر کا گھیراؤ تو کر لیا۔ لیکن ٹیلیفون کنکشن کاٹنا بھول گئے۔ صدر مملکت نے اپنے اوسان بحال رکھے اور ان اسرائیلی کمانڈوز کو اپنی مدد کے لئے بلایا جو منرودیا کی چھاؤنی میں لائبیریا کے فوجیوں کو تربیت دینے پر مامور تھے۔ انہوں نے سرعت سے مناسب اقدام کئے اور صدر مملکت کو باغیوں کے گھیراؤ سے آزاد کرا لیا۔ باغیوں کا سردار ٹامس کوونپا THOMAS QUIWONKPA کو قتل کر دیا گیا۔ اس

کی لاش کو منرودیا کی سڑکوں پر جیپ کے پیچھے باندھ کر پھرایا گیا۔ شنید ہے کہ اس کا دل نکال کر صدر مملکت کو ایک طشت میں پیش بھی کیا گیا۔ اور انہوں نے اسے چکھا۔ اس روایت کا ثبوت تو کوئی نہیں لیکن صدر مملکت نے اگر ایسا کیا تو یہ اقدام ان کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ دیگر یہ کہ مقامی طور پر تو ایسی کہانیوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ لیکن امریکی ذرائع نے تو یہ الزام بھی لگایا کہ صدر ڈاکٹر ڈو نے تو باغی لیڈر ٹامس کوونپا THOMAS QUIWONKPA کا دل عوام کے سامنے کھایا اور کہا کہ ان کا یہ حریف شریف اور رحم دل تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسا اچھا دل کوے اور چیلیں کھائیں۔ اب امریکہ باقاعدہ ناراض ہو چکا تھا اور کھلم کھلا اس ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔ صدر مملکت کو اس ناراضگی کا بخوبی احساس تھا۔ لائبیریا کی اقتصادی حالت ہر گزرنے والے دن کے ساتھ روبہ زوال تھی۔ امریکہ نے امداد دینے سے دست کشی کر رکھی تھی۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی تھی۔ لائبیریا کی کرنسی کی قیمت بھی گرتی جا رہی تھی۔ لائبیریا ۱۸۴۷ء میں معرض وجود میں آیا تھا۔ اپنی کرنسی کی بجائے اس نے امریکی ڈالر کو ہی اپنی کرنسی قرار دیا تھا۔ اسی طرح اس نے اپنے دستور کی بنیاد بھی امریکی دستور پر رکھی تھی۔ قومی جھنڈا بھی امریکی فلیگ کی نقل تھا۔ غرضیکہ لائبیریا دستور کرنسی اور فلیگ کی حد تک امریکہ کی نقل تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات بھی اتنے گہرے تھے کہ لائبیریا کو امریکی ریاست کہا جا سکتا تھا۔ اب جو امریکہ بوجوہ صدر مملکت سے ناراض ہوا تو لائبیریا کی ہر شے نامقبول ٹھہری۔ لائبیریا اپنی کرنسی نہیں چھاپتا تھا۔ بلکہ امریکہ سے درآمد کرتا تھا۔ امریکہ نے امداد تو بند کر ہی دی۔ امریکی کرنسی کی لائبیریا کو برآمد بھی بند کر دی اور لائبیریا سے کہا کہ وہ اپنی کرنسی خود چھاپے لیکن یہ بھی ہدایت کر دی کہ وہ ڈالر نوٹ نہ چھاپ سکے گا۔ چنانچہ لائبیریا نے دھات کے سکے رائج کیے۔ کرنسی کا نام ڈالر ہی رہا۔ اس کرنسی کو عرف عام میں استہزا سے ڈو

ڈالر کہا جاتا ہے۔ سرکاری طور پر ایک ڈو ڈالر کی قیمت ایک امریکی ڈالر تھی۔ لیکن غیر سرکاری قیمت اور عام مارکیٹ میں ایک امریکی ڈالر کے عوض اڑھائی ڈو ڈالر مل جاتے تھے۔ خود حکومت کو بھی اپنی کرنسی پر اعتماد نہ تھا۔ ایک حکم کے تحت حکومت ٹیکس امریکی کرنسی میں وصول کرتی تھی۔ اور ادائیگی کے لئے ڈو ڈالر استعمال کرتی تھی۔ حکومت کو معمول کے اخراجات کیلئے رقم کی ضرورت پڑتی تھی تو اسے مختلف بنکوں سے قرض برداشت کرنا پڑتا تھا۔ امریکہ اور اس کے حواری مصر تھے کہ لائبیریا کا حکمران امریکی مطالبات مان لے۔ نئے انتخابات کا مطالبہ تو بدستور موجود رہا۔ اب یہ مطالبہ بھی ہوا کہ اقتصادی اصلاحات بھی کی جائیں۔ کرنسی کی سرکاری قیمت کو غیر سرکاری سطح پر لایا جائے۔ امداد دینے والی ایجنسیوں کے مطابق لائبیریا کے وسائل آمدنی کو بڑھانے کی ضرورت تو تھی ہی۔ لیکن زیادہ اور فوری ضرورت اس امر کی تھی کہ اخراجات میں کمی کی جائے۔ صدر مملکت پہلے تو رضامند نہ ہوئے لیکن بعد میں مان گئے۔ امریکہ نے امداد بحال کرنے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ لائبیریا کی آمدنی اور اخراجات پر آئی ایم ایف کا کنٹرول ہو۔ اور کسی قسم کی ادائیگی کے لئے آئی ایم ایف کی جانب سے مقرر کردہ اعلیٰ افسروں کے پاس مکمل اختیار ہو۔ امداد حاصل کرنے کے لئے صدر ڈو مان گئے۔ چنانچہ ۱۹۸۷ء میں آئی ایم ایف کی چودہ رکنی ٹیم لائبیریا میں آ گئی۔ لیکن صدر اس ٹیم کی آمد سے چنداں خوش نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس ٹیم کا مقصد ان پر کنٹرول رکھنا ہے جس سے ان کی خودمختار حیثیت متاثر ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کی خواہش کے مطابق اس ٹیم کے ساتھ حکومتی اداروں نے کوئی تعاون نہ کیا اور ٹیم واپس چلی گئی۔ نتیجتاً امریکی امداد بحال نہ ہوئی۔ اور اقتصادی صورت حال اس حد تک متاثر ہوئی کہ حکومت کے خزانے میں ملازمین کو تنخواہ دینے کے لئے بھی کوئی رقم دستیاب نہ تھی۔ آئی ایم ایف۔ ورلڈ بنک اور دیگر امدادی اداروں نے مکمل طور پر

ہاتھ کھینچ لیا۔ جو ماہرین پہلے سے ان اداروں کی جانب سے لائبیریا میں مشوروں کے لئے مقیم تھے۔ وہ بھی واپس چلے گئے۔ اس مرحلے پر ایک اور واقعہ ہوا۔ لائبیریا نے رومانیہ سے ایک معاہدے کے تحت اسلحہ خرید لیا۔ اس سودے پر امریکہ نے بے حد ناراضگی کا اظہار کیا۔ یوں دونوں ملکوں کے درمیان تلخی بڑھتی گئی۔ صدر ڈو اپنے تئیں ناراض تھے۔ اقتصادی بدحالی نے سیاسی بے چینی کو جنم دیا اور اندرون ملک صدر ڈو کی مخالفت میں اضافہ ہوگیا۔ صدر ڈو سخت بے چارگی کی حالت میں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ رابطہ کرنے کی کوشش میں تھے۔ لیکن لائبیریا کی سیاسی اور معاشی حالت کے علاوہ اس کے ماضی کے حوالے سے اس سمت میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ اور یوں لائبیریا تنہا رہ گیا۔ لیکن صدر ڈو کی حکومت ڈانوا ڈول نہ تھی۔ سیاسی اور معاشی عدم استحکام کے باوجود کسی میں دم نہیں تھا۔ کہ وہ صدائے احتجاج بلند کرتا۔ سیاسی لیڈر اور پارٹیاں دہشت زدہ تھیں۔ اور انہیں بخوبی احساس تھا کہ حکومت کی طاقت کے سامنے دم مارنا ناممکن ہے۔ اس کے باوجود امریکہ کی جانب سے صدر ڈو کی حکومت کو ختم کرنے کا سلسلہ چلتا رہا۔ کبھی کبھار اس میں شدت بھی آ جاتی۔ لیکن صدر ڈو بڑی دلیری اور استقامت سے داخلی محاذ پر ڈٹے رہے۔ بہرحال بالاخر اس کا نتیجہ ان کے حق میں اچھا نہ ہوا۔

امریکہ کے ساتھ تعلقات بگڑتے جا رہے تھے۔ خود صدر ڈو بھی کچھ خوش مزاج شخصیت نہ تھے۔ جلد طیش میں آ جاتے تھے۔ نوجوان تھے۔ فضول خرچ بھی تھے۔ روز بروز ان کی ذاتی جائداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دوسری جانب خزانہ خالی ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود ۱۹۸۸ء میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگلے برس مئی ۱۹۸۹ء میں ان کی ۳۷ ویں سالگرہ قومی سطح پر منائی جائے۔ سالگرہ کمیٹی کے مطابق خرچ کا تخمینہ چالیس لاکھ ڈالر تھا۔ عین اسی وقت امریکہ نے لائبیریا پر دباؤ ڈالا کہ وہ امریکی قرضہ تو واپس

کرے- یہ مطالبہ امریکی مزاج کے عین مطابق تھا- پہلی قسط ایک کروڑ اسی لاکھ ڈالر کی تھی- جو ۱۹۸۸ء میں واجب الادا تھی- صدر ڈو نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور قوم سے اپیل کی کہ وہ پہلی قسط کی ادائیگی کے لئے حکومت کی امداد کرے- صدر ڈو کوئی ہردلعزیز حکمران نہ تھے- لیکن انہوں نے جب قومی غیرت کو اپیل کی- تو ہرکہ ومہ نے ان کی اپیل پر لبیک کہا- میں ایک اہم میٹنگ کے لئے لائبیریا گیا- تو میں نے ایک عجیب منظر دیکھا- صدر مملکت اپنی کابینہ کے ممبران کے ہمراہ اپنے دفتر کے باہر سیڑھیوں پر کھڑے عوام سے چندہ وصول کر رہے تھے- معلوم ہوا کہ ہر شام چار بجے سے چھ بجے تک صدر بذات خود چندہ لینے کے لئے دو گھنٹے ڈیوٹی دیتے ہیں- دفتر کے باہر لمبی لائن لگی ہوتی ہے- اور عوام اپنی رضامندی سے چندہ دینے کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں- پہلی قسط کی رقم چندے سے اکٹھی کی گئی- امریکی مطالبے کو پورا کرنا کارے دارد تھا- لیکن مطلوبہ رقم اکٹھی ہو گئی- البتہ سالگرہ کے لئے رقم مہیا کرنے کا کام معطل کر دیا گیا-

امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ نے ان ایام میں چند افریقی ممالک کا دورہ بھی کیا- وہ لائبیریا بھی گئے اور وہاں چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے ایک استقبالیہ میں وہ مہمان خصوصی تھے- چیمبر کی جانب سے سپاس نامہ پیش کیا جس میں لائبیریا کی اقتصادی مشکلات کا ذکر تفصیل سے کیا گیا تھا- جارج شلز نے جواباً ہمدردی کے الفاظ کہے- لائبیریا اور امریکہ کے درمیان تلخ تعلقات کا ذکر بھی کیا اور امریکہ کی جانب سے امداد کی بحالی کے بارے میں صاف جواب دے دیا- انہوں نے کہا-

THERE IS NO AMERICAN SOLUTION TO LIBERIAN PROBLEMS.

LIBERIA SHOULD FIND ITS OWN SOLUTION TO ITS PROBLEMS.

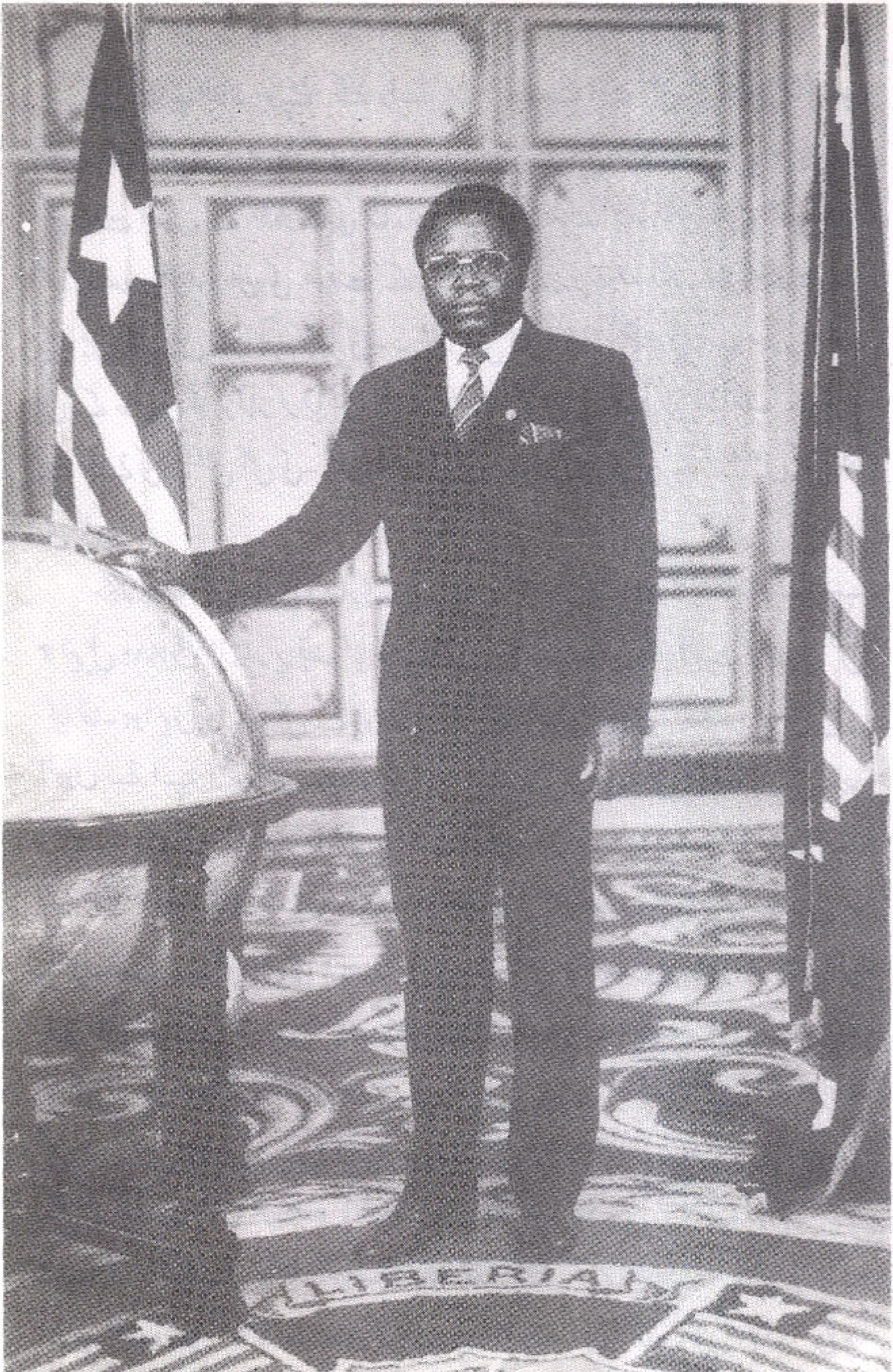

Dr Samuel K. Doe, President of Liberia لائبیریا کے صدر جنرل ڈاکٹر سیموئل کے ڈو

ان کے یہ الفاظ سوچنے سمجھنے والے عناصر کے لئے بہت معنی خیز تھے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ تھوڑے عرصے کے بعد لائبیریا والوں نے اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈ نکالا۔ کچھ وقت انہوں نے مشکلات کی نشاندہی میں ضرور صرف کیا۔ لیکن پھر جو حل تجویز کیا وہ صدر ڈو اور ان کی حکومت کے لئے مہلک ثابت ہوا۔ ایک فوجی بغاوت کے نتیجے میں ملک میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ یہ خانہ جنگی اس وقت ختم ہوئی جب صدر ڈو اور ان کے حامیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق صدر ڈو نے ملک سے باہر چلے جانے کی پیشکش بھی کی۔ لیکن ان کو یہ رعایت نہ دی گئی اور بالآخر انہیں گولی مار دی گئی۔

مکافات کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ ماسٹر سارجنٹ سیموئل کے ڈو نے جب ۱۲ اپریل ۱۹۸۰ء کو اقتدار پر قبضہ کیا تھا تو انہوں نے منتخب صدر ولیم ٹالبرٹ کو بلاوجہ قتل کیا تھا۔ ہوا یوں کہ سیموئل کے ڈو صدر کے لئے مخصوص بینڈ میں ماسٹر سارجنٹ تھے۔ انہوں نے اپنے افسر اعلیٰ سے دو چار روز کے لئے رخصت کی درخواست کی۔ جو نامنظور کر دی گئی۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ صدر سے خود اس بارے میں درخواست کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے اصرار پر انہیں صدر ولیم ٹالبرٹ کے پیش کر دیا گیا۔ صدر نے بھی ان کی بات نہ سنی اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ ماسٹر سارجنٹ اس وقت کان لپیٹ کر دفتر سے آ گئے۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی ٹھانی۔ جلد ہی ایک شام وہ صدر کے دفتر میں اپنے درجن بھر ساتھیوں کے ہمراہ جا گھسے اور انہیں حراست میں لے لیا۔ ان سے استعفیٰ لکھنے کو کہا گیا۔ جو انہوں نے مزاحمت کئے بغیر لکھ دیا۔ اس مرحلے پر ماسٹر سارجنٹ کے ایک ساتھی نے مشورہ دیا کہ صدر ٹالبرٹ کو حراست میں رکھنا خطرناک ہو گا۔ لہٰذا اسے ختم کر دیا جائے۔ ماسٹر سارجنٹ نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور صدر کو گولی سے اڑا دیا۔ اس انقلاب کی کسی بھی سطح پر

مزاحمت نہ ہوئی۔ لیکن انقلابی پارٹی کے تمام افراد یکے بعد دیگرے تشدد کا نشانہ بنے اور انقلابی صدر ڈاکٹر سیموئیل ڈو نے انہیں آنے بہانے ختم کر کے دم لیا۔ کامیاب انقلابی کاروائی کے بعد سارجنٹ میجر نے اپنے آپ کو میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دی۔ اور پھر جنوبی کوریا کی کسی یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی عطا کر دی۔ اس ڈگری کے بعد وہ اپنے فوجی عہدے سے مخاطب کئے جانے کی حوصلہ افزائی نہ کرتے تھے۔ بلکہ ڈاکٹر ڈو کہلوانا پسند کرتے تھے۔

اپنی اس قسم کی افتاد طبع کے باوجود وہ پاکستان کے بہت معترف تھے۔ وہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق سے بہت متاثر تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب صدر ضیا نے امریکی صدر کارٹر کی جانب سے امداد کی پیشکش کو PEANUTS کہہ کر ٹھکرایا تھا۔ میں صدر ضیا کی جانب سے صدر ڈو کے لئے پاکستان آنے کا دعوت نامہ لے کر گیا تھا جو صدر ڈو نے خود کھولا اور پڑھ کے اپنے وزیر خارجہ کو دیا۔

صدر ۔ یہ پڑھو۔ یہ دعوت نامہ میرے نام ایمبیسڈر علی شیخ کی ذاتی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ایمبیسڈر علی شیخ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا اپنی حکومت پر کتنا اثر ہے۔

میں ۔ ایکسیلنسی یہ دعوت نامہ صدر پاکستان کی جانب سے خیرسگالی کا اظہار ہے۔ صدر پاکستان کی شدید خواہش ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات زیادہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہوں۔ پاکستان اور لائبیریا دونوں ترقی پذیر ممالک ہیں۔ اور دونوں غیر وابستہ ممالک کی تنظیم کے حوالے سے بے حد قریب ہیں۔

صدر ۔ میرے اور صدر ضیاء کے خیالات بہت ملتے ہیں۔ وہ بہت حوصلہ مند شخصیت ہیں۔ ابھی دیکھیں انہوں نے صدر کارٹر کو آنکھیں دکھائی ہیں۔ امریکی صدر کو PEANUTS کا طعنہ دینا بڑی ہمت کا کام ہے۔ لیکن یہ لفظ صحیح استعمال ہوا ہے۔

امریکی صدر ہے تو مونگ پھلی بیچنے والا۔ PEANUT - PEANUT
میں - ایکسلنسی۔ آپ بہت مہربان ہیں۔ آپ کا پاکستان کا دورہ انشاء اللہ بہت کامیاب رہے گا اور یوں دونوں ممالک کے درمیان اعلیٰ ترین سطح پر رابطہ قائم ہو جائے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ اہل پاکستان بہت پرجوش طریقے سے آپ کا استقبال کریں گے۔

صدر - پاکستان جانے کے لئے کونسا موسم بہتر ہوتا ہے۔

میں - جناب صدر۔ اپریل سے اکتوبر تک کا موسم گرم ہوتا ہے۔ باقی تمام مہینے دورے کے لئے مناسب ہیں۔ آپ جیسا بھی پروگرام بتائیں گے۔ مناسب ہو گا۔

صدر - آپ کتنے روز منرودیا میں ہیں۔

میں - جناب صدر میں تو صرف یہ دعوت نامہ آپ کو بذات خود دینے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ کوئی اور کام نہیں ہے۔ کل صبح کے جہاز سے میری روانگی ہے۔

صدر - مناسب ہے۔ آپ کے جانے سے پہلے ہم اس کا جواب آپ کو دے دیں گے۔

اگلے روز ایئرپورٹ جانے سے پہلے مجھے دعوت نامے کا مثبت جواب مل گیا۔ دورے کی مجوزہ تاریخ کے بارے میں اس وقت میں نے غور نہ کیا۔ عکرہ واپس آکر چیک کیا تو معلوم ہوا کہ مجوزہ تاریخ ۲۷ رمضان المبارک کے مطابق ہو گی۔ اگر لائبیریا کا دفتر خارجہ مجھ سے مشورہ کرتا تو میں انہیں بتا سکتا تھا۔ کہ صدر ضیا تو رمضان میں ان کا استقبال نہ کر سکیں گے اور پھر ۲۷ رمضان المبارک تو وہ مکہ مکرمہ میں ہوتے ہیں۔ لیکن اب جو ہونا تھا۔ وہ ہو گیا تھا' میں صدر ڈو کے مراسلے کو تبدیل نہ کروا سکتا تھا۔ وہ میں نے وزارت خارجہ کو بھیج دیا۔ ہفتے ڈیڑھ میں مجھے اس بارے میں جو ہدایات موصول ہوئیں۔ ان سے ترشح ہوتا تھا۔ کہ صدر ضیا نے صدر ڈو کو

پاکستان بلانے کا ارادہ تبدیل کر لیا ہے۔ مجھے کہا گیا کہ میں صدر ڈو کو پاکستان کا دورہ کرنے کی حوصلہ افزائی نہ کروں، چنانچہ میں نے عکرہ میں مقیم لائبیریا کے ناظم الامور کو فون پر اطلاع دی کہ رمضان المبارک کی وجہ سے صدر ضیا ان دنوں پاکستان میں نہ ہونگے۔ اس لئے صدر ڈو سے دورے کے لئے کوئی نئی تاریخ مقرر کرنے کی درخواست کی جائے گی۔ اسی مضمون کا ایک مراسلہ میں نے صدر ڈو کو بھی بھیج دیا۔ بعد میں لائبیریا کے اور صدر ڈو کے حالات ایسے ہو گئے کہ وہ پاکستان کے دورے کے لئے کوئی نئی تاریخ مقرر نہ کر سکے۔ صدر ضیا الحق نے غالباً امریکی دباؤ کے تحت صدر ڈو کے پاکستان آنے پر اصرار نہ کیا تھا۔

صدر ڈو نے کئی ایک سیاسی گناہ کئے تھے۔ سب سے بڑا گناہ ان کا یہ تھا کہ انہوں نے امریکہ کو ناراض کر لیا تھا۔ پھر توبہ تائب ہونے کی بجائے اکڑ گئے۔ اور خود انحصاری کا نعرہ لگا دیا اور یہ نعرہ امریکہ کی کسی بھی حکومت کو پسند نہیں ہے۔ پھر جو کچھ ان کے ساتھ ہوا۔ وہ عین امریکی مزاج کے مطابق تھا۔ اس اقدام سے امریکہ نے براعظم افریقہ کے تمام ممالک پر واضح کر دیا کہ امریکہ سے خود انحصاری کی کوشش ایک ایسا جرم ہے۔ جس کی سزا موت سے کم نہیں ہے۔

اسناد پیش کئے بغیر "سفیر"

میں گھانا کے دارالحکومت عکرہ میں ۲۰ر جولائی ۱۹۸۶ء کو پہنچا۔ گھانا کے علاوہ ٹوگو' برکینافاسو' لائبیریا اور سیرالیون میں بھی پاکستان کے مفادات کی نگرانی کے فرائض میرے ذمے تھے۔ چنانچہ ان سب ممالک کے لئے میں نے دستاویزات تقرری کی فوٹو کاپی کروا کے متعلقہ ممالک کے خارجہ امور کے شعبہ میں بھجوا دیں اور انہیں لکھا کہ اسناد سفارت پیش کرنے کے لئے کوئی قریبی تاریخ مقرر کر کے اطلاع دی جائے۔

۱۴ر اگست کو میں نے گھانا میں اسناد سفارت پیش کیں۔ جلد ہی دعوت لائبیریا کے صدر مقام منروویہ MONROVIA سے آ گئی۔ یہ بڑی خوش آئند بات تھی کیونکہ میرے پیشرو جناب محمد زاول دریامانی ساڑھے تین سال تک مغربی افریقہ میں سفیر رہے اور لائبیریا ان کے دائرہ کار میں آتا تھا لیکن انہیں کریڈنشل پیش کرنے کی دعوت جولائی ۱۹۸۶ء میں ملی جب کہ وہ اس وقت مغربی افریقہ میں الوداعی ملاقاتیں کر رہے تھے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۸۶ء کے اوائل میں انہوں نے کریڈنشل پیش کئے اور اسی مہینے کے دوسرے ہفتے میں وہ الوداعی ملاقات کے لئے لائبیریا چلے گئے۔

ان حالات میں جب مجھے دعوت ملی تو مجھے اطمینان ہوا کہ چلئے دیگر ملکوں کے ساتھ سلسلہ جنبانی تو ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی سیرالیون کے دارالحکومت فری ٹاؤن FREE TOWN سے بھی اطلاع آگئی کہ وہاں پر بھی کریڈنشل پیش کرنے کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔

مذکورہ بالا دونوں ملکوں میں اپنی سفارت پر تقرری کی اسناد مجھے اکتوبر میں پیش

کرنی تھیں۔ اب صرف دو ہی ممالک ایسے باقی رہ گئے تھے جہاں سے کوئی اطلاع ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ٹوگو اور برکینافاسو۔ موخرالذکر ملک میں تو بعد میں کریڈ نیشل پیش کرنے کی تاریخ مقرر ہوگئی لیکن ٹوگو میں اسناد سفارت پیش کرنے کی کوئی تاریخ مقرر نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ ۲۰ر جولائی ۱۹۸۹ء کو میں واپس پاکستان آگیا۔

ٹوگو اور گھانا ایک دوسرے کے ہمسائے ہیں۔ گھانا کے دارالحکومت عکرہ سے ٹوگو کے دارالحکومت کا فاصلہ سڑک کے ذریعے دو گھنٹے کا ہے۔ صدر مملکت کا نام جنرل EYEDMA ہے جو بیس برس سے حکومت کر رہا ہے۔ سفارتی حلقوں میں اس کے بارے میں یہ بات مشہور ہے۔ کہ وہ اپنے اقتدار کے لئے ستاروں کی چال پر انحصار کرتا ہے اور حکومت کے اہم معاملات کے علاوہ چھوٹے چھوٹے معاملات پر بھی وہ ستارہ شناسوں سے رابطہ قائم رکھتا ہے۔ اس بات میں کتنی حقیقت ہے اور کتنا افسانہ وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

جب ایک طویل عرصے تک ٹوگو سے کریڈ نیشل پیش کرنے کی تاریخ کے بارے میں کوئی اطلاع نہ آئی تو میں نے بھارت کے ہائی کمشنر سے ذکر کیا۔ بھارت کا ہائی کمشنر بھی میری طرح عکرہ میں رہتا تھا اور ٹوگو' برکینافاسو اور لائبیریا میں بھارت کے مفادات کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ عکرہ میں مجھ سے دو سال پہلے آیا تھا اس نے ابھی تک ٹوگو میں کاغذات نامزدگی پیش نہیں کئے تھے۔ گھانا میں رہنے والے ہم گیارہ سفیر تھے جنھوں نے ٹوگو میں کاغذات نامزدگی ابھی پیش نہیں کئے تھے۔ ٹوگو کے دفتر خارجہ میں ایسے سفیر صاحبان کی فہرست دیکھنے سے پتہ چلا کہ سیرالیون کا سفیر سرفہرست ہے کہ ۱۹۸۳ء سے اب تک اسے کاغذات نامزدگی پیش کرنے کی کوئی تاریخ ہی نہیں دی گئی تھی۔ اس فہرست میں میرا نمبر نواں تھا اور مجھ سے پہلے آٹھویں نمبر پر بھارت کے ہائی کمشنر کا نام تھا۔ اس کے متعلق ٹوگو کا سفیر متعینہ عکرہ بھی کچھ نہ کر سکتا تھا بلکہ اسے تو کوئی اطلاع تک نہ ملتی تھی۔ ٹوگو کے باوثوق ذرائع سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ جن ملکوں نے لومے LOME میں اپنے سفارت خانے کھول رکھے ہیں ان کے سربراہوں

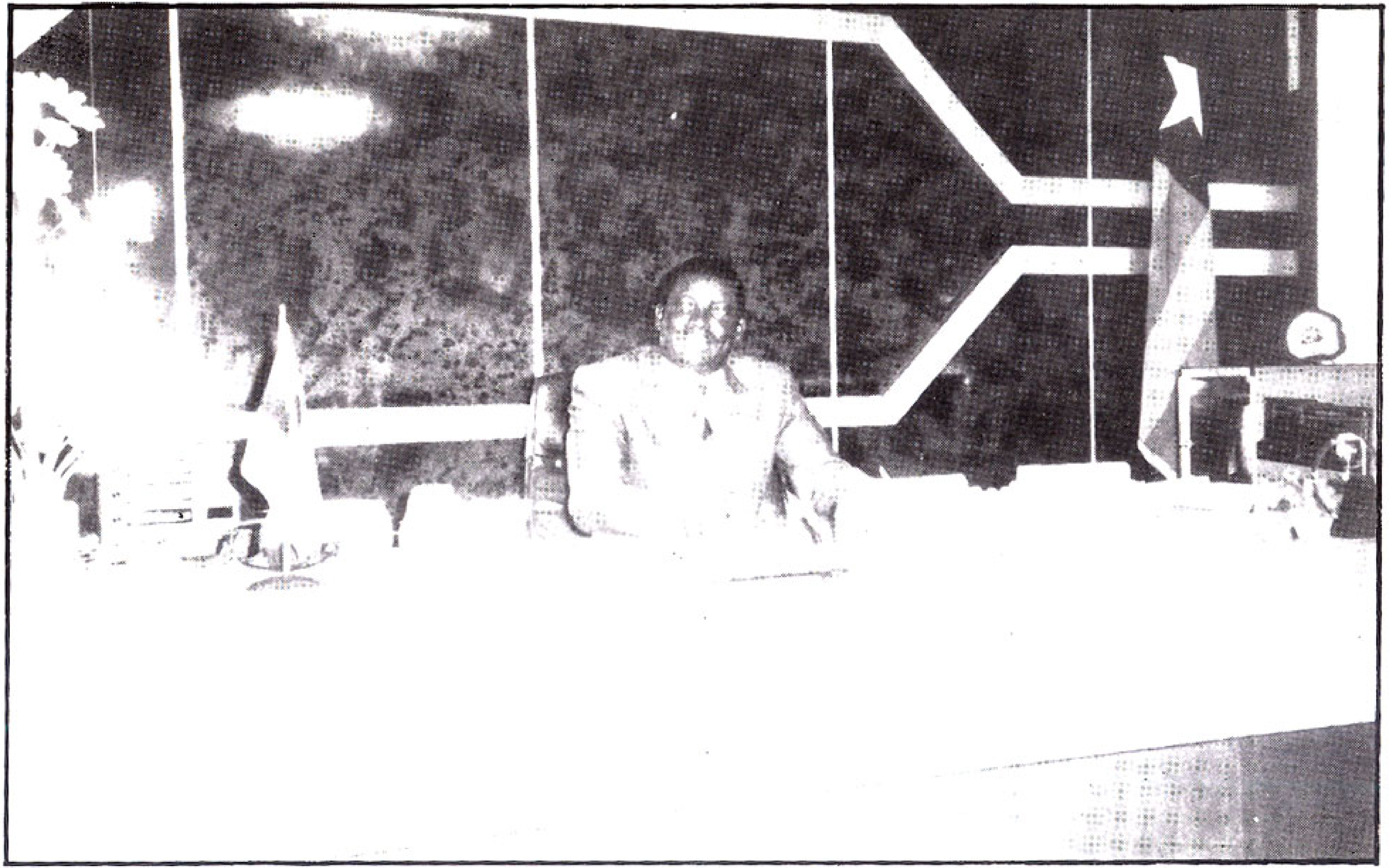

28 اپریل 1989 - ٹوگو کے صدر جنرل آئیڈما الوداعی ملاقات کے موقع پر یہ تصویر لی گئی تھی

کو تو کریڈنیشنل پیش کرنے کی تاریخ بہت جلد دے دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس وہ سفیر صاحبان جو ٹوگو سے باہر کہیں رہائش رکھتے ہیں انہیں انتظار میں رہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ جب ان کے ممالک ٹوگو کو کچھ اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ وہاں مکمل طور پر اپنا سفارت خانہ کھولیں تو پھر ٹوگو بھی ایسے ممالک کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ صدر آئیڈما ستارہ شناسوں کی مدد سے اسناد سفارت پیش کئے جانے کی کوئی تاریخ مقرر کرتے ہیں اور اس کے بارے میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ ان کے وزیر خارجہ نے ایک دوست ملک کے سفیر کے بارے میں بہت اصرار کیا کہ اسے نامزدگی کے کاغذات پیش کرنے کی کوئی تاریخ دے دی جائے مگر صدر آئیڈما ٹال گئے۔ وزیر خارجہ نے موقع پاکر دوسری بار پھر اصرار کیا تو صدر نے جان چھڑانے کے لئے "ہاں" تو کر دی مگر تاریخ پھر نہ

مجھ سے ملنے سے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ وزیر خارجہ' کیبنٹ سیکرٹری' وزیر تجارت' چیف آف پروٹوکول بھی دوستی اور مضبوط تعلقات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مجھ سے برابر تعاون کرتے رہے۔ پریس اور ٹی ۔ وی نے بھی مجھ سے بھرپور تعاون کیا۔ ایک مرتبہ وزیر خارجہ اور کیبنٹ سیکرٹری سے ملاقات کے دوران جب میں نے اس عمدہ طرز عمل اور حسن اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا تو انہوں نے اسے اپنا اخلاقی فرض قرار دیا۔

مجھے اس بارے میں کوئی تردد نہ تھا کہ میں اسناد سفارت پیش نہ کر سکا تھا۔ حکومت پاکستان کی جانب سے جو کام بھی ٹوگو کے متعلق ہوتا تھا وہ میں اسناد پیش کیے بغیر بھی کر رہا تھا اور ٹوگو کی حکومت بھرپور تعاون کر رہی تھی۔ پھر بھی کیبنٹ سیکرٹری' اور چیف آف پروٹوکول کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے ایک مرتبہ یہ بات نکل آئی۔

میں - وزیر محترم اسناد سفارت پیش کرنے کی تاریخ مقرر ہونے کے کیا امکانات ہیں۔

وزیر - جناب سفیر۔ آپ کا نمبر تو کہیں آٹھواں یا نواں ہے۔ اسناد تو آپ اپنی باری پر ہی پیش کریں گے۔

میں - پھر بھی۔ کوئی اندازہ تو ہوگا۔

وزیر - اندازے کی گنجائش قطعی نہیں رہتی۔ تاریخ اور وقت صدر مملکت ہی مقرر کرتے ہیں۔ ہمیں صرف قصر صدارت سے اطلاع دی جاتی ہے۔ آپ بتائیں۔ آپ کو تو اس بارے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ آپ اسناد پیش کئے بغیر بھی ہمارے لئے اتنے ہی محترم ہیں۔ اور پھر ہم تو پاکستان کو دوست سمجھتے ہیں۔ اور دوستی نبھانا جانتے ہیں۔

ایک مرتبہ جناب شہریار ایم خان سفیر پاکستان متعینہ برطانیہ خصوصی سفیر کی حیثیت سے ٹوگو تشریف لائے۔ انہیں وہاں ٹوگو کے وزیر خارجہ اور کیبنٹ سیکرٹری کے علاوہ صدر سے ملاقات کرنا تھی۔ میں ان کے ہمراہ تھا۔ جب صدر آیڈما سے ان کی

ملاقات کے اختتام پر جب شہریار صاحب نے صدر آئیڈما کی اس طرف توجہ دلائی کہ آپ نے ابھی تک پاکستان کے سفیر سے اسناد سفارت ہی طلب نہیں کیں تو صدر آئیڈما نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے سفیر محترم جب اور جس وقت بھی چاہیں مجھ سے بلاروک ٹوک آکر مل سکتے ہیں اور یہ کہ اسناد سفارت پیش کرنے کا کام بھی جلد ہی ہو جائے گا۔

صدر آئیڈما نے اسی وقت وزیر خارجہ سے اس کے بارے میں کہہ دیا کہ یہ رسم بھی اب ادا ہو جانی چاہیے۔ اگلے ہفتے ٹوگو کے چارج ڈی افیرز مقیم عکرہ نے مجھ سے رابطہ قائم کیا کہ میں اسے اسناد کی نقول مہیا کروں اور اس تقریر کی بھی ایک نقل دے دوں جسے میں اسناد سفارت پیش کرنے کے بعد پڑھ کر سناؤں گا۔

میں نے تمام مطلوبہ کاغذات مہیا کر دیئے۔

ٹوگو کے صدر جنرل آئیڈما ہر برس نئے سال کے موقع پر قصرصدارت میں ٹوگو کی اہم شخصیات کو مدعو کیا کرت ہیں۔ ان کے علاوہ ڈپلومیٹک کور کو بھی دعوت دی جاتی ہے۔ یہ تقریب علی الصبح ساڑھے سات بجے شروع ہوتی ہے۔ ہر شعبہ زندگی کے نمائندگان' کیبنٹ کے معزز ارکان' سماجی کارکن شہریان باتمکین اور سفارت کار اس موقع پر صدر کو نئے سال کی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ بعد میں مشروبات سے ان کی تواضع کی جاتی ہے اور انہیں ماکولات و مشروبات پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ ایک پر تکلف اور باوقار تقریب ہوتی ہے۔ ایک بار اس تقریب میں شرکت کی مجھے بھی دعوت ملی۔ میں نے گھانا میں مقیم ٹوگو کے چارج ڈی آفیرز سے دریافت کیا کہ کہیں یہ دعوت نامہ غلطی سے تو میرے نام نہیں آگیا کیونکہ میں نے تو ابھی تک اپنی اسناد سفارت ہی پیش نہیں کیں۔ کیا اسناد پیش کئے بغیر اس سرکاری تقریب میں میرا شریک ہونا مناسب ہوگا۔ انہوں نے کہا جناب! اس تقریب میں آپ ضرور تشریف لے جائیے۔ ٹوگو کی وزارت خارجہ نے سوچ سمجھ کر ہی آپ کو مدعو کیا ہے۔

ان دنوں گھانا اور ٹوگو کے درمیان سخت کشیدگی تھی حتیٰ کہ سرحد بند تھی اور

سڑک کے ذریعے آمدورفت ناممکن تھی۔

گھانا اور ٹوگو کے درمیان فضائی راستہ بھی مسدود تھا۔ چنانچہ میں عکرہ سے پہلے پڑوس کی ریاست ری پبلک آف بنین BENIN کے ہوائی اڈے "کوتونو" پہنچا۔ وہاں سے ٹیکسی لیکر "لومے" پہنچ گیا۔ عکرہ ایئرپورٹ پر بھارت کے ہائی کمشنر سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی۔ میری طرح سے انہوں نے بھی اپنی اسناد سفارت ابھی تک پیش نہیں کی تھیں ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ کوتونو سے لومے کے لئے بھارت کے ہائی کمشنر نے مجھے اپنے ہمراہ سفر کرنے کی دعوت دی مگر میں نے مناسب نہ سمجھا میں نے اپنے آنے جانے کے لئے ٹرانسپورٹ کا علیحدہ انتظام کیا۔

لومے پہنچ کر ہم نے دفتر خارجہ سے رابطہ قائم کیا۔ چیف آف پروٹوکول نے مجھے اور بھارتی ہائی کمشنر کو وزارت خارجہ میں صبح دس بجے بلایا۔ ہم دونوں مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئے مگر اس وقت تمام دفاتر بند تھے۔ باہر کھڑے ہو کر انتظار کرتے رہے۔ کوئی گیارہ بجے چیف آف پروٹوکول آیا تو اس نے بتایا کہ وہ وزیر خارجہ کی تلاش میں تھا تاکہ ایک اہم مسئلے پر ان سے بات ہو جائے اور وہ اہم مسئلہ نئے سال کی تقریب میں ہماری شرکت کے بارے میں تھا۔

چیف آف پروٹوکول نے مزید بتایا کہ وزارت خارجہ میں اس امر پر بحث ہو رہی ہے کہ کل صبح قصر صدارت میں پاکستان اور بھارت کے سفیر بطور سفیر مدعو کئے گئے ہیں یا انہیں معزز شہری کے طور پر دعوت دی گئی ہے۔ اس بات پر میرا فوری ردعمل یہ تھا کہ معزز شہریوں کے زمرے میں ہم تو نہیں آتے! ہمیں تو سفیر ہی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا ہے ہماری دوسری کوئی حیثیت نہیں۔ پروٹوکول والوں کا کہنا یہ تھا کہ جب تک ہم اسناد سفارت پیش کئے جانے کی رسمی تقریب سے فارغ نہیں ہوتے ہمارا تشخص بطور سفیر ممکن نہیں۔ ابھی یہ تبادلہ خیال جاری تھا کہ وزیر خارجہ بذات خود یہاں آگئے اور انہوں نے ہماری موجودگی میں قصر صدارت فون کر کے صدر مملکت سے ملاقات کا وقت لے لیا ایک آدھ گھنٹے کے بعد قصر صدارت سے وہ سیدھے ہمارے

پاس آئے اور کہا کہ آپ حضرات کو نئے سال کی تقریب میں اگلے روز بطور سفیر ہی شامل کیا جائے گا۔

یہ واقعہ دسمبر ۱۹۸۷ء کے اواخر کا ہے۔ میں ۳ جنوری ۱۹۸۸ء کو عکرہ واپس پہنچا تو معلوم ہوا کہ ۱۳ر جنوری کے لئے لومے سے ایک اور دعوت نامہ آیا ہوا ہے۔ یہ دعوت ٹوگو کے ''قومی دن'' کی تقریب میں شرکت کا تھا۔ نئے سال کے بارے میں تجربہ اتنا خوشگوار تو نہیں تھا۔ سرحدیں ابھی تک بند تھیں۔ اس لئے سڑک کے ذریعے سفر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے میں تذبذب میں تھا۔

اب بھی مسئلہ یہی درپیش تھا کہ سفر کیسے کیا جائے جبکہ تمام راستے مسدود ہیں۔ براستہ ری پبلک آف بنین آنے جانے میں چار دن لگتے تھے۔ دو روز جانے میں اور دو روز آنے میں۔ براہ راست فضائی سروس کوئی نہیں تھی۔

''عکرہ'' سے چل کر پہلے ''کوتونو'' جانا پڑتا تھا۔ وہاں ایک رات رہ کر اگلے روز ٹیکسی کے ذریعے پھر ''لومے'' جانا ہوتا۔ اس طرح واپسی پر ''کوتونو'' میں رات گزارنی پڑتی ہے۔ دوسرے دن علی الصبح وہاں سے ''عکرہ'' کی فلائٹ مل جاتی۔ یعنی جو سفر سڑک کے ذریعے صرف دو گھنٹے میں طے کیا جا سکتا تھا وہ دو پڑوسی ملکوں کے باہمی لڑائی جھگڑے کے باعث چار روز کی مسافت میں طے ہو رہا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ نیا دعوت نامہ پھر کسی کنفیوژن کا نتیجہ ہے۔ یہی سبب تھا کہ نئے سال کی تقریب میں شرکت کے لئے میرے نام باقاعدہ دعوت نامہ آنے کے باوجود شرکت کے مسئلے پر میرے اور بھارتی ہائی کمشنر کے بارے میں وزیر خارجہ کی صدر مملکت سے ملاقات کرنے تک نوبت پہنچی تھی۔ میں نے اب پھر گھانا میں ٹوگو کے چارج ڈی آفیرز سے رجوع کیا۔ وہ خود چل کر میرے دفتر آیا اور مجھ سے معذرت کرتے ہوئے اس بات پر زور دے کر کہا کہ آپ کو ''نیشنل ڈے'' میں ضرور شریک ہونا چاہئے۔

میں نے ٹوگو کے چارج ڈی آفیرز سے سرحدیں بند ہونے کہ وجہ سے راستے کی

مشکلات کا ذکر کیا اور پوچھا کہ یہ سفر کیسے طے کیا جا سکتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس مرتبہ یہ سفر آسان رہے گا کیونکہ ان لوگوں کے لئے جو صرف اور صرف ٹوگو کے نیشنل ڈے میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں بارڈر کھل جائے گا۔ یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ چارج ڈی افیرز نے اسی طرح دوسرے سفیروں سے بھی رابطہ قائم کیا جو گھانا میں مقیم تھے اور ٹوگو میں اپنے اپنے ملک کی نمائندگی کرتے تھے۔ انہیں بھی ترغیب دی گئی کہ وہ بھی ٹوگو کی اس نیشنل ڈے تقریب میں ضرور شریک ہوں۔

نیشنل ڈے کی تقریب میں شرکت کے لئے جب ٹوگو حکومت نے سفیر صاحبان کے سفر کے لئے سرحد کھول دینے کا عندیہ دیا تو گھانا کی حکومت نے بھی اپنا بارڈر کھول دیا اور سفارت خانوں سے اس سلسلے میں درخواستیں لے کرانہیں خصوصی اجازت نامے جاری کر دیئے۔

۱۳ جنوری ۱۹۸۷ء کو وہ سفیر صاحبان جو ٹوگو جانے میں دلچسپی رکھتے تھے سب گھانا کے بارڈر پر پہنچ گئے اور حکومت کی ہدایات پر امیگریشن والوں نے پاسپورٹوں پر مہریں لگا دیں اور سفیروں کا یہ کارواں ٹوگو امیگریشن کے دفتر پہنچ گیا۔

یہ مرحلہ طے ہوا تو دیکھا کہ وہاں امیگریشن کا کوئی افسر موجود نہیں۔ سیکورٹی گارڈ نے بتایا کہ سرحدیں بند ہونے کی وجہ سے امگریشن اور کسٹم کا عملہ ڈیوٹی پر حاضر نہیں ہوتا۔ جب اسے بتایا گیا کہ سفیر صاحبان ٹوگو حکومت کی دعوت پر لومے جا رہے ہیں اور انہیں اس سے متعلق خاص ہدایات جاری ہوئی ہوں گی؟ تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

اب انتظار اس بات کا ہو رہا تھا کہ ٹوگو حکومت کا کوئی ذمہ دار افسر بارڈر پر آ پہنچے اور ٹوگو کا بارڈر کھلوا دے۔ لیکن شدید انتظار کے باوجود کوئی شخص بارڈر پر نہیں آیا۔ نہ دفتر خارجہ کی جانب سے نہ پروٹوکول کی طرف سے رہا امیگریشن اور کسٹم کا عملہ یہ ویسے ہی ڈیوٹی پر نہ آتا تھا۔ البتہ سیکورٹی گارڈ نے اخلاقی طور پر ہماری اس طرح امداد کر دی کہ ٹوگو کی وزارت خارجہ کے پروٹوکول دفتر میں کسی کو ہمارے بارے

میں اطلاع کر دی اور بس! دوپہر تک شدید انتظار کرنے کے بعد تمام سفیر صاحبان بارڈر سے عکرہ واپس آ گئے۔ بیچارے چارج ڈی آفیرز ٹوگو کو اس پر بیحد ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔ گھانا والوں کے لئے یہ واقعہ مضحکہ خیز تھا اور سفیر صاحبان کے لئے باعث ناراضگی جس کا اظہار انہوں نے ٹوگو کے چارج ڈی آفیرز سے غیر مبہم الفاظ میں کر دیا۔ وہ بے چارہ سوائے پریشان و پشیمان ہونے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

میں ۱۹۸۸ء کے وسط میں سیرالیون میں سفارتی دورے پر گیا ہوا تھا کہ عکرہ سے میرے مشن نے مجھ سے عکرہ کی طرف واپسی کا پروگرام پوچھا میں نے تفصیل سے بتا دیا۔ میرے استفسار پر پھر میرے سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ گھانا میں مقیم ٹوگو کے چارج ڈی آفیرز نے آئندہ پندرہ روز کے لئے میرا پروگرام پوچھا ہے؟ کیونکہ وزارت خارجہ ٹوگو نے اسے اطلاع دی ہے کہ صدر مملکت آئندہ چند روز میں ان سفیروں کو یاد فرمائیں گے جنہوں نے ابھی تک اپنی اسناد سفارت پیش نہیں کیں۔ میں نے اس اطلاع پر سیرالیون ہی سے وزارت خارجہ ٹوگو کو مطلع کر دیا اور بات حتمی طور پر طے پا گئی کہ آئندہ پندرھواڑے میں میرا پروگرام گھانا سے باہر کہیں جانے کا نہیں۔

یہ پندرہ دن جو میں نے اسناد سفارت کی تقریب کے لئے مخصوص کر لئے تھے نامہ و پیام میں گزر گئے اور دعوت نامہ میرے نام نہ آنا تھا سو نہ آیا۔ ایک روز وقت نکال کر میں خود ہی "ٹوگو" چلا گیا اور اپنے ساتھ دستاویزات' جناح کیپ اور اچکن بھی لے گیا کہ اگر وہیں پر دفتر والوں نے کوئی تاریخ دے دی تو مجھے قومی لباس پہننے کے لئے گھانا واپس نہ آنا پڑے۔ لیکن جب میں چیف آف پروٹوکول سے ملا تو اس نے ہنستے ہنستے بتایا کہ ابھی چند روز اور لگیں گے۔

۲۱ جولائی ۱۹۸۹ء کو عکرہ میں بطور سفیر میرے قیام کی مدت کو تین سال مکمل ہونے کو تھے میں نے فروری ۱۹۸۹ء میں ٹوگو کے دفتر خارجہ کو اس سے متعلق یاد دلایا اور اس سے پوچھا کہ اس صورتحال کے پیش نظر اسناد سفارت پیش کرنے کی کوئی واضح تاریخ مقرر ہوئی ہے کہ نہیں۔ اگر نہیں ہوئی تو مقرر کر دی جائے بہتر ہو گا کہ میں وطن

جانے سے پہلے اسناد سفارت پیش کر سکوں۔

جب فروری ۱۹۸۹ء میں دفتر خارجہ اسلام آباد سے مجھے خط موصول ہوا کہ تبدیلی حکومت کو بنیاد پر مجھے اپنے عہدے کا چارج ۳۰ اپریل ۱۹۸۹ء تک چھوڑ دینا چاہئے تو اس خط کی بنیاد پر میں نے ٹوگو کی وزارت خارجہ سے پھر رجوع کیا۔ ان کے چارج ڈی افیرز کے ذریعے یہ پیغام ملا کہ اسناد سفارت پیش کرنے کی تاریخ تو ابھی مقرر نہیں کی جا سکتی۔ البتہ میں اگر صدر مملکت کو الوداع کہنا چاہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور پھر انہوں نے صدر مملکت کے ساتھ میری الوداعی ملاقات کی تاریخ مقرر کر دی۔

مَیں ۲۸ اپریل ۱۹۸۹ء کو صبح سویرے ہی بذریعہ کار عکرہ سے لومے پہنچ گیا۔ کوئی گیارہ بجے صدر مملکت کے ساتھ میری الوداعی ملاقات ہوئی اس دوران اپنے کیمرے سے میں نے ان کی تصویر بنائی۔ پھر میرے ہی کیمرے کے ذریعے میری اور صدر مملکت کی تصویر بنائی گئی۔ اس موقع پر صدر مملکت جنرل آئیڈما نے مجھے ٹوگو کی ڈاک کے ٹکٹوں کا ایک البم پیش کیا اور اس پر خلوص و محبت کے دستخط ثبت کر دیئے۔

صدر مملکت سے رخصت ہونے کے بعد جب میں نچلی منزل پر پہنچا تو پریس اور ٹی۔ وی کے لوگوں کو اپنے انتظار میں موجود پایا۔ انہوں نے میرا تفصیلی انٹرویو لیا اور یوں میں ٹوگو سے اپنے دل میں حسین یادیں لے کر وہاں سے رخصت ہوا۔

لومے میں بی سی سی آئی کے منیجر جناب طارق احمد کافی عرصے سے تعینات تھے بے حد خلیق، ملنسار اور شریف انسان۔ لومے میں قیام کے دوران ان سے ملاقات رہتی تھی۔ ان کا سٹاف بھی بہت تعاون کرنے والا پایا۔ ۱۹۸۸ء میں طارق احمد کی ٹوگو کے لئے خدمات کے صلے میں انہیں صدر مملکت آئیڈما کی طرف سے ٹوگو کا سول ایوارڈ دیا گیا۔ یہ منفرد اعزاز پاکستان کے حصے میں آیا تھا۔ یہ ایوارڈ ٹوگو کے سویلین ایوارڈز میں فضیلت کے لحاظ سے دوسرا ہے۔ اور میری دانست کے مطابق براعظم افریقہ کی کسی بھی ریاست نے کبھی کسی پاکستانی کو کوئی ایسا ایوارڈ نہیں دیا ہے۔ یہ طارق احمد کی ذاتی

کوشش، ہمت، خلوص، محنت کا صلہ تھا کہ یہ اعزاز پاکستان کے حصے میں آیا۔ اور وطن عزیز کی عزت اور شان میں اضافہ ہوا۔

مغربی افریقہ ہمارا سوتیلا بھائی

گھانا میں پاکستانی مشن کو برکینافاسو' لائبیریا' سیرالیون اور ٹوگو میں بھی پاکستان کے مفادات کی نگہداشت کرنی ہوتی ہے۔ تقریباً سات سال پہلے گھانا اور لائبیریا کے درمیان کا ملک آیوری کوسٹ بھی اس مشن کے دائرہ کار میں شامل تھا۔ اب آیوری کوسٹ کا نام کوٹ ڈی ایوار COTE D IVOIRO ہے۔ میرے پیش رو کے زمانے میں ۱۹۸۵ء کے وسط میں اس فرانکو فون ملک کو گھانا کے پاکستانی مشن سے علیحدہ کر کے سینیگال SENEGAL کے مشن سے وابستہ کر دیا گیا۔ میرے پیش رو محمد راول وریامانی نے اس بارے میں ایک نیم دلانہ احتجاج دفتر خارجہ کو بھیجا۔ جو بلاتوقف مسترد کر دیا گیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ ابھی چند روز پہلے تو صدر مملکت نے اس بارے میں احکامات جاری کئے ہیں۔ اتنی جلدی ان احکامات پر نظرثانی نہیں کی جا سکتی۔ جن عوامل کو بروئے کار لاتے ہوئے گھانا کے مشن سے آیوری کوسٹ کو علیحدہ کیا گیا وہ تو معلوم نہیں ہیں۔ بظاہر اس فیصلے کی افادیت بھی محل نظر ہے۔ اول تو یہ کہ گھانا میں پاکستانی مشن کی ابتداء ہی سے آیوری کوسٹ اس کے دائرہ کار میں رہا' دوسرے یہ کہ یہ ملک گھانا اور لائبیریا کے درمیان واقع ہے یعنی ایک جانب سے گھانا کے ساتھ اس کی سرحد ملتی ہے تو دوسری جانب لائبیریا کے ساتھ یہ دونوں ممالک گھانا کے مشن کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ اگر زبان کی بات کی جائے کہ آیوری کوسٹ کی زبان فرانسیسی ہے اور سینیگال کی زبان بھی فرانسیسی ہے یہ عذر لنگ بھی دل کو نہیں لگتا کیونکہ گھانا مشن ٹوگو اور برکینافاسو میں پاکستانی مفادات کی نگہداشت بھی کرتا ہے' ان دونوں ملکوں

کی زبان فرانسیسی ہے۔ مزید یہ کہ آیوری کوسٹ میں مقیم پاکستانیوں کے لئے سینیگال میں پاکستانی مشن کی طرف رجوع کرنا دشوار اور مشکل بھی ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے' بلکہ میرے قیام کے دوران آیوری کوسٹ میں مقیم پاکستانی پاسپورٹ کی تجدید' اندراجات اور دیگر مسائل کے لئے گھانا مشن سے ہی رابطہ کرتے رہے۔

بہرحال دفتر خارجہ کے اسرار و رموز اپنے ہی ہیں۔ یہ مملکت در مملکت کے مصداق ایک ایسا خودمختار ادارہ ہے جو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ اب ارباب اقتدار نے اگر فیصلہ کر لیا کہ آیوری کوسٹ کو سینیگال کے مشن سے منتھی کر دیا جائے تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور جو عکرہ میں مقیم ہمارے سفیر نے اس فیصلے پر نظرثانی کے لئے کہا تو ٹکا سا جواب دے دیا گیا۔ آزادی سے پہلے گھانا کا نام گولڈ کوسٹ تھا۔ وجہ شہرت اور وجہ تسمیہ وہ سونا ہے جو صدیوں سے اس ملک کی کانوں سے اب تک نکل رہا ہے۔ اسی طرح آزادی سے پہلے گولڈ کوسٹ اور لائبیریا کے درمیان واقعہ یہ ملک آیوری کوسٹ کہلاتا تھا کہ اس افریقی ملک میں ہاتھی دانت کی بہتات تھی' یہ نام آزادی کے بعد بھی تبدیل نہ کیا گیا بلکہ بدستور آیوری کوسٹ ہی اس کا نام ٹھہرا۔ چند برس ہوئے اس کا نام صدارتی حکم کے ذریعے تبدیل کر دیا گیا' اب اس کا نام کوٹ ڈی آوار COTE DE IVOIRE ہے۔ آیوری کوسٹ تو انگریزی نام ہے۔ نیا نام اس کا فرانسیسی میں ترجمہ ہے۔ سرکاری زبان بھی فرانسیسی ہے۔ فرانس کا اثر زبان' تعلیم' معیشت' تجارت' کرنسی غرضیکہ ہر شعبہ زندگی پر محیط ہے۔ اب یہ عجیب سی بات لگتی تھی کہ ملک تو تمام کا تمام فرانسیسی رنگ میں رنگا ہوا ہو' سرکاری زبان کے علاوہ عوام کی زبان بھی فرانسیسی ہو اور ملک کا نام انگریزی میں ہو۔ چنانچہ انگریزی کے نام کا ترجمہ کر کے ملک کو نیا نام دے دیا گیا۔ تبدیلی نام کے کوئی سیاسی مضمرات اگر ہوتے تو نظر آتے۔ کچھ سفارتی حلقوں کے مطابق تبدیلی نام کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ ان کی رائے میں صدر مملکت کو یہ بات

گوارا نہیں تھی کہ بین الافریقی کانفرنسوں میں جہاں نشستوں کا انتظام انگریزی حروف ابجد کے مطابق سے ہو- وہ صف اول کی نشست سے اس لئے محروم رہیں کہ ان کے ملک کا نام انگریزی حرف آئی سے شروع ہوتا ہے- اب چونکہ ان کے ملک کا نام انگریزی حرف سی سے شروع ہوتا ہے- اس لئے پروٹوکول کے لحاظ سے وہ صف اول میں نشست سے محروم نہیں رہ سکتے- نئے نام کی اس وجہ تسمیہ سے مزاح کا پہلو تو نکلتا ہی ہے- لیکن اس سے اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ صدر مملکت کی ذاتی انا ان کے بہت سے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے- وہ تقریباً ۳۵ سال سے ملک پر حکمران ہیں- عمر عزیز ۸۵ سال سے تجاوز کر چکی ہے- صحت مند ہیں' فعال ہیں' ملک پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے- افریقہ کے معاملات پر عموماً اور مغربی افریقہ کے معاملات پر بالخصوص ان کی گہری نظر ہوتی ہے- کہا جاتا ہے کہ پڑوسی ملک برکینافاسو کے صدر ٹامس سنکارا کے خلاف اکتوبر ۱۹۸۷ء کا خونی انقلاب برپا کرنے میں ان کا ہاتھ تھا اور نئے صدر کیپٹن بلیز کمپاری CAPT, BLAISSE COMPAORE کو وہی برسراقتدار لائے ہیں- مسز کمپاری صدر مملکت ہمنٹ بوانی BO- IGNE -HOUMPHET کی عزیز بھی ہوتی ہیں سابق صدر ٹامس سنکارا منہ زور تھے محب وطن تھے اور فرزند افریقہ کہلاتے تھے ان کے قتل پر پورے افریقہ میں ترقی پسند تحریک کو دھچکہ لگا- ان کے دوست دشمن سب ان کی تعریف کرتے تھے' ماسوائے کوٹ ڈی ایوار کے سب ممالک میں سوگ منایا گیا- نئے صدر کیپٹن بلیز کمپاری کو کوٹ ڈی ایوار نے ہی سب سے پہلے تسلیم کیا تھا اسی طرح جب انہوں نے اپنی حکومت کو تسلیم کروانے کے لئے مغربی افریقہ کے ممالک کے دورے کرنے کا پروگرام بنایا تو صدر ہمفٹ بوانی ہی نے ان کی امداد کی اور دوسرے فرانکو فون ممالک پر ان کی پذیرائی کے لئے راہ ہموار کی پیرانہ سالی کے باوجود وہ ابھی تخت سے ریٹائر ہونے کی نہیں سوچ رہے ان کے قریبی مشیروں کی رائے میں انہیں اپنا جانشین مقرر کر دینا چاہئے تاکہ ان کی وفات پر جانشینی کا تنازعہ نہ اٹھ کھڑا ہو- لیکن صدر مملکت ٹال

جاتے ہیں شنید ہے کہ ایک بے تکلف محفل میں انہوں نے بتایا کہ وہ افریقی تاریخ و روایات کو بخوبی جانتے ہیں اور اپنا جانشین مقرر کر کے وہ اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔

آیوری کوسٹ شاید دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں آزادی کے لئے کوئی تحریک نہ چلی تھی۔ بلکہ فرانس نے جب اپنی رضا مندی سے اس خطہ زمین کو آزاد کرنا چاہا تو مقامی طور پر ملک گیر صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ آیوری کوسٹ کے رہنماؤں نے یہاں تک کہا کہ وہ حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں انہیں خود مختاری اور آزادی درکار نہیں ہے بلکہ وہ فرانس کے شکر گذار ہوں گے اگر آزادی کی پیش کش واپس لے لی جائے۔ لیکن فرانس کو احساس تھا کہ اب بیرون فرانس کالونیوں کا زمانہ لد چکا ہے اور زود یا بدیر بوریا بستر لپیٹنے میں ہی عافیت ہے چنانچہ فرانسیسی حکومت نے مقامی رہنماؤں کی مرضی کے خلاف آیوری کوسٹ کو آزاد کر دیا۔ آیوری کوسٹ والے بھی آسانی سے ماننے والے نہ تھے انہوں نے اپنی شرائط پر آزادی قبول کی پہلی شرط تو یہ تھی کہ فرانسیسی فوج ملک میں موجود رہے گی اور اس کے کل مصارف فرانس ادا کرے فرانسیسی بیورو کریسی نو آزاد ملک میں بدستور کام کرے گی اور اس کے بھی کل مصارف فرانس ادا کرے کرنسی کے بارے میں بھی یہی طے ہوا کہ فرانسیسی فرانک سکہ رائج الوقت رہے گا اور مقامی کرنسی سی فا CFA کے ساتھ اس کا ریٹ مستقل طور پر ایک فرانسیسی فرانک کی بجائے پچاس سی فا CFA دونوں ممالک کے درمیان تجارت کے لئے بھی خصوصی معاہدہ ہوا اور یہ بھی کہ آزادی کے بعد سے آج تک آیوری کوسٹ میں جتنے بھی افسر اور ماہرین فرانس سے درآمد کئے جاتے ہیں' ان کے تمام اخراجات فرانس ہی ادا کرتا ہے۔ اپنی اقتصادی مشکلات کے باعث فرانس کوٹ ڈی آیوری کی اس حد تک تو مدد نہیں کر سکتا۔ جتنی پہلے کرتا تھا' لیکن اب بھی بجٹ میں جب تک فرانس کی طرف سے مدد کی مد نہ رکھی جائے بجٹ کا توازن قائم نہیں رہ سکتا یہی المیہ تیسری دنیا کے تقریباً ہر ملک کا ہے اس کی ذمہ داری ترقی

پذیر ممالک پر تو ہے ہی لیکن بنیادی ذمہ داری ترقی یافتہ ممالک کی ہے بجائے اس کے کہ وہ انسانیت کے ناطے سے اقوام عالم کی امداد کریں انہوں نے COLONIALISM کو ایک نئی جہت دی ہے براہ سراست کسی دوسرے ملک پر قبضہ رکھنے میں اخراجات اور دشواریاں بہت ہیں اب قبضے کی نوعیت بدل گئی ہے نئی سوچ کے مطابق کسی ملک کی اقتصادی پالیسی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا جائے تو براہ راست قبضے کی ذمہ داریوں سے نجات مل جاتی ہے' اور بالواسطہ قبضہ بھی قائم رہتا ہے۔ قرضے کو امداد کا نام دیا جاتا ہے جس پر سود مرکب بھی ادا کرنا ہوتا ہے ایک اندزاے کے مطابق قرض دار ملک ابتداء ہی سے نقصان میں رہتا ہے قرضے کی رقم کا بیس فی صد تو قرضہ دینے والا ملک یا ادارہ مشورے کی فیس لے جاتا ہے پھر ماہرین بھی درآمد کئے جاتے ہیں ان کے مصارف قرضدار ملک ادا کرتا ہے۔ قرض کی رقم پر سود در سود بھی ادا کرنا ہوتا ہے فرانس بھی انہی ترقی یافتہ ملکوں میں سے ایک ہے جو غریب ملکوں کو اپنے اقتصادی چنگل سے نہیں نکلنے دے رہا۔

گھانا کے دارالحکومت ۔۔ عکرہ سے کوٹ ڈی آیوار کے دارالحکومت عابد جان کا فاصلہ بذریعہ ہوائی جہاز تو بیس یا پچیس منٹ کا ہے سڑک کے راستے جائیں تو ساڑھے سات گھنٹے لگتے ہیں۔ عابد جان کو دارالحکومت کہنا ویسے واقعاتی طور پر غلط ہے۔ صدر مملکت ہفث بوانی FELIX HOUMPHET- BOI - GNI ایک دور افتادہ گاؤں یاماسوکرو YAMASOUKROU میں پیدا ہوئے تھے۔ جھونپڑیوں پر مشتمل یہ گاؤں عابد جان سے اڑھائی گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ ایک تنگ سی سڑک گھنے جنگل میں سے گزرتی ہے جس پر دور رویہ ٹریفک نہیں چل سکتی۔ اب جو صدر مملکت برسراقتدار آئے تو انہوں نے اپنے آبائی گاؤں کو ملک کا دارالحکومت بنانے کی ٹھان لی یہ پراجیکٹ ان کی نفاست طبع کا شاہکار ہے اور وہ یاماسوکرو YAMASOUKROU پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں ان کے بقول یہ شہران کے خوابوں کی تعبیر ہے عکرہ سے میں اپنی اہلیہ نرگس بیٹے اشتر اوصاف علی اور بہو فریضے علی کے ہمراہ چھٹی پر عابد جان

گیا وہاں یاماسوکرو جانے کا پروگرام بھی بنا واقعی صدر مملکت نے اس شہر کو تعمیر کرنے میں عرق ریزی کی ہے پہاڑی غیر آباد علاقہ اب ہر طور سے ایک ماڈل سٹی ہے۔ سڑکیں کشادہ ' فائیو سٹار ہوٹل ' سکول اور یونیورسٹی تمام کے تمام ایسی ترتیب اور منظم طریقے سے مناسب جگھوں پر تعمیر کئے گئے ہیں کہ اس علاقے کے حسن میں اضافہ ہو گیا ہے رہائشی اور کمرشل علاقے علیحدہ علیحدہ ہیں ایک گرجا گھر بھی موجود ہے وہ بے حد خوبصورت بنا ہوا ہے بیک وقت پندرہ سو آدمیوں کی نشست کا انتظام ہے جب نماز نہ ہو رہی ہو تو یہ گرجا گھر شادی گھر کانفرنس ہال اور میٹنگ ہال کے طور پر استعمال ہوتا دو منزلہ ہے دوسری منزل ایک وسیع ہال پر مشتمل ہے۔ یونیورسٹی کی بلڈنگ قابل دید ہے ایک وسیع و عریض و رقبے پر یہ یونیورسٹی ہر لحاظ سے مکمل ہے شہر سے دس گیارہ کلو میٹر دور ' چند منٹ کا فاصلہ ہے۔ جب ہم وہاں گئے تو یونیورسٹی کھلی تھی۔ پوری یونیورسٹی میں کوئی ایک لڑکا بھی کلاس روم سے باہر نظر نہ آیا وسیع سبزہ زار اور خوبصورت درختوں میں گھری ہوئی یہ ایک ایسی فضا مہیا کرتی ہے جو ہر لحاظ سے تعلیم و تربیت میں ممدو معاون ثابت ہو رہی ہے یاماسوکرو میں پریذیڈنٹ ہوٹل بھی واقعہ ہے یہ فائیو سٹار ہوٹل ہے ہر روز دوپہر کو یہاں بوفے لنچ کا اہتمام کیا جاتا ہے بوفے کے لئے میز بہت ہی لمبی چوڑی ہے اس میں مقامی افریقی کھانے یورپی کھانے اور ہر قسم کی SEA FOOD پیش کی جاتی ہے ہوٹل میں بہت رونق رہتی ہے سیاحوں کے علاوہ عابد جان سے بھی لوگ اس نئے شہر کو دیکھنے کے لئے جاتے ہیں صدر مملکت چاہتے ہیں کہ دارالحکومت میں رونق ہو یہ ایک تجارتی مرکز کی طرح ابھرے اور عابد جان سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو لیکن ابھی ابتداء ہے فرانسیسی حکمرانوں نے اپنے دور حکومت میں عابد جان کو ترقی دی اور اسے ہر طرح سے ایک بین الاقوامی شہر بنایا نیا دارالحکومت منظور و مقبول ہوتے ہوئے کچھ دیر لے گا۔ صدر مملکت نے اپنے لئے یہاں ایک قلعہ نما محل بنا رکھا ہے جہاں وہ سرکاری مہمانوں کو مدعو کرتے ہیں۔ یاماسوکرو کے درمیان ایک قدرتی جزیرہ ہے یہ محل پورے جزیرے پر محیط ہے فصیل

کافی اونچی بنائی گئی ہے فصیل سے باہر ایک گہری خندق بنائی ہوئی ہے اس پر سے گذرنے کے لئے صرف ایک پل ہے جس پر چوبیس گھنٹے پہرہ رہتا ہے مزید حفاظت کے لئے خندق میں ہر وقت پانچ سو کے قریب مگرمچھ موجود رہتے ہیں تاکہ کوئی شخص خندق کو تیر کر عبور نہ کر سکے۔ سیاح محل کے اندر تو نہیں جا سکتے۔ لیکن خندق میں تیرتے ہوئے مگرمچھوں کے نظارے کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں حکومت کے زیر انصرام نزدیک ہی ایک پولٹری کا کھوکھا ہے جہاں سے مگرمچھوں کی تواضع کے لئے کوئی نہ کوئی سیاح مرغی خرید کر خندق میں پھینک دیتا ہے پھڑپھڑانے کا نظارہ طبع پر ناگوار تو گزرتا ہے، مگر ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی جیتی جاگتی مرغی کو مگرمچھوں کے حوالے کرنا ایک روایت بن گئی ہے صدر مملکت کی ہدایت پر مگرمچھوں کی افزائش نسل کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج نہ نکلے۔ چنانچہ مگرمچھوں کی تعداد نہ بڑھ سکی۔ ہر سال ان کی تعداد کو پورا رکھنے کے لئے مرنے والے مگرمچھوں کی جگہ نئے مگرمچھ درآمد کئے جاتے ہیں یاماسوکرو کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرنے کے لئے ہر کانفرنس یہیں پر منعقد کی جاتی ہے سفارت کاروں کو بھی صدر مملکت یہیں اذن باریابی بخشتے ہیں لیکن عابد جان کی اہمیت ابھی بھی باقی ہے یہ ایک قدرتی بندرگاہ ہے فرانسیسیوں نے اسے ترقی دینے میں سالہا سال اور زرکثیر صرف کیا تھا اور موجودہ حکومت بھی اس کی شان و شوکت کو برقرار رکھنے پر بے حد محنت کرتی ہے عابد جان شہر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مغربی افریقہ کا خوبصورت ترین شہر ہے فرانسیسی تہذیب و تمدن میں رنگا ہوا یہ شہر کسی بھی یورپی ملک کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ شہر عین سمندر کے کنارے جزیرہ نما پہاڑیوں پر واقع ہے ایک حصہ صرف اور صرف رہائشی علاقہ ہے یہیں پر صدر مملکت کا بھی گھر ہے یہ پورا علاقہ ایک صاف ستھری رنگین تصویر کی طرح ہے اس حصے میں کوئی شاپنگ سنٹر نہیں ہے کوئی کھوکھا دکان بار یا ایسا مرکز نہیں ہے جہاں کسی قسم کی خرید و فروخت ہو سکے سڑکیں صاف ستھری فٹ پاتھ تجاوزات سے پاک، دو رویہ خوبصورت درخت ان درختوں کی کچھ ایسے طریقے سے

نگہداشت کی جاتی ہے کہ وہ ایک ہی سائز کے نظر آتے ہیں سڑکیں خوب چوڑی ہیں ٹریفک کا مسئلہ پیش نہیں آتا۔ روائت ہے کہ اس علاقے کو صرف رہائشی مقاصد کے لئے مخصوص کرنے کے بعد آیوری کوسٹ کے اہم، چیدہ چیدہ اور نمایاں شخصیات کو ذاتی طور پر ترغیب دی کہ وہ یہاں گھر بنائیں، انہیں ہر وہ سہولت مہیا کی گئی، جو گھر بنانے کے لئے معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ گھروں کے نقشے تک سرکاری طور پر مقرر کردہ ڈیزائنرز نے بنائے۔ ہر گھر اپنی مثال آپ ہے ہر گھر کا فرنٹ منفرد ڈیزائن کا ہے گھروں کی ڈیزائننگ کرتے ہوئے مقامی موسم اور ماحول کا خیال رکھا گیا ہے۔ مجھے عابد جان سے گزرتے ہوئے چند گھروں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے میں نے محسوس کیا کہ موسم اور ماحول کو ملحوظ خاطر رکھ کر گھروں کو ڈیزائن کرنے والوں نے بجلی کی کمی کو بھی نگاہ میں رکھا اور ایسے رخ سے ڈیزائن بنائے کہ گھروں کو آرام دہ رکھنے کے لئے کم سے کم بجلی کی ضرورت پڑے گھروں کے سامنے سڑک تک کے حصے کو صاف ستھرا رکھنے کی ذمہ داری مالک مکان کی اپنی ہے لوکل کونسل کے قوانین اس بارے میں بے حد سخت ہیں اور ان پر شدت سے عمل کروایا جاتا ہے چنانچہ گھروں کا کوڑا کرکٹ گھروں کے باہر رکھنے کی قطعی ممانعت ہے۔ اس حکم کی خلاف ورزی پر بلا لحاظ موقع پر ہی بھاری جرمانہ کیا جاتا ہے۔ فٹ پاتھ پر ایستادہ درختوں کی پرورش اور نگہداشت تو لوکل کونسل کی ذمہ داری ہے اور ان کے گرے ہوئے پتے اور خشک ٹہنیاں تک سمیٹنے کی ذمہ داری بھی لوکل کونسل کی ہی ہے مالک مکان کو اپنے اس حق کا بخوبی احساس ہے اور وہ اس کا بخوبی استعمال کرتا ہے اور لوکل کونسل کو ٹیکس ادا کرتے ہوئے اسے باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ اس رہائشی حصے سے باہر نکلتے ہی ایک خوبصورت عمارت نظر آتی ہے یہ ایک کیتھیڈرل ہے جسے صدر مملکت نے اپنی جیب خاص سے بنوایا ہے یہ ایک منفرد ڈیزائن کا گرجا گھر ہے اس میں بیک وقت دو اڑھائی ہزار نفوس کی نشست کا انتظام ہے ڈیزائن ایسا ہے کہ لاؤڈ سپیکر کے بغیر بھی تمام حاضرین تک آواز یکساں طور پر پہنچ سکے۔ کیتھیڈرل کے اندر اور باہر

اٹلی کا ماربل لگا ہوا ہے۔ وسیع و عریض ٹیریس TERRACE ہے۔ دن بھر عیسائی اور غیر عیسائی کیتھیڈرل میں سینکڑوں کی تعداد میں آتے ہیں۔ غیر ملکی سیاح اپنے ٹور کو مکمل نہیں سمجھتے اگر وہ اس عظیم الشان گرجا گھر کو نہ دیکھیں حضرت عیسیٰ کی زندگی کے اہم واقعات عیسائی روایات کے مطابق رنگدار شیشوں میں بنائے گئے ہیں حقیقت میں صدر مملکت نے اس گرجا گھر کو فقید المثال بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ واقعی یہ عمارت اپنی مثال آپ ہے ورلڈ بنک کے ایک ہمہ مقتدر افسر نے جب خرچ کا تخمینہ پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ مکمل ہونے تک اس پر ۵ ملین ڈالر خرچ ہو چکے ہوں گے ان صاحب کا ردعمل بہت ہی اکاؤنٹس کلرکوں والا تھا۔ انہوں نے ذہنی کمپیوٹر کی مدد سے فوری حساب کتاب کیا ڈالروں کو فرانسیسی فرانک میں تبدیل کیا اور پھر سی فا CFA میں اور گویا ہوئے کہ گرجا گھر کی تعمیر میں اتنا زرکثیر خرچ کرنا اصراف کی مد میں آتا ہے اور ورلڈ بنک سے سڑکوں کی تعمیر و مرمت کے لئے دی جانے والی امداد کا تیسرا حصہ بنتا ہے ان کا یہ تبصرہ صدر مملکت تک بھی پہنچ گیا انہوں نے جو جواب دیا وہ ان کی ذات کی عکاسی کرتا ہے انہوں نے کہا کہ ترقی پذیر ممالک کی ترقی کا کام ورلڈ بنک اور اس کے ذیلی اداروں کی ذمہ داری ہے ان کی رعایا کی روحانی استقامت کی ذمہ داری ان کی اپنی ہے اور دوسرے یہ کہ کیتھیڈرل کی تعمیر پر تمام خرچ تو انہوں نے اپنی ذاتی آمدنی سے برداشت کیا ہے ورلڈ بنک والے اپنے کام سے کام رکھیں اس کیتھیڈرل کا افتتاح کرنے کے لئے روم سے پوپ خود تشریف لائے تھے جس سے اس کیتھیڈرل کی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے اس کیتھیڈرل کی تعمیر کے دوران صدر مملکت کو مشورہ دیا گیا کہ ملک کی آبادی میں مسلمان اگرچہ اقلیت میں ہیں، لیکن اہم ہیں ان کی تالیف قلوب کے لئے صدر مملکت جیب خاص سے ایک مسجد بھی تعمیر کروائیں۔ یہ صائب مشورہ انہوں نے قبول کر لیا۔ مسجد کی ڈیزائننگ کے لئے دنیا بھر کے ماہرین تعمیرات سے رجوع کیا گیا بالآخر ترکی کے ایک ماہر کا نقشہ منظور ہوا اور صدر مملکت نے اپنی جیب سے تعمیر کے تمام مصارف ادا کئے۔ یہ عمارت بھی سیاحوں

کے لئے کشش کا باعث ہے' خوبصورت ہے' موسم اور آب و ہوا کے مطابق طرز تعمیر کی وجہ سے پنکھوں اور ایئر کنڈیشننگ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بیک وقت پانچ سو افراد نماز ادا کر سکتے ہیں کیتھیڈرل اور مسجد کے ساتھ کوئی دکانیں نہیں ہیں' نہ ہی مارکیٹ بنائی گئی ہے' نہ ہی کوئی متولی مقرر ہے۔ صدر مملکت ان دونوں عبادت گاہوں کے مصارف برداشت کرتے ہیں دونوں عبادت گاہوں کا مقصد لوگوں کو روحانی تربیت ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اعلان کرنا ہے یہ دونوں مقاصد بدرجہ اتم پورے ہو رہے ہیں۔ عیسائی اور مسلمان اپنی اپنی جگہ مطمئن ہیں۔

کیتھیڈرل کے عین سامنے ایک سمندری جھیل ہے اور اس جھیل کے دوسرے کنارے پر دنیا بھر میں دوسرا سب سے بڑا انٹر کانٹی نینٹل چین کا ہوٹل ہے اس کا نام ہوٹل ایوار HOTEL IVOIRE ہے یوں تو عابد جان میں دوسرے فائیو سٹار ہوٹل بھی ہیں لیکن یہ ہوٹل کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ ایک سمندری جھیل LAGOON باؤلنگ ایلی BOWLING ALLEY آئس سکیٹنگ رنک SKATING RINK ICE کیسینو CASINO مکمل شاپنگ سنٹر SHOPPING CENTRE فارمیسی PHAR MACY لانڈری مختلف قسم کے ریستوران' وسیع و عریض پارکنگ ایریا پر مشتمل اس ہوٹل میں بین الاقوامی بنک بھی موجود ہیں' اور ٹریول ایجنسیاں بھی یہ ہوٹل بین الاقوامی طور پر بہت ہر دلعزیز ہے اور بیرون ملک سے لاتعداد سیاح گروپوں کی صورت میں اور انفرادی طور پر یہاں قیام کرتے ہیں اس کے بینکوٹ ہال BANQUET HALLS میں بیک وقت پانچ ہزار آدمیوں کا اجتماع ہو سکتا ہے اس کے علاوہ ایک بہت ہی وسیع ہال ہوٹل کے باہر بنایا گیا ہے جو کانفرنسوں کے لئے استعمال ہوتا ہے غرضیکہ ہوٹل کیا ہے ایک شہر ہے جو سہولتوں کے لحاظ سے خود کفیل ہے اور خوبصورت بھی مسجد کو جانے کے لئے اس کے ساتھ والی سڑک سے جانا ہوتا ہے اس سے آگے ایک گولف کلب GOLF CLUB بھی موجود ہے۔ اس کلب میں صرف گولف گراونڈ ہی قابل تعریف نہیں ہے۔ وہاں باقاعدہ ریستوران اور سنیک

بار SNACK BAR بھی موجود ہیں اسے دیکھے بغیر اس کے حسن کا انداز نہیں ہو سکتا' نہ بیان کیا جا سکتا ہے۔

عابد جان کا بین الاقوامی ہوائی اڈہ مغربی افریقہ کے ممالک کے لئے ہت اہمیت رکھتا ہے کم از کم گیارہ عالمی ہوائی کمپنیوں کے ہوائی جہاز یہاں اترتے ہیں اور یہاں سے پرواز کرتے ہیں گھانا سے برکینا فاسو جانا ہو تو یہاں جہاز تبدیل کرنا پڑتا ہے اکثر اوقات یہاں ایک روز قیام کر کے اگلے روز کی فلائٹ پر سفر کرنا ہوتا ہے فرانس' جرمنی سوئیٹرز لینڈ' ہالینڈ کے لئے بھی یہیں سے اگلی پرواز ملتی ہے برکینا فاسو کے لئے ایئرایوار AIR IVORE اور ایئر برکینا AIR BURKINA کی پرواز یہیں سے ملتی ہے ویسے تو یہاں سے سوس ائیر اور کے ایل ایم K L M کی پروازیں بھی برکینا فاسو کے لئے ملتی ہیں لیکن ان کے لئے اگر عکرہ سے چلیں تو ایک دن پہلے چلنا پڑتا ہے بہت کم ایسا اتفاق ہو سکتا ہے کہ آپ کا رابطہ اگلی پرواز سے جو برکینا فاسو لے جائے ہو سکے میرے تین سال کے قیام کے دوران صرف ایک مرتبہ نومبر ۱۹۸۷ء میں ایسا اتفاق ہوا۔ وہ بھی اس لئے ممکن ہو سکا کہ بلا اطلاع کے ایرایوار نے شام کی فلائٹ کا ٹائم ٹیبل تبدیل کر کے صبح کا وقت کر دیا تھا گھانا ایرویز اور ایرایوار کی پروازوں کے درمیان وقفہ اتنا نہیں تھا کہ میں اس فلائٹ میں جا سکتا لیکن میرا ڈپلومیٹ ہونا کام آیا اور دوسرے یہ کہ برکینا فاسو کی سفیر مقیم عکرہ مادام میمونہ ونتارا' QUNTARA MADAMMEMOONA میرے ہمراہ جا رہی تھیں۔ سیرالیون اور لائبیریا سے واپس آتے ہوئے بھی گھانا یا برکینا فاسو جانے کے لئے آگے کی پرواز کے لئے عابد جان میں رکنا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے دفتر خارجہ نے جب کوٹ دی ایوار کو گھانا کے پاکستانی مشن سے علیحدہ کیا تو شاید اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ سفیر مقیم گھانا کو عابد جان میں چاہے مختصر ہی ہو قیام کرنا ہی پڑتا ہے عکرہ اسے عابد جان کا ہوائی سفر تو صرف نصف گھنٹے تک محدود ہے بذریعہ کار یہ سفر تقریباً سات گھنٹے پر محیط ہوتا ہے۔ یہ ایک خوبصورت سڑک ہے جو افریقن ہائی وے AFRICAN HIGHWAY

PAN کا ایک حصہ ہے یہ ہائی وے سینیگال سے شروع ہوتی ہے اور عرصہ زائد از دس سال سے بن رہی ہے‘ یہ بہت بڑا پراجیکٹ ہے سینیگال سے چل کر سیرالیون کی سرحد تک یہ مکمل ہو چکی ہے۔ سیرالیون میں ابھی زیر تعمیر ہے۔ لائبیریا نے آیوری کوسٹ کی سرحد کو ابھی تک مکمل نہیں کیا کوٹ ڈی وائر‘ گھانا‘ ٹوگو‘ سے نائیجیریا تک یہ مکمل ہے۔ یہ نہیں کہ مغربی افریقہ کے ممالک کے درمیان کوئی سڑک موجود نہیں‘ سڑک تو ہے لیکن بعض جگھوں پر اس پر سفر کرنا دشوار ہے یہ سڑک ایک سرکلر روڈ کے طور پر مکمل ہو گی اور مغربی افریقہ کے تمام ممالک سے ہوتی ہوئی ایک متبادل راستے سے سینیگال پہنچ جائے گی جہاں جہاں یہ مکمل ہو چکی ہے سفر آسان ہو گیا ہے ہمارے ہاں کی جی‘ ٹی روڈ سے کشادہ ہے‘ اور شدید بارشوں کے باوجود ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہے اگرچہ اسے پان افریقن ہائی وے کا نام دیا جا رہا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ صرف مغربی افریقہ کے ممالک تک ہی محدود رہے گی۔ اس سڑک پر عکرہ سے سفر کرتے وقت ربڑ کے جنگلات بھی ملتے ہیں۔ عمارتی لکڑی کے گھنے جنگلات بھی ملتے ہیں اسی شاہراہ پر لبنانیوں اور بھارتیوں کے مویشی فارم بھی ہیں۔ مچھلی کے شکار کے لئے ایک بہت بڑی قدرتی جھیل بھی ہے۔ کیپ کوسٹ کی یونیورسٹی بھی اس شاہراہ پر واقع ہے سمندری پانی سے نمک بنانے کی انڈسٹری بھی اس پر واقع ہے۔ کیپ کوسٹ تک تو سڑک گھانا کی حکومت کی بنائی ہوئی ہے اور وہی اسے درست رکھنے کی ذمہ دار ہے۔ کیپ کوسٹ سے آگے جائیں تو فوراً محسوس ہو جاتا ہے کہ اب حقیقی پان افریقن ہائی وے شروع ہو گئی ہے۔ مختلف قصبوں سے گزرتی ہوئی یہ شاہراہ جب گھانا اور کوٹ ڈی ایوار کی سرحد عبور کرتی ہے تو اس کے دونوں طرف کیلے اور اناناس کے فارم نظر آتے ہیں بے حد ترتیب سے لگے ہوئے یہ فارم میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں سے یہ دونوں پھل برآمد کیے جاتے ہیں۔ جدید خطوط پر آباد یہ فارم کوٹ ڈی ایوار کے لئے زر مبادلہ کماتے ہیں۔ آگے چلئے تو عابد جان سے تیس کلومیٹر پہلے کافی کا ایک کارخانہ ہے جہاں کافی برآمد کے قابل بنایا جاتا ہے۔ فضا کافی کی بھینی

بھینی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ آگے چلیں تو عابد جان کا گھریلو صنعتوں کا علاقہ ملتا ہے سڑک کے دونوں طرف لکڑی کے کھوکھوں پرمشتمل یہ ہینڈی کرافٹ مارکیٹ کل دنیا میں مشہور ہے' بڑی منظم ہے' سڑک پر کوئی تجاوزات نہیں ہیں۔ پورے کوٹ ڈی ایوار میں اس مارکیٹ کے علاوہ ہینڈی کرافٹ کا کاروبار کرنے کے لئے کہیں اجازت نہیں ہے عابد جان میں کمرشل ایریا تو جدید خطوط پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے پہلو میں کھوکھوں پر مشتمل ایک مارکیٹ بنی ہوئی ہے جیسی کہ ہمارے ہاں اس مارکیٹ میں پھل' سبزی' کپڑا' جوتے' گھریلو سامان اور مقامی کھانا بھی دستیاب ہے۔ یہاں پر ہاتھی دانت کی مصنوعات بھی ملتی ہیں۔ اس کمرشل ایریا کے علاوہ عابد جان کے کسی حصہ کو ان جگہوں کے علاوہ جو مخصوص کی گئی ہیں کمرشل مقصد کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے نہ ہی کسی اور جگہ کو کمرشل جگہ کے طور پر منظور کیا جاتا ہے یہ نہیں کہ مقررہ فیس دے کر پڑوسیوں سے عدم اعتراض کا سرٹیفکیٹ لے کر کسی بھی جگہ کو کمرشل کے طور پر منظور کروا لیا جائے عابد جان ایک منظم شہر ہے اور اس کے ماحولیاتی فضا کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے بے حد محنت کی جاتی ہے اس شہر میں بہت سی قدرتی اور مصنوعی جھیلیں ہیں' جنہیں صاف ستھرا اور استعمال کے قابل رکھنے کے لئے سالانہ بجٹ ایک ملین ڈالر ہے دکانیں اور شاپنگ سنٹر مغرب سے پہلے بند کر دیئے جاتے ہیں اس کے ساتھ ہی سڑکوں کی صفائی شروع ہو جاتی ہے۔ اندرون ملک روٹ پر چلنے والی بس شہر میں نہیں آ سکتی۔ شہر کے اندر چلنے والی بس مخصوص جگہوں کے علاوہ کہیں اور کھڑی نہیں ہو سکتی۔ یہاں ایک سے ایک خوبصورت اور عالیشان سٹور بھی ہیں نور الحیات ایک لبنانی سٹور ہے جہاں دنیا کی ہر شے دستیاب ہے۔ اس سٹور پر پاکستانی باسمتی بھی مل جاتی ہے۔ ہماری باسمتی اتنی ہر دلعزیز ہے کہ جتنا بھی سٹاک شیلف پر رکھا جائے شام تک بک جاتا ہے۔ یہیں پر تھیلیوں میں بھارتی باسمتی بھی میسر آ جاتی ہے کوالٹی کے لحاظ سے یہ ہماری باسمتی کے ہم پلہ ہے لیکن بھارت میں تو ویسی باسمتی پیدا ہی نہیں ہوتی جو ہمارے ہاں ہے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ

لندن میں ہیڈ کوارٹر رکھنے والی ایک یہودی فرم مغربی افریقہ کو باسمتی سپلائی کرتی ہے یہ فرم پاکستان سے چاول درآمد نہیں کرتی بلکہ ایک بھارتی نژاد سیٹھ لندن میں بیٹھا پاکستانی باسمتی خریدتا ہے، پیک کرواتا ہے، تھیلیوں پر بھارتی باسمتی کی مہر لگاتا ہے اور پھر برآمد کرتا ہے، یہودی فرم ذرا بہتر ہے وہ اس بھارتی سے پاکستانی باسمتی خرید کر پیک کرتی ہے اور برآمد کرتی ہے تھیلیوں پر پاکستانی باسمتی لکھا جاتا ہے۔ پورے مغربی افریقہ میں اس باسمتی کی بے حد مانگ ہے لیکن ہماری برآمد کا انحصار بھارتی اور یہودی فرموں پر ہے۔

میں نے اپنے دور سفارت میں برکینا فاسو اور کوٹ ڈی ایوار کو چاول کی برآمد کے بارے میں ایک رپورٹ مرتب کر کے بھیجی تھی برکینا فاسو کو تو چاول درآمد کرنے کی مسلسل ضرورت ہے۔ اس ملک کی کل پیداوار پندرہ ہزار ٹن ہے۔ کمی پوری کرنے کے لئے اسے بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں کوٹ ڈی ایوار چاول کی پیداوار کے معاملے میں کافی حد تک خود کفیل ہے مقامی چاول موٹا ہوتا ہے لوگ اسی کے عادی ہیں بھارتی اور یہودی فرموں نے یہاں عابد جان میں اپنے ذیلی دفاتر اور بڑے بڑے گودام بندرگاہ میں کھول رکھے ہیں برطانیہ میں رجسٹرڈ فرمیں چاول درآمد کرتی ہیں جو بحفاظت بندرگاہ پر سٹور کر لیا جاتا ہے۔ وہاں سے یہ اندرون افریقہ کے لئے برآمد ہوتا ہے، لیکن یوں برآمد ہونے والا چاول صرف کاغذی طور پر برآمد ہوتا ہے چاول کے لدے ہوئے ٹرک مندرجہ منزل کی بجائے کسی اور منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ حکومت اس معاملے میں بے بس ہے عابد جان پہنچنے والا چاول ہر لحاظ سے کوٹ ڈی ایوار کی ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ مغربی افریقہ کے تمام ممالک اسی فاضل چاول سے فائدہ اٹھاتے ہیں میں نے جب حکومت پاکستان کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور یہ سفارش کی کہ پاکستان سے چاول کی اس خطے میں برآمد کے لئے رابطہ کیا جائے تو معاملہ رائس ایکسپورٹ کارپوریشن آف پاکستان OF PAKISTAN RICE EXPORT CORPORATION کے سپرد کر دیا گیا وہاں سے جو جواب آیا

وہ افسر شاہی کے رویے کا ایک اور شاہکار تھا۔ جواب میں کہا گیا کہ وطن عزیز میں چاول کی مقامی ضروریات سے وافر مقدار کے بارے میں بیرون ملک معاہدے پورے کرنے کے بعد مغربی افریقہ کے ممالک کو برآمد کرنے کے لئے سٹاک نہیں ہو گا' اس لئے معذرت۔ اصل اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہماری وفاقی حکومت کے ایک بااثر وزیر کے بھائی کو رائس ایکسپورٹ کارپوریشن نے اپنا ایجنٹ مقرر کر رکھا تھا اور ان کی وساطت کے بغیر کارپوریشن چاول کی کسی قسم کو بھی برآمد کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ یہ صاحب پیشے کے لحاظ سے پروفیسر تھے اور لندن میں قیام پذیر تھے' چاول کی برآمد کے ساتھ ان کا تعلق صرف اتنا تھا کہ ہر ایکسپورٹ پر انہیں مقررہ کمیشن مل جاتا' اور بس۔ میرے قیام کے دوران نہ تو انہوں نے مغربی افریقہ کا دورہ کیا' نہ چاول بیچنے کے لئے کوئی کاروائی کی' نہ ہی خود کوشش کی مجھے البتہ سمجھایا گیا کہ اس ریجن میں چونکہ تجارت بڑھانا میرا فرض ہے لہٰذا چاول کی فروخت بھی اسی فرض میں شامل ہے۔ مجھے اس منطق کی بالکل سمجھ نہ آئی کہ کمیشن کا حقدار تو کوئی اور ہو اور سرکاری خرچ پر میں اس ایجنٹ کے لئے دورے کرتا پھروں۔ اس دوران میں نے رائس ایکسپورٹ کارپوریشن کو آگاہ کیا کہ ہر سال اس ریجن میں چاول کی درآمد کے لئے معاہدات ستمبر اکتوبر میں طے پاتے ہیں جس کے لئے لابی جولائی سے شروع کرنا مناسب ہے پھر بھارت' چین اور مشرق بعید کے کچھ ملک بھی مقابلے میں پہلے سے موجود ہیں اس لئے فوری اور موثر رابطے کی ضرورت ہو گی۔ خط و کتابت کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو جونیجو حکومت کو ڈسمس کر دیا گیا اور میرے اندازے کے مطابق پروفیسر صاحب کی ایجنسی بھی ختم ہو گئی ہو گی انہیں شاید کچھ فائدہ پہنچا یا نہیں لیکن یہ پہلی مرتبہ تو نہیں ہوا تھا کہ پاکستان میں بیٹھے ہوئے بڑی بڑی مراعات اور تنخواہیں پانے والوں نے کسی سیاسی شخصیت کو خوش کرنے کے لئے غلط فیصلے کئے ہوں۔ ہم اپنی ضرورت سے زیادہ چاول پیدا کرتے ہیں۔ چاول کی برآمد ہمارے لئے نفع بخش ہے۔ برآمد پر حکومت کا کنٹرول ہے۔ حکومت کے کل پرزے غیر ممالک کے دورے پر روانہ

ہونے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ لیکن برآمدی تجارت کو فروغ دینے کے لئے نہ تو کوئی پالیسی وضع کرتے ہیں۔ نہ ہی کوشش۔ نئی منڈیاں ڈھونڈنے میں ہم تساہل سے کام لیتے ہیں اور نتیجتاً اس قیمتی پیداوار کی تجارت ہمارے ہاتھ سے نکل چکی ہے کچھ یہی صورتحال بائیسکل کے بارے میں ہے افریقہ کے پیشتر ممالک تیل پیدا نہیں کرتے ڈیزل اور پڑول انہیں درآمد کرنا پڑتا ہے مختلف وجوہات کی بنا پر عام آدمی سائیکل استعمال کرتا ہے۔ مغربی افریقہ کو سائیکل برآمد کرنے کے لئے میں نے پکیو PECO سے رجوع کیا' لیکن وہی جواب ملا جو چاول کے بارے میں ملا تھا کہ بائیسکل برآمد نہیں کر سکتے اسی طرح ہم مغربی ممالک کو اپنی ٹیکسٹائل کی مصنوعات برآمد کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کرنے کو تیار ہیں اور ان کے مقررہ برآمدی کوٹہ کے خلاف واویلا کرتے رہتے ہیں لیکن براعظم افریقہ کو ایک میٹر کپڑا برآمد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ نہ تو حکومتی ادارے اس خطے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ نہ نجی شعبے کے صنعتکار اور تاجر کوٹ ڈی ایوار میں زرمبادلہ کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے عام لوگوں کی قوت خرید بھی دیگر افریقی ممالک سے بہتر ہے دکانیں اور سٹور غیر ملکی سامان سے بھرے ہوئے ہیں۔ قیمتیں پیرس کے کسی بھی سٹور سے مقابلہ کرتی ہیں۔ فرانس نے فرانکو فون ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کو بے حد مضبوطی سے استوار کر رکھا ہے اور یہی ممالک اس کی مصنوعات کی بہترین منڈی ہیں۔ عابد جان میں ہر وہ شے مل جاتی ہے جو فرانس بناتا ہے اور کوالٹی بھی وہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ممالک کی مصنوعات بھی میسر ہیں۔ امریکہ' کیوبا' چین' روس' برطانیہ' تائیوان' کوریا اور بھارت کی مصنوعات بھی ہر سٹور پر مل جاتی ہیں سوائے پاکستانی اشیاء کے شاید یہ ہمارے کسی کمپلیکس کا نتیجہ ہے کہ ہم کالی جلد والے لوگوں سے تجارت کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ ان لوگوں کے ساتھ تجارت کرنا آسان بھی ہے اور وطن عزیز کے لئے سیاسی لحاظ سے بھی منافع بخش۔ یہاں نہ کوٹہ سسٹم ہمارے آڑے آتا ہے نہ مقامی صنعت سے کوئی مقابلہ ہے نہ مقامی حکومت کی جانب سے عدم تعاون وطن عزیز

کے لئے ان ممالک کے لئے نرم گوشہ بھی ہے حکومتی سطح پر ہمارے تعلقات سے ان سے غیر وابستہ ممالک کی تنظیم کے حوالے سے ہیں ہماری تاریخ ان ممالک کی تاریخ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ان ممالک کو بھی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ اور آزادی کے بعد کی ان کی تاریخ بھی ہماری تاریخ سے ملتی جلتی ہے۔ افریقی لوگ ہم سے کمتر نہیں ہیں اور پھر ان ممالک کے ساتھ تجارت ہم خرمہ و ہم ثواب والی بات ہے۔ ذاتی منافع اور وطن کی خدمت ۔ حکومت کی سطح پر بھی ہم بے اعتنائی ہی برتتے ہیں اور دو طرفہ تجارت کے سیاسی اثرات کی اہمیت کو شناخت کرنے میں ناکام رہے ہیں ہم یہ حقیقت مان کر نہیں دیتے کہ مضبوط تجارتی تعلقات ہی مضبوط سیاسی تعلقات کو جنم دیتے ہیں میں نے اپنے قیام کے دوران ہر شعبے کی طرف سے حکومت پاکستان کی توجہ منعطف کرانے کی کوشش کی' لیکن کوئی حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ یہ ممالک ہمارے بہی خواہ ہیں۔ وہ ہماری طرف رہنمائی ' مدد' مشورے کے لئے دیکھتے ہیں۔ لیکن ہم انہیں کسی طور پر بھی توجہ کے قابل نہیں سمجھتے۔ اخلاقی ہمدردی اور حوصلہ افزائی کے قابل بھی نہیں۔ اس میں کچھ ہماری اپنی مجبوریاں بھی حائل ہیں' لیکن کون سی مشکل ہے جو محنت اور خواہش سے دور نہیں ہو سکتی۔

پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز ایک زمانے میں عالمی دنیا میں بے حد معروف و مشہور تھی۔ ابتداء ہی سے یہ ایک نیم خود مختار کمرشل ادارہ تھا۔ لیکن ان وقتوں میں اس کا زور کمرشل پر کم اور کوالٹی پر زیادہ تھا۔ وطن عزیز کو دنیا میں متعارف کرانے میں اس ادارے کا کافی ہاتھ تھا۔ اس وقت بھی اور اب بھی یہ ایرلائن پاکستان کا فلیگ کیریئر FLAG CARRIER ہے۔ ابتدائی دور میں پاکستانی تو اس پر سفر کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے ہی غیر ملکی مسافر بھی اس کی سروس میں رطب اللسان ہوا کرتے تھے اور اس ایرلائن سے سفر کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اب کچھ عرصہ سے یہ ادارہ زیادہ ہی کمرشل ہو گیا ہے۔ کراچی سے اس کی پروازیں صرف کینیا کے دارالحکومت نیروبی تک محدود ہیں۔ یہ پاکستان اور مشرقی افریقہ کے درمیان زیادہ سے زیادہ رابطہ ہے۔

مغربی افریقہ کے ساتھ تو اس کا رابطہ ہے ہی نہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس خطے میں نام کے لئے ہی سہی ایروفلائٹ AERO FLOT کی ایک پرواز ماسکو کے لئے ماہانہ شیڈول پر چلتی ہے دوسری بلکان ایرلائنز BALKAN AIR LINE ہے۔ جو بلگیریا کے راستے لندن تک جاتی ہے۔ یہ بھی ماہوار شیڈول کی ایک پرواز ہے۔ یہ دونوں ادارے بھی کمرشل ہیں۔ لیکن ان ممالک نے سیاسی تعلقات کو تجارتی تعلقات کی بنیاد پر استوار کر رکھا ہے۔ میری اپنی دانست میں ان دونوں کمپنیوں کو مسافر مغربی افریقہ سے کم ہی ملتے ہیں اور کمرشل طور پر ماہوار ایک پرواز کوئی سودمند ثابت نہیں ہوتی ہو گی لیکن اس خطے میں اپنے اپنے ملک کی FLAG CARRIER کے طور پر پہچانی جاتی ہیں۔ میری اپنی خواہش بھی یہ تھی کہ پی آئی اے بھی اس علاقے میں وطن عزیز کو متعارف کرانے میں اپنا قومی رول ادا کرے۔ چنانچہ میں نے پی آئی اے سے رجوع کیا۔ پی آئی اے کے مینجنگ ڈائریکٹر ایم اے داؤد پوتا نے بکمال مہربانی اپنے ۸ ستمبر۱۹۸۶ء کے خط کے ذریعے مجھے اپنے ادارے کے کمرشل ادارہ ہونے کے بارے میں آگاہ کیا۔ اگرچہ انہوں نے گھانا اور پاکستان کی اہمیت سے انکار تو نہ کیا۔ لیکن پی آئی اے کے کمرشل ہونے کے ناتے سے مجبوریاں بیان کیں پھرمیں نے اس بارے میں مزید یاددہانی کی تو انہوں نے ۲۶ر اکتوبر کے خط کے ذریعے اپنے موقف کو دہرا دیا۔ انہوں نے جو کچھ اپنے خط میں بیان کیا تھا مجھے اس سے اختلاف صرف اس لئے ہے کہ جن رکاوٹوں کا انہوں نے ذکر کیا وہ ایسی نہیں کہ ان پر قابو نہ پایا جا سکے۔ اگر پاکستان اور مغربی افریقہ کے درمیان سیاسی تعلقات کو ترجیح دی جائے تو داؤد پوتا کی بتائی ہوئی مشکلات قابل توجہ ہی نہیں ہیں۔ میرے خیال میں براعظم افریقہ کی پاکستان کے لئے سیاسی اور تجارتی اہمیت کے لئے پی آئی اے کے ذریع رابطہ ضروری ہے' جو عالمی اہمیت کا حامل ہوگا۔ پی آئی اے تو خیر کمرشل ادارہ ہے۔ حکومت کی سطح پر بھی ہم نے اس خطے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ برکینافاسو اس خطے میں ایک مسلمان اکثریت کا غریب ملک ہے۔ اور ہمارے ساتھ رابطہ بڑھانے کا شدت سے خواہش مند

ہے۔

۱۹۸۷ء میں اس کے صدر کیپٹن ٹامس سنکارا نے ایک ملاقات میں بڑی دردمندی سے ذکر کیا کہ اسے پاکستان سے امداد کی توقع ہے۔ پاکستان غیروابستہ ممالک کی تنظیم کا ممبر ہے اور اسلامی ممالک کی تنظیم کا بھی۔ برکینافاسو کے ساتھ اس کا رابطہ دونوں تنظیموں کے ناطے سے زیادہ مضبوط ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں اپنے ملک میں ہر شعبے میں پاکستان سے مشورے اور امداد کی ضرورت ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ پاکستان کے ماہرین برکینافاسو میں کان کنی کے شعبے کو ترقی دینے میں مدد و معاون ہو۔ برکینافاسو میں معدنیات اور قیمتی دھاتیں دستیاب ہیں۔ سونا' مینگانیز' تانبہ' چاندی اور بہت سی قیمتی و حساس دھاتیں بھی ملتی ہیں۔ جو برکینافاسو کی ترقی کے لئے معتدبہ زرمبادلہ کما سکتی ہیں۔ لیکن ایک تو ماہرین کی کمی' دوسرے کان کنی کے عمل کو بروئے کار لانے میں اخراجات ندارد۔ للذا یہ وسائل قوم کے کسی کام نہیں آرہے اور زمین کے نیچے دفن ہیں۔ میں نے ۳۱ر اگست کے خط کے ذریعے حکومت پاکستان سے سلسلہ جنبانی کی تو جواب ملا کہ ہم تو کان کنی کے معاملے میں خود ناتجربہ کار ہیں اور محتاج بھی۔ ہم برکینافاسو کی اس شعبے میں کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ حکومت پاکستان کی وزارت پیٹرولیم اور قدرتی وسائل کے ۱۶ر ستمبر ۱۹۸۷ء کے خط سے مجھے بہت دکھ اور افسوس ہوا۔ مجھے خود حیرانگی ہوئی کہ ہم اس شعبے میں قطعاً نابلد ہیں اور ہماری مشکلات اس شعبے میں بھی وہی ہیں' جو برکینافاسو کی' یعنی فنڈز اور ماہرین کی کمی۔ ۱۹۸۱ء میں اسی ملک کی فرمائش پر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم برکینافاسو میں میسرپانی کے وسائل کے بارے میں کوئی ماہر بھیج دیں گے۔ پھر اس فائل پر گرد و غبار اکٹھا ہوتا رہا' اور ۱۹۸۹ء میں ہم نے ایک ماہر کو بھیج ہی دیا۔ واپڈا کے کارپردازان نے اس ماہر کو آٹھ ہفتوں کے لئے بھجوایا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس ماہر نے وہاں کیا کارگزاری کی۔ لیکن ایک ماہر کو آٹھ برس کے بعد آٹھ ہفتوں کے لئے دور دراز ملک میں بھیجنا ستم ظریفی نہیں تو اور کیا تھا۔ صدر مملکت کیپٹن کامریڈ ٹامس سنکارا کی بے حد خواہش تھی کہ وہ اپنے ملک

کو استحصالی قوتوں سے بچائیں اور اس کے وسائل کو اپنی قوم کے لئے استعمال کر سکیں۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان اس معاملے میں ان کی مدد کرے۔ لیکن انکی یہ خواہش تشنہ ہی رہی۔

انہوں نے اسلامی ممالک کی تنظیم کے ایک اجلاس کے موقع پر صدر جنرل محمد ضیاء الحق سے اس بارے میں تفصیلا گفتگو کرتے ہوئے دو فرمائشیں کیں۔ اول تو یہ کہ ہم برکینافاسو کے دارالحکومت میں نئ سڑکیں بنا دیں اور پرانی سڑکوں کی مرمت بھی کروا دیں۔ صدر ضیاء الحق نے اس بارے میں معذرت کرلی۔ دوسری فرمائش یہ تھی کہ پاکستان برکینا فاسو میں دو ٹیکسٹائل یونٹ لگائے۔ صدر ضیاء الحق نے اس بارے میں وعدہ تو کرلیا' لیکن پاکستان میں کسی بھی سطح پر ان کے ساتھ نہ تو حکومتی اداروں نے تعاون کیا اور نہ ہی نجی شعبے نے۔ ۱۹۸۴ء میں پاکستان سے ایک ٹیکنیکل ڈیلی گیشن نے گھانا اور برکنیافاسو کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور اب تک ہم اس بارے میں خاموش ہیں۔ المناک داستان یہیں ختم نہیں ہوتی۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ جب سیرالیون نے اپنے دارالحکومت میں یونیورسٹی کے طلباء کی ٹریفک پرابلم کو حل کرنے کے لئے اسلامی ممالک کی تنظیم سے مدد کی درخواست کی تو چالیس ملکوں کی اس تنظیم نے اس ممبر ملک کو چھ بسیں دینے سے معذرت کرلی۔ سیرالیون اسلامی ممالک کی تنظیم کا ممبر ہے۔ اگر اس تنظیم کا ہر ممبر ایک ایک بس بھی پیش کرتا تو سیرالیون کی حکومت اور قوم کی ٹرانسپورٹ کی پرابلم حل ہو جاتی۔

یونیسکو میں ہم کیوں ہار گئے

۲۱ر جولائی ۱۹۸۶ء سے ۲۰ر جولائی ۱۹۸۹ء تین سال کے دوران پاکستان نے مختلف بین الاقوامی عہدوں کے لئے عالمی سطح پر انتخابات میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ چند ایک عہدوں کے انتخابات میں حصہ لینے کا تو گرمجوشی کے ساتھ فقط اپنا عندیہ ظاہر کیا لیکن دو اہم عہدوں کے لئے نہ صرف ہم نے اپنی جانب سے امیدوار نامزد کئے بلکہ انتخابات میں باقاعدہ طور پر حصہ بھی لیا۔ مثلاً یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے کے لئے ہماری جانب سے صاحبزادہ یعقوب خان وزیر خارجہ پاکستان امیدوار ہوئے جو شکست کھا گئے۔دوسرے اہم انتخاب میں ہمارے امیدوار جسٹس دراب پٹیل تھے۔ جنہوں نے ہماری جانب سے انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کی نشست کے لئے انتخاب میں حصہ لیا اور ہار گئے۔

علاوہ دیگر اسباب کے جن کے باعث ہمیں دونوں انتخابات میں شکست ہوئی۔ ایک سبب یہ بھی تھا اور میری دانست میں یہ سبب اہم ترین تھا کہ ہم نے ان انتخابات کو چنداں اہمیت نہ دی بلکہ اتنا درخور اعتنا بھی نہ سمجھا کہ جتنا اپنے ملک کے کسی بھی سطح کے ضمنی انتخاب کو لائق توجہ خیال کیا جاتا ہے۔

یونیسکو میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر ایم بو پورے چودہ سال سے فائز چلے آتے تھے وہ افریقی نژاد تھے۔ سینیگال سے تعلق رکھتے تھے۔ مغربی یورپی ممالک اور ان کے حواری ان سے بیحد تنگ آئے ہوئے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ صاحب اس عہدے پر مزید متمکن رہیں۔

بخلاف اس کے مشرقی یورپ کے ممالک کافی حد تک غیر جانبدار تھے۔ ماسکو کی خواہش تھی کہ مغربی یورپ کے ممالک افریقی ممالک کی مخالفت کریں اور اس طرح دونوں بلاک کے درمیان مخاصمت پیدا ہو اور باہم آویزش بڑھ جائے۔ ایم بو MBOW کے ساتھ امریکہ اور اس کے حواری سردمہری اختیار کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے یونیسکو سے ترک تعلق کیا اور تعاون کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس ادارے کو وہ اب چندہ بھی نہیں دیتے تھے اور مغربی ذرائع ابلاغ اس بات کو برابر دہرائے چلے جاتے تھے کہ اگر ایم بو کا تیسری مدت کیلئے انتخاب کیا گیا تو دوسرے تمام مغربی یورپی ممالک اور اس کے حواری بھی یونیسکو کی رکنیت سے فی الفور مستعفی ہو جائیں گے۔

امریکہ اور اس کے حواری ایم بو کی مخالفت میں شدت اختیار کرتے ہوئے یہاں تک چلے گئے کہ وہ یونیسکو کو سالہا سال کی خدمات کے باوجود جو بطور ایک ادارے کے اس نے انجام دیں اسے تباہ و برباد کرنے پر تل گئے۔ یہ امریکی رویہ بہرحال ناقابل فہم نہیں ہے۔

اگر اقوام عالم کمیونزم اور کیپٹلزم (اشتراکیت اور سرمایہ داری) کے دو متحارب گروہوں میں تقسیم نہ ہو گئی ہوتیں تو امریکہ تمام دنیا سے الگ تھلگ ہو جاتا اور اس کی تمام ترقی تصرف و تسلط کہیں نام کو بھی نہ ہوتا۔ مقامی سیاہ فام لوگوں کے ساتھ امریکی قوم اور امریکی حکومت بھی مظالم کو روا رکھتی ہے۔ وہاں انہیں ہر شعبہ زندگی میں نچلے درجے کا شہری خیال کیا جاتا ہے۔ تقریباً ایسا ہی سلوک وہ بین الاقوامی سطح پر بھی سیاہ فام لوگوں کے ساتھ بھی جائز سمجھا جاتا ہے۔ ایم بو یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل ہونے کی دوسری ٹرم کے دوران ایک متنازعہ شخصیت بن گئے تھے۔ اس میں کچھ تو ان کی اپنی ذات اور اپنے رویے کا دخل تھا۔ کچھ کالے لوگوں کے ساتھ امریکہ اور اس کے ساتھیوں کی نفرت کا دخل تھا۔ اس ضمن میں یوں تو بہت سے دلائل دیئے گئے مگر ایک دلیل یہ بھی دی گئی کہ ۱۴ سال سے ڈائریکٹر جنرل یونیسکو کے عہدے پر افریقی

قابض ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اب یہ باری ایشیاء کو ملنی چاہئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی متواتر کہا گیا کہ ایم۔ بو کے عہد میں یونیسکو کو محض افریقی مفادات کا محافظ بنا دیا گیا ہے اور یونیسکو کے فنڈز کو غلط استعمال کیا گیا ہے۔

کچھ ایسے ہی واقعات اور حالات تھے جن میں صاحبزادہ یعقوب علی خاں کو پاکستان کے امیدوار کے طور پر پیش کیا گیا اور یہ باور کرایا گیا کہ یورپی مہم کے پیش نظر ایم۔ بو آئندہ ٹرم کے امیدوار نہیں ہوں گے اور دوسرے ممالک جو اس عہدے کے لئے انتخابات میں حصہ لینا چاہیں گے ان کی طرف سے سنجیدگی کے ساتھ مخالفت نہیں ہو گی۔ اس یقین کو مزید تقویت خود ہمارے امیدوار نے بھی بہم پہنچائی۔ مثلاً انہوں نے کہا "جب ایم۔ بو کو معلوم ہوا کہ صاحبزادہ یعقوب علی خاں متوقع امیدوار ہیں تو انہوں نے کویت میں ایک ملاقات کے دوران خوشی کا اظہار کیا۔ اور اس بات کا یقین بھی دلایا کہ وہ تیسری ٹرم کے امیدوار نہیں ہوں گے۔" ایم بو نے حقیقتاً جو الفاظ استعمال کئے تھے۔ وہ کچھ یوں تھے "اگر آپ (یعنی صاحبزادہ یعقوب صاحب) ڈائریکٹر جنرل ہو جائیں تو مجھے بیحد خوشی ہو گی۔"

صاحبزادہ یعقوب علی خاں کو اپنے تجربے، علمی قابلیت اور ہفت زبان ہونے پر بہت ناز تھا۔ انہیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ یورپی ممالک ان کی بلا چوں و چراں خاطر خواہ امداد کریں گے۔ علاوہ ازیں دفتر خارجہ کے اہم ارکان جو ستون کا درجہ رکھتے تھے اس معاملے میں بہت پر یقین تھے۔ امریکی حواریوں کی طرف سے امداد کا بہم پہنچنے اور خود صاحبزادہ یعقوب خان کا ایشیائی ہونے کے پیش نظر خیال تھا کہ صاحبزادہ یعقوب خان یہ انتخاب جیت جائیں گے مگر وقت آنے پر یہ تمام مفروضے غلط ثابت ہوئے۔

اس انتخاب سے ایک برس پہلے آرگنائزیشن آف افریقن یونٹی OAU کی میٹنگ میں یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ آئندہ برس ایم بو افریقن ریجن سے امیدوار ہوں گے۔ یہ فیصلہ یا تو ہمارے دفتر خارجہ کی نظر سے نہ گزرا تھا یا اس پر دفتری خاک دگر

تہ در تہ اتنی جمع ہو گئی تھی کہ ہم اسے باآسانی نظرانداز کر گئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے روایتی خوش فہمی کے زیراثر یہ سوچ لیا کہ ایم بو اس مرتبہ امیدوار نہ ہوں گے۔ ایم بو سینگال کے شہری ہیں۔ یہ بھی امکان ہے کہ ہمارے مشن نے سینگال سے اس بارے میں دفتر خارجہ کو یقین دلا دیا تھا کہ ایم بو امیدوار نہیں ہوں گے کیونکہ وہ سینگال کے امیدوار نہیں۔ اس کے علاوہ اسی دوران ایک اور واقعہ رونما ہوا جس سے ہمارے دفتر خارجہ کو غلط امیدیں باندھنے کا موقع مل گیا۔

انتخابی معرکے سے پہلے آرگنائزیشن آف افریقن یونٹی کا ایک اجلاس ادیس ابابا میں ہوا۔ ایم بو کی امیدواری بھی اجلاس کے ایجنڈے کا ایک اہم مسئلہ تھا لیکن ایجنڈا کمیٹی نے ایجنڈے کو حتمی شکل دیتے ہوئے اس مسئلے کو ایجنڈے سے خارج کر دیا۔ کمیٹی کا استدلال یہ تھا کہ ایم۔ بو کا تیسری ٹرم کے لئے امیدوار ہونا تو پچھلے سال ہی طے کر دیا گیا تھا لہٰذا اس کے اعادے کی اب ضرورت نہیں رہی۔ ہو سکتا ہے وجہ کوئی اور بھی ہو بہرکیف یہ بات قطعی طور پر واضح ہے کہ ایجنڈا کمیٹی کی نظر میں ایک حتمی طور سے طے شدہ معاملے پر دوبارہ غور و فکر کرنا بے سود اور عبث خیال کیا گیا۔ چنانچہ آرگنائزیشن کے آخری اعلان میں ایم۔ بو اور یونیسکو کے انتخاب کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ دفتر خارجہ نے اس سے متعلق افریقی اعلامیہ کی خاموشی کو یہی سمجھا کہ ایم بو امیدوار نہیں ہوں گے۔ اگر ہمارے دفتر خارجہ نے ادیس آبابا میں کانفرنس کو مانیٹر کیا ہوتا تو ایم۔ بو کے امیدوار ہونے کے بارے میں اعلامیہ میں خاموشی کی وجہ سمجھ میں آ جاتی۔

لیکن ہمارے دفتر خارجہ کا تو اہم قومی و ملکی مسائل کے سلسلے میں کفایت شعاری سے کام لینا طرۂ امتیاز ہے۔ اس لئے اس اہم کانفرنس کو MONITOR کرنے کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا اور یونہی خوش فہمی میں مبتلا رہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سینگال نے ایم بو کو SPONSOR نہ کیا لیکن یہ ضروری نہ تھا کیونکہ وہ تو پچھلے سال ہی سے آرگنائزیشن آف افریقن یونٹی کے امیدوار چلے آ رہے تھے۔

ہمیں صاحبزادہ یعقوب علی خاں کے تفصیلی کوائف مہیا کر دیئے گئے اور ان کے لئے ووٹ مانگنے کے احکامات بھی جاری کر دیئے گئے۔ میرے دائرۂ کار میں گھانا کے علاوہ سیرالیون، لائبیریا، برکینافاسو اور ٹوگو بھی شامل تھے۔ چنانچہ میں اس مہم پر نکل کھڑا ہوا۔ اس دوران موصولہ اطلاعات سے پتہ چلا کہ صاحبزادہ یعقوب علی خان کا یحییٰ خان کی مارشل لائی حکومت میں جنرل ہونا اور مارشل لاء کے دور میں اہم عہدوں پر متمکن رہنا ان کے خلاف پروپیگنڈے میں موثر کردار ادا کر سکتا ہے اور اندیشہ ہے کہ ان کے خلاف یہ حربہ ضرور استعمال ہو گا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارا پڑوسی ملک ہمارے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے میں پیش پیش ہے۔ اس کی روک تھام کرنا بیحد ضروری ہے۔ کیونکہ جمہوری ممالک کے لئے ایک ایسے فوجی جرنیل کو جس نے مارشل لاء کی حکومت کے کلیدی امور انجام دیئے ہوں یونیسکو جیسے ادارے کا سربراہ منتخب کرنا کوئی خوشگوار کام نہ تھا۔ اگرچہ صاحبزادہ یعقوب علی خان کے کوائف میں گوناں گوں خوبیاں درج تھیں۔ یہ کہ وہ ایک اعلیٰ منتظم اور ہفت زبان ہیں۔ کامیاب سفارت کار اور نہایت ذہین جرنیل ہیں مگر یہ کہ انہوں نے یحییٰ خان کی حکومت کی پالیسیوں سے شدید اختلاف کرتے ہوئے ازخود اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور اس کی حکومت کے ان احکامات کی تعمیل کرنے سے صاف انکار کیا جو مفاد عامہ کے یکسر خلاف تھے، درج نہ تھا۔ اس اہم نکتے کی طرف ہمارا دفتر خارجہ بالکل متوجہ نہ ہوا۔ میرے خیال میں میرا وہ خط جس میں اس اہم نکتے کا میں نے ذکر کیا تھا شاید انہی صاحب کے ہاتھ آ گیا جنہوں نے صاحبزادہ یعقوب خاں کا کوائف نامہ تیار کیا تھا اور یوں وہ کوائف نامہ غیر موثر اور ادھورے کا ادھورا رہ گیا۔ اس میں یہ ترمیم نہ کی گئی جس سے ان کی مارشل لا حکومت سے وابستگی کا تاثر زائل ہو سکتا۔

ایشیائی امیدواروں کی فہرست میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ہمارے دفتر خارجہ کے لئے یہ امر استعجاب و حیرت کا باعث تھا مگر بروقت اس بات کا انتظام نہ ہو سکا کہ ایشیائی ممالک کی جانب سے صاحبزادہ یعقوب علی خان متفقہ امیدوار قرار پائیں۔

پھر ASEAN نے بھی ہم سے تعاون نہ کیا۔ ایک دیگر مسلمان ملک کی جانب سے بھی ایک امیدوار کھڑا ہوا۔ اگرچہ اس ملک سے ہمارے تعلقات اتنے ہی پرانے ہیں کہ جتنی ہمارے ملک کی عمر ہے۔ تاہم جب اس ملک سے درخواست کی گئی کہ وہ ہمارے امیدوار کے مقابلے سے اپنے امیدوار کو ہٹا لے کیونکہ ہم دونوں ممالک ایشیائی ہیں۔ دونوں مسلمان ہیں۔ اس لئے یہ زیب نہیں دیتا کہ دو مسلمان ممالک ایک دوسرے کے مقابلے پر آئیں مگر ہماری درخواست کو قبول نہیں کیا گیا بلکہ یہی دلائل پیش کرتے ہوئے ہم سے مطالبہ کیا گیا کہ آپ ایک مسلمان ملک ہونے کے رشتے سے ہمارے امیدوار کے حق میں اپنے امیدوار کو دستبردار ہونے کی ہدایت کر دیں کیونکہ ہم بھی آپ کے مسلمان بھائی ہیں۔ اسی دوران ایک مشرقی یورپ کے ملک نے اپنا امیدوار بھی میدان انتخاب میں کھڑا کر دیا۔ امیدواروں کی صف میں سب سے آخر میں سپین کے امیدوار مسٹر فریڈرک میئر آ کھڑے ہوئے اور آخرکار وہی اس انتخاب کی بازی جیت گئے۔ ان کی جیت میں تعصب نے بہت کام کیا۔ یعنی نسلی تعصب کی مدد سے یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ نہ تو افریقہ کے پاس رہنے دیا گیا اور نہ کسی ایشیائی ملک ہی کے پاس آیا اور اس طرح امریکہ کے غیرجانبدار طرز عمل کا جس کا وہ بڑی شدت سے دعویٰ کرتا تھا اور اس کے حواریوں کے جھوٹ کا پول کھل گیا جو کالے اور گورے سے مساویانہ اور منصفانہ طرز عمل اختیار کرنے کے بلند بانگ دعوے کرتے رہتے تھے۔

ابتداء میں تو عالمی رائے عامہ کو امریکہ اور اس کے حواریوں نے یہی تاثر دیا تھا کہ وہ اس مسئلے میں صرف اتنی دلچسپی رکھتے ہیں جس سے ایم بو تیسری ٹرم کے لئے منتخب نہ ہو سکیں اور یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف ایم بو ہی کو پھر منتخب کیا گیا تو یاد رکھیں بہت سے ممالک ہماری حمایت کرتے ہوئے یونیسکو کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں گے۔

پاکستان کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی تھی کیونکہ مغربی ممالک ابھی اپنے کسی متبادل

امیدوار کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے۔ ادھر یہ عالم تھا کہ صاحبزادہ یعقوب علی خان باوجود وزیر خارجہ ہونے کے خوش نہ تھے۔ وہ وزیراعظم محمد خاں جونیجو کی حکومت کے شاکی تھے جب انہوں نے یونیسکو کے عہدے کے لئے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تو حوصلہ افزائی کی گئی۔ شاید جونیجو حکومت کا یہ خیال بھی ہو کہ اسے ایک ایسے بھاری بھرکم وزیر خارجہ سے بدمزگی کے بغیر خلاصی ہو جائے گی جو امور خارجہ میں اپنی رائے بھی رکھتا ہے۔

ہمارے پڑوسی ملک کے بارے میں تو پہلے ہی سے یہ تاثر تھا کہ وہ اپنی روایت کے مطابق ضرور ہماری مخالفت میں پیش پیش ہو گا چنانچہ اس کی طرف سے تو ایسا ہی ہوا مگر حقیقت میں نہایت سنجیدگی سے ہماری اصل مخالفت انہی ملکوں نے کی جن پر صاحبزادہ یعقوب علی خاں بھروسہ رکھتے تھے۔ صاحبزادہ یعقوب علی خاں کے ملٹری کیریئر کو مغربی ممالک کے ذرائع ابلاغ نے خوب اچھالا اور اس کی بڑی تشہیر کی اور یہی امر زیادہ تر ان کی ناکامی کا موجب ٹھہرا۔

میں ان دنوں ووٹ حاصل کرنے کے لئے مختلف ملکوں کے دورے پر تھا۔ برکینافاسو سے واپسی پر گھانا آنے کے لئے عابد جان میں ایک رات ضرور ٹھہرنا پڑتا ہے کیونکہ براہ راست فضائی سفر کا کوئی سلسلہ موجود نہیں۔ برکینا فاسو سے عابد جان آتے ہوئے جہاز میں ہیرالڈ ٹریبون کے ایک کالم میں یونیسکو کے انتخاب کے بارے میں ایک تجزیہ میری نظر سے گزرا۔ تجزیہ نگار کے خیال کے مطابق انتخابی مقابلہ تو اصل میں ایم بو مسٹر فریڈرک میئر اور صاحبزادہ یعقوب علی خاں کے درمیان تھا۔ باقی تین چار امیدوار تو صرف دکھاوے اور نمائش کے لئے تھے۔

تجزیہ نگار نے مسٹر میئر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس انتخابی مہم میں بہت دیر کے بعد شریک ہوئے ہیں۔ اس لئے انہیں جیتنے کے لئے سخت محنت درکار ہو گی۔ پھر اس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ایم۔ بو بھی پہلے ہی راؤنڈ میں شکست کھا جائیں گے۔ البتہ بالاخر مقابلہ صاحبزادہ یعقوب علی خاں اور مسٹر

میئر کے درمیان ہو گا جو یقیناً بہت سخت اور معرکتہ الارا ہو گا۔ اسی تجزیے میں بھی صاجزادہ یعقوب علی خاں کے فوجی کردار یعنی ملٹری کیریئر کا بطور خاص ذکر کیا گیا تھا۔

عابد جان میں ہوٹل کے ہر کمرے میں رائٹر کی جانب سے انڈور ٹی وی پر خبروں کا فلیش ہوتا رہتا ہے۔ تقریباً رات کے دس بجے کے بلیٹن میں یونیسکو کے انتخاب کے بارے میں بھی خبر تھی۔ تمام امیدواروں کا اس بلیٹن میں ذکر کیا گیا تھا۔ ایم۔ بو کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ اس سے پہلے دو مرتبہ منتخب ہو چکے ہیں۔ اب وہ اس کرسی سے مزید چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے بارے میں اس بلیٹن میں متنازعہ کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی صاجزادہ یعقوب علی خان کے فوجی کردار کا بھی خاص طور سے ذکر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مسٹر میئر کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ اس انتخابی مہم میں بہت دیر کے بعد شامل ہوئے ہیں۔ میں نے یہ ٹی وی پرنٹ لائن منگوا لی اور اپنے دفتر خارجہ کو بھیج دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی واضح کیا کہ ہمارے پڑوسی ملک کا مخالفانہ پروپیگنڈہ تو شاید ہمارے خلاف موثر ثابت نہ ہو سکے البتہ مغربی ذرائع ابلاغ ہمارے امیدوار صاجزادہ یعقوب علی خاں کے فوجی کردار کا جس انداز سے تذکرہ جاری رکھے ہوئے ہے اس سے یقیناً ہمارے امیدوار کی انتخابی مہم پر خوشگوار اثرات مرتب نہ ہو سکیں گے۔

مغرب نے اصل میں صرف افریقی ایم بو سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایشیائی امیدوار کا نعرہ لگایا تھا جس میں پاکستانی امیدوار صاجزادہ یعقوب علی خاں کی مصلحتاً حوصلہ افزائی کی گئی۔ لیکن دونوں امیدواروں کی مہم جوئی کے نتیجے میں افریقہ اور ایشیا کے ووٹ تقسیم ہو جانے کی صورت پیدا ہوئی تو اسپین کے امیدوار پروفیسر فریڈرک میئر کو خاموشی سے آگے بڑھا دیا گیا جس کی تعلیمی قابلیت اور علمی فضیلت صرف اتنی تھی کہ سپین یورپین کمیونٹی کا ایک رکن ہے اور اس کا امیدوار مسٹر فریڈرک میئر ایک سنجیدہ د متین پروفیسر رہ چکا ہے مگر بین الاقوامی امور میں پروفیسر موصوف کا تجربہ صفر تھا۔ ہمارے دفتر خارجہ کو آخری لمحے تک یقین تھا کہ افریقی ایم بو امیدوار نہیں لیکن جب

سپین کا امیدوار نگاہوں کے سامنے آیا تو ہمارے امیدوار اور ان کے مشیران تجربہ کار سبھی ہکا بکا رہ گئے۔

افریقہ نے آرگنائزیشن آف افریقن یونٹی کے فیصلے کے پیش نظر ہمارے امیدوار کی کوئی امداد نہ کی مگر ہم اس بات سے مطمئن رہے کہ ادیس ابابا میں کانفرنس نے ایم۔ بو کے امیدوار ہونے کے بارے میں کوئی ریزولیوشن پاس نہیں کیا۔ حالانکہ میں نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے دفتر خارجہ کو بروقت مطلع کر دیا تھا کہ وہ دھوکے میں نہ رہے۔ ہوا یوں کہ ادیس ابابا کانفرنس کے فوراً بعد ہی میرے یہاں ایک ڈنر کا اہتمام تھا جس میں منجملہ دیگر مہمانوں کے گھانا کے دفتر خارجہ کے ایکٹنگ ڈائریکٹر مسٹر ولمات بھی تشریف لائے۔ موصوف اقوام متحدہ میں گھانا کی ایک عرصے تک نمائندگی کرتے رہے ہیں نہایت قابل آدمی ہیں اور بات ہمیشہ دو ٹوک اور صاف ستھری کرتے ہیں۔ وہ ادیس ابابا کانفرنس سے ابھی ابھی واپس آئے تھے اور وہاں ایجنڈا کمیٹی میں شامل تھے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے مجھے بتایا کہ ایم۔ بو افریقی یونٹی کی آرگنائزیشن کے ہی امیدوار ہیں۔ انہوں نے مجھے ان تمام واقعات اور حالات سے بھی آگاہ کیا جن کے نتیجے میں کانفرنس کے طے شدہ اور حتمی ایجنڈے میں یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کے انتخاب میں ایم بو کے حصہ لینے کے باب میں پچھلے سال کے کئے گئے فیصلے کا اعادہ کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔

میں نے اسی رات اس تمام گفتگو کی ایک تفصیلی رپورٹ تیار کر کے اسلام آباد بھیج دی۔ دفتر خارجہ نے فوری طور پر اس رپورٹ کا نوٹس لیا۔ اس رپورٹ کی روشنی میں اگر کوئی مثبت ردعمل پیدا ہوا تو اس کا تو مجھے علم نہیں البتہ منفی ردعمل ظاہر ہونے کا ضرور علم ہے۔ وہ یوں کہ ایک افریقی ملک مالی میں پاکستان کے چارج ڈی افیرز کی رپورٹ کی ایک نقل مجھے بھیج دی گئی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انکی اطلاع کے مطابق جو انہوں نے مبینہ طور پر مالی کے دفتر خارجہ سے حاصل کی تھی، ایم بو یونیسکو کے لئے امیدوار نہ ہوں گے۔ میں نے جوابی طور پر صرف یہ تحریر کیا کہ میری رپورٹ

قطعی طور پر درست ہے اور مجھے اس کے سوا مزید کچھ نہیں کہنا۔ مگر ایم بو کے امیدوار ہونے کے بارے میں ہمارے دفتر خارجہ کے پالیسی ساز بیوروکریٹ برابر متذبذب رہے۔ تذبذب کی یہی فضا تھی جس میں اپنے امیدوار کے حق میں فضا ہموار کرنے کے لئے میں مختلف ملکوں کے دوروں پر نکلا ہوا تھا۔ میں اپنے دورے کے دوران بھی دفتر خارجہ کو برابر رپورٹیں بھیجتا رہا۔ ٹوگو' برکینا فاسو' لائبیریا' سیرالیون اور گھانا سب کے سب پاکستان کے دوست ممالک میں شمار ہوتے ہیں اور میری تین برس کی سفارت کاری کے دوران مذکورہ ممالک نے پاکستان کے ساتھ اپنی یک جہتی اور خیرسگالی کے جذبات کا بکمال مظاہرہ کیا۔ اس معاملے میں بھی ان کا ردعمل مثبت رہا جس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے کہ ووٹ کے سلسلے میں یوں تو ہماری درخواست پر سبھی نے "ہاں" کر دی مگر ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ اگر ہمارے ریجن سے کوئی امیدوار نہ ہوا تو ضرور پاکستان کے حق میں ہم ووٹ دیں گے۔

IN THE ABSENCE OF A REGIONAL CANDIDATE FROM AFRICA. WE SHALL CERTAINLY SUPPORT PAKISTAN.

ہمارے دفتر خارجہ کا چونکہ اصرار تھا کہ ایم بو امیدوار نہیں ہوں گے اس لئے "ہاں" پر تو یقین و اعتماد کر لیا گیا لیکن اس ہاں کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر دیا گیا۔ لیکن جب اصل حقیقت سامنے آئی کہ ایم۔ بو ہی امیدوار ہوں گے تو ارباب وزارت خارجہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ افریقی ممالک کے بارے میں جو خدشہ میں نے ظاہر کیا تھا۔ آخرکار وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔

صاحبزادہ یعقوب علی خان کے بارے میں دفتر خارجہ کی یہی رائے تھی اور وہ بڑے یقین و اعتماد سے کہتا تھا کہ صاحبزادہ یعقوب علی خاں جیت ہی جائیں گے۔ چنانچہ اس خوش فہمی اور خام خیالی کی بنیاد پر ان کے حضور "سب اچھا ہے" کی سمری بھی

روانہ کی جاتی رہی وہ ذہین و فطین ہونے کے باوجود خود بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ جیت رہے ہیں اور جیت جائیں گے۔ اس بات کا یقین و اعتماد کہ صاجزادہ جیت جائیں گے ہمارے دل و دماغ پر اس قدر حاوی ہوا کہ ہم نے فرانس کی نمائندہ اس بی بی کے رویے کی طرف بھی مطلق توجہ نہ دی جس نے انتخاب کے موقع پر فرانس کی جانب سے حق رائے دہی استعمال کرنا تھا۔

عین انتخاب کے دن بی بی موصوفہ نے اعلان کیا کہ وہ اپنی حکومت کی ہدایت کے باوجود صاجزادہ یعقوب علی خاں کے حق میں ووٹ استعمال نہیں کرنا چاہتیں اور ان کے ملٹری کیریئر کا ذکر کرتے ہوئے بی بی موصوفہ نے استعفیٰ دے دیا جس پر ہماری نمائندہ رکن خاتون انگشت بدنداں رہ گئیں۔ ان کی سادگی یا بے خبری ملاحظہ ہو کہ انہیں انتخاب کے روز بھی آخر تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ بی بی جس کے ساتھ وہ تین چار ماہ سے بیٹھی ہیں کیا کرنے والی ہے۔ ہماری نمائندہ بی بی کم ازکم تین ماہ قبل سے اس انتخابی معرکہ کی تیاری کے لئے بیرون ملک تعینات تھیں۔ اور وہ ہونے والے اہم واقع کا ادراک نہ کر سکیں۔

اس انتخاب کے بارے میں ہمارے دفتر خارجہ میں ایک لطیفہ اور ہوا وہ یہ کہ ایک سرکلر بھیجا گیا جس میں یہ کہا گیا کہ ہم سفارت کار اپنے اپنے میزبان ممالک میں آربیٹریشن بورڈ کے ارکان سے درخواست کریں کہ وہ صاجزادہ یعقوب علی خان کے حق میں اپنا اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ یہ ایک ایسا سرکلر تھا جو محض "خانہ پری" کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ میں نے مذکورہ سرکلر کے سیاق و سباق کے بارے میں دفتر خارجہ سے استفسار کیا اور اس کی پورے طور پر وضاحت چاہی کچھ تاخیر کے بعد۔ جو میرے سوال کا جواب آیا وہ مبہم تھا اور اس سے صاف ظاہر تھا کہ سوال کا جواب دینے والے بھی آربیٹریشن بورڈ کے بارے میں کچھ کم ہی جانتے تھے اور اس کی وجہ تسمیہ سے بھی واقف نہ تھے۔

کچھ ایسا ہی غیر سنجیدہ انتخابی ماحول تھا۔ خوش فہمیوں کا دور دورہ تھا صاجزادہ

یعقوب خان کو دفتر خارجہ نے مسحور کر رکھا تھا کہ "سب اچھا ہے" وہ انتخاب کے میدان میں کود پڑے اور دوسرے ہی راؤنڈ میں فارغ ہو گئے پچھ! دراثر اس شکست کے بعد ہوا یا نہ ہوا۔ لیکن اتنا ضروری ہوا کہ انہوں نے وزارت سے استعفیٰ دے ڈالا اور اس طرح سے پاکستان ایک تجربہ کار وزیر خارجہ سے محروم ہو گیا۔

یونیسکو میں صاحبزادہ یعقوب علی خان کی شکست اور نتیجتاً وزارت سے استعفیٰ سے ایسے دوررس نتائج پیدا ہوئے جن کا وزارت خارجہ اور خود وزیراعظم محمد خان جونیجو تک کو اس وقت ادراک نہ ہو سکا۔

اس کا نتیجہ مزید یہ ہوا کہ وزیر مملکت جناب زین نورانی اور وزیراعظم محمد خاں جونیجو خارجہ امور اور منجملہ دیگر امور بشمول افغانستان کے مسئلے کے کارمختار ہو گئے اور امن کی تاریخ مرتب کرنے کے شوق میں انہوں نے جنیوا اکارڈز پر دستخط کرنے میں ایسی عجلت کی کہ مجاہدین افغانستان کی گیارہ سالہ جدوجہد پر پانی پھیر دیا۔ تادم تحریر افغانستان میں خانہ جنگی کی کیفیت جاری ہے۔

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کے فضائی حادثے کے بارے میں یہی تاثر قائم ہے کہ جنیوا اکارڈز کو دل سے نہ ماننے کے نتیجے میں صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کی جان گئی اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کی افغان پالیسی بھی بتدریج ایسی تبدیل ہوئی کہ پندرہ لاکھ سے زائد افغان مجاہدین کا خون رائیگاں چلا گیا۔ اور ساتھ ہی پاکستان چوٹی کے تجربہ کار فوجی کمانڈروں اور ذہین و فطین افسروں سے محروم ہو گیا۔

ناکامی کا ہیٹ ٹرک

انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس

پاکستان ۱۹۴۷ء سے اب تک صرف ایک مرتبہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کا رکن بن سکا ہے۔ پہلی اور اب تک آخری مرتبہ سر محمد ظفر اللہ خاں مرحوم نے اس بین الاقوامی ادارے میں ہماری نمائندگی کی تھی۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس ادارے کا رکن منتخب ہو جانا ان کے اور پاکستان کے لئے قابل فخر تھا۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جس کے حاصل ہونے سے دنیا میں پاکستان کا وقار بڑھا۔ سر محمد ظفر اللہ خاں مرحوم سالہا سال تک اس ادارے میں پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ وہ واقعی اس قابل تھے کہ اس اونچے عہدے پر متمکن ہوں۔

انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے رکن کا عہدہ انتخاب کے ذریعے حاصل کرنے میں خود سر محمد ظفر اللہ خاں کی ذاتی اور شخصی حیثیت بھی ممد و معاون ثابت ہوئی ان کے بعد پاکستان نے انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کی نشست کے لئے کافی دیر تک اپنی خواہش کا اظہار نہ کیا۔ پھر صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کے زمانے میں ہماری جانب سے چیف جسٹس (ریٹائرڈ) شیخ انوار الحق کو انتخاب کے لئے میدان میں اتارا گیا اور وہ صرف ایک ووٹ حاصل کر سکے اور ہم یہ انتخاب ہار گئے۔

انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں بھارتی جج کی وفات پر ایک نشست خالی ہوئی تو پاکستان نے اس جگہ کو پر کرنے کے لئے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا مگر افسوس ہم اس انتخاب میں بھی ہار گئے۔ اگرچہ ہمیں شکست ہوئی تاہم پہلے سے بھی کہیں

زیادہ باعزت طریقے سے۔ ہمارا مقابلہ بھارت کے امیدوار سے تھا جس نے ۸۴ ووٹ حاصل کئے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے امیدوار (ریٹائرڈ) جسٹس دراب پٹیل کو صرف ۴۲ ووٹ ملے۔

جسٹس دراب پٹیل ہمارے ملک کے نامور وکیل نامور جج اور پھر عدالت عظمیٰ سپریم کورٹ کے بھی لائق فائق جج تھے۔ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کی خالی نشست کے لئے انہیں حکومت وقت کی طرف سے نامزد کرنا حکومت پاکستان کی حد تک بالکل درست فیصلہ تھا۔ ان کی علمی قابلیت، ذہنی صلاحیت اور قانونی مہارت میں کوئی کلام نہیں۔ ان کی حب الوطنی، دیانت داری اور اصول پرستی کا ہر فرد معترف ہے۔ راست بازی اور امانت داری میں ان کا کردار مثالی ہے۔ اسی لئے ہم نے انہیں بین الاقوامی ادارۂ عدل و انصاف کے لئے امیدوار کے طور پر نامزد کیا تھا۔ اندرون ملک ان کا امیج ٹھیک ٹھاک تھا۔ حکمران پارٹی کو بھی وہ بوجوہ چند بہت عزیز تھے اور ہم ان کی خدمات ہی کے عوض یہ عہدہ انہیں پیش کر رہے تھے اور اس طرح پیش کر رہے تھے جیسے کہ یہ ہماری جیب میں تھا۔

ویسے یہ کہنا تو عبث ہے کہ ان کی نامزدگی سے پہلے دفتر خارجہ سے مشورہ کرنا چاہئے تھا کیونکہ اگر پوچھا بھی جاتا تو بھی دفتر خارجہ اپنی افتاد طبع کے مطابق اس نامزدگی پر نہ کسی منفی ردعمل کا اظہار کرتا نہ کوئی متبادل تجویز ہی پیش کرتا اور نہ کوئی مثبت مشورہ دیتا۔ البتہ اگر ان تقاضوں کا جائزہ لے لیا جاتا جن کا پورا کرنا بین الاقوامی سطح پر بیحد ضروری ہے تو یقیناً بہتر ہوتا اور ہمیں خفت نہ اٹھانا پڑتی۔

اپنے تھوڑے سے دور سفارت میں جو مجھے تجربہ حاصل ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اگر حکومت کے دوسرے اداروں کی طرح وزارت خارجہ بھی "سب اچھا" نہ کہے اور اوپر حقیقی اور درست سمری بھیجے اور اسی طرح اگر کوئی سفارت کار بھی "سب اچھا" کے برعکس کوئی صحیح رپورٹ اوپر بھیجے اور بے لاگ تجزیہ کرے تو سمجھ لیجئے کہ اوپر سے نیچے تک اہلکاران دفتر خارجہ سے لے کر اراکین وزارت عظمیٰ اور سربراہان مملکت

تک سبھی اس کا مذاق اڑائیں گے اور استہزا کریں گے اور قطعی پسند نہ کریں گے۔

میں نے یونیسکو میں شکست کے بعد ایک تفصیلی رپورٹ میں ان وجوہات کا ذکر کیا جو ہماری شکست کی موجب ثابت ہوئیں اور دفتر خارجہ کی ان دستاویزات کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی جن کی بنیاد پر میری رائے میں ہم یہ انتخاب تو اسی مرحلے پر ہار چکے تھے جب ایم بو افریقی ممالک کی تنظیم کی جانب سے امیدوار نامزد کیے گئے۔
میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہمارے امیدوار کے بارے میں بکمال ہشیاری و پرکاری اور چالاکی و عیاری مغربی ذرائع ابلاغ "ملٹری کیریئر" کا تذکرہ کرتے رہے مگر ہم نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ پھر سپین سے مسٹر فریڈیک میئر امیدوار نامزد کر دیا گیا۔ اس تبدیلی پر غور کرنا بھی ہم نے مناسب نہ سمجھا۔ پھر میں نے پیش آمدہ تمام حالات اور گرد و پیش کا جائزہ لے کر مختلف ذرائع سے موصول شدہ "سب اچھا" رپورٹوں پر تبصرہ کرتے ہوئے دفتر خارجہ کو مطلع کیا کہ یہ سب کی سب خلاف واقعہ ہیں اور یہ کہ جناب صاحبزادہ یعقوب علی خان کے ذاتی کوائف میں ان کے ہفت زبان ہونے کا ذکر کرنے سے یہ زیادہ اہم تھا کہ ہم مغربی جمہوریتوں کو یہ بتاتے کہ صاحب زادہ یعقوب علی خاں نے فوجی ڈکٹیر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحیٰی خاں کی جابرانہ اور قاہرانہ پالیسیوں کو ماننے اور احکامات کی تعمیل کرنے سے یکسر انکار کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ان کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ مگر افسوس میرے اصرار کے باوجود اس امر پر توجہ نہ دی گئی اور یوں میری آواز جو پاکستان کے وقار کے لئے بلند ہوئی صدا بصحرا ثابت ہوئی اور تمام معاملہ غتربود ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دفتر خارجہ میں میری درست اور حقیقت کے قریب ترین رپورٹوں پر پسندیدگی کا اظہار تو نہ کیا گیا تھا مگر انہیں کولڈ سٹوریج میں رکھ دیا گیا تھا کیونکہ ہمارا امیدوار بھی ایسا ناخوشگوار تجزیہ سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ بہرحال میرے تجزیئے پر کوئی عمل نہ ہوا۔ اور نہ ہی کوئی اثر۔

انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے بارے میں دفتر خارجہ نے "سب اچھا" کی رپورٹ ایک سمری کی صورت میں جب اوپر بھجوا دی تو وہ سخت مرحلہ بھی اب آگیا کہ گاؤں گاؤں نگر نگر اور گھر گھر جا کر مسٹر جسٹس دراب پٹیل کے لئے ووٹ مانگے جائیں۔ گھانا' برکینا فاسو' لائبیریا' سیرالیون اور ٹوگو میں سے گھانا نے تو صاف لفظوں میں ووٹ دینے سے انکار کر دیا۔ گھانا کے سیکرٹری وزارت خارجہ نے بتایا کہ وہ تو اسی روز بھارت کے ساتھ وعدہ کر چکے تھے۔ جس روز بین الاقوامی عدل و انصاف کی نشست بھارتی نژاد جج کے وفات پا جانے پر خالی ہوئی تھی اور یہ کہ اسی بنیاد پر اور گھانا کی روایات کے مطابق اگر گھانا سے بھارت اپنا رابطہ بھی قائم نہ کرتا تو بھی یہ نشست چونکہ اسی کے پاس تھی اور اسی کے جج کی وفات پر خالی ہوئی تھی اس لئے گھانا اپنا ووٹ بھارت ہی کے امیدوار کے حق میں استعمال کرتا اور اسی کی حمایت کرتا۔ ہاں البتہ اگر بھارت اس نشست کے لئے اپنا امیدوار نامزد نہ کرتا تو وہ پھر کسی دوسرے دوست ملک کے نامزد امیدوار کے بارے میں سوچتے اور غور کرتے۔

بخلاف اس کے برکینافاسو' لائبیریا اور سیرالیون نے بلاتامل ہماری حمایت کرنے کا وعدہ کیا۔ برکینا فاسو والوں نے تو یہاں تک کہا کہ اگر پاکستان یہ نشست جیت گیا تو وہ سمجھیں گے کہ یہ انتخاب وہی جیتے ہیں اور یہ کہ پاکستانی امیدوار نہ صرف بین الاقوامی عدالت انصاف میں پاکستان کا نمائندہ ہو گا۔ بلکہ اسے برکینافاسو کا بھی نمائندہ تصور کریں گے۔

گھانا میں میری ملاقات سیکرٹری وزارت امور داخلہ سے ہوئی تھی۔ اس کے دو ٹوک اور واضح جواب کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں صدر مملکت جے جے رالنگ سے بھی ملوں۔ چنانچہ ملاقات کے لئے میں نے استدعا کر ڈالی لیکن جب مجھے تاخیر محسوس ہوئی تو میں نے سوچا کہ انتظار کرنے کی بجائے دوسرے پڑوسی ملکوں کی جانب جلد سے جلد چلا جاؤں۔ لائبیریا' سیرالیون اور برکینافاسو میں وزرائے خارجہ کے

علاوہ سربراہان مملکت سے بھی میری ملاقات ہوئی اور جناب جسٹس دراب پٹیل کی حمایت کرنے کا وعدہ ان سب حضرات نے ازخود کیا اور اس سلسلے میں اپنی اپنی حکومت کی طرف سے ہدایات بھی جاری کر دیں۔

مذکورہ بالا ممالک کا رخ کرنے سے پہلے مجھے معلوم ہوا کہ جناب جسٹس دراب پٹیل کی حمایت کرنے کا وعدہ اور اعتماد حاصل کرنے کے لئے بلغراد میں پاکستان کے سفیر جناب ایس کے دہلوی کو سفیر خصوصی کے طور پر نامزد کیا گیا ہے۔ ان کے دورے کی جب تفصیلات معلوم ہوئیں تو پتہ چلا کہ وہ صرف ٹوگو تک ہی دورہ کر پائیں گے۔ یہ بھی علم ہوا کہ انہوں نے اپنے طور پر ہی ٹوگو کے صدر سے ملاقات کے لئے سلسلہ جنبانی کی ہے۔ میں نے بھی ٹوگو کے دفتر خارجہ کی طرف رجوع کیا۔ تاکہ میں سفیر خصوصی کے ساتھ جاؤں۔ ٹوگو کے دفتر خارجہ نے خصوصی سفیر ایس کے دہلوی کو اور مجھے بھی یہ اطلاع دی کہ جس تاریخ کو آپ حضرات ٹوگو پہنچنا چاہتے ہیں، صدر مملکت مشرق بعید کے دورے سے واپس آتے ہوئے اس دن دہلی میں ہوں گے۔ اس پر میں نے دفتر خارجہ اسلام آباد کے ذریعے جناب ایس کے دہلوی کو اطلاع دی کہ صدر مملکت اس وقت اپنے ملک سے باہر ہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ ان سے ملاقات کرنے کے لئے کوئی اور تاریخ مقرر کر لیں لیکن اس پر وہ رضامند نہ ہوئے چنانچہ وہ مقررہ تاریخ کے مطابق ٹوگو پہنچ گئے اور مجھے بھی ان کے استقبال کے لئے ٹوگو اسی روز جانا پڑا۔

دفتر خارجہ نے مطلع کیا کہ اگلے روز علی الصبح صدر مملکت کی قیام گاہ پر سینئر منسٹر سے ملاقات ہو گی۔ دوسرے دن جب ملاقات ہوئی تو جناب ایس کے دہلوی نے بڑی خوبصورتی سے جناب جسٹس دراب پٹیل کے لئے ووٹ کی استدعا کی اور سینئر منسٹر نے بلاحیل و حجت جناب جسٹس دراب پٹیل کی حمایت کرنے کی یقین دہانی کرا دی اور برملا کہا کہ پاکستان کے لئے ٹوگو کے صدر خصوصی طور پر نرم گوشہ رکھتے ہیں اور پاکستان کی غیرجانبدارانہ پالیسی کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان

کی حمایت نہ کی جائے۔

مختصراً یہ کہ میرے دائرہ کار میں صرف گھانا ہی ایک ایسا ملک تھا جس نے پاکستان کے امیدوار کی حمایت کرنے سے انکار کیا ورنہ ان بیالیس ووٹوں میں سے جو ہمارے امیدوار کو ملے چار ووٹ میرے دائرہ کار میں آنے والے ملکوں سے تھے۔ حسب معمول یہ انتخابی معرکہ بھی ہماری بے تدبیری کی نذر ہو گیا۔ ہمارے دفتر خارجہ اسلام آباد کی جانب سے جو اطلاعات موصول ہوتی رہیں وہ متضاد تھیں۔ پہلے یہ اطلاع آئی کہ بھارت اس انتخاب میں حصہ نہیں لے رہا۔ پھر یہ کہا گیا کہ بھارت حصہ تو لے رہا ہے مگر ابھی اس کی طرف سے کسی امیدوار کو نامزد نہیں کیا گیا۔ تھوڑے دنوں پھر یہ اطلاع آئی کہ بھارت کے امیدوار کا ریکارڈ ہمارے امیدوار کے ریکارڈ کے مقابلے میں کمتر ہے۔

ہمیں اس انتخاب میں دلچسپی کافی دیر بعد پیدا ہوئی تھی۔ ہماری یہ اطلاع درست نہیں تھی کہ بھارت اس الیکشن میں حصہ نہیں لے رہا بھارت کے بارے میں جب یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تو ہم نے باور کر لیا کہ بھارت نے اپنا کوئی امیدوار ہی نامزد نہیں کیا جب یہ بھی واضح ہو گیا کہ بھارت نے اپنا امیدوار نامزد کر دیا ہے تو پھر یہ کہا گیا کہ وہ پاکستان کے امیدوار کے مقابلے میں نالائق ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ بھارت نے تو مذکورہ نشست کی باقی ماندہ میعاد کے لئے اپنا امیدوار نامزد کرنے کا فیصلہ اسی وقت کر لیا تھا جب اس کا بھارتی نژاد جج فوت ہوا۔ روایتی اور ہمدردی کے ووٹ تو بھارت کو ملنے ہی تھے اس حقیقت کو کیوں نظرانداز کیا گیا اور یہ اندازہ کہ بھارت انتخاب میں دلچسپی نہیں لے گا ہمارے دفتر خارجہ میں کیسے اور کیوں قابل پذیرائی ہوا جبکہ قرائن سے یہ صریحاً غلط تھا۔ ابھی تک ایک معمہ ہے۔ شاید اس وقت بھارت میں مقیم ہمارے سفیر اس راز سے کبھی پردہ اٹھانے کی ہمت کریں۔

مذکورہ بالا غلط اندازے کو ہمارے دل و دماغ میں راسخ کرنے کا ذمہ دار کون ہے؟

اس کا بھی یقینی طور پر کوئی علم نہیں ہو سکا۔ دراصل ہر سرکاری محکمہ کارٹل بنا ہوا ہے اور دفتر خارجہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس محکمے کی افتاد طبع یہ ہے کہ غلطی کرنے والا اگر کیریئر ڈپلومیٹ نہیں ہے تو سارے دفتر خارجہ میں اور نجی محفلوں میں اس کے خلاف اشتہار لگ جاتا ہے۔ بھارتی امیدوار کے بارے میں بھارتی عزائم کا اندازہ ہم درست طور پر نہ لگا سکے۔ میری یادداشت کے مطابق اس وقت بھارت میں ہمارے کوئی کیریئر ڈپلومیٹ متعین تھے۔

ہماری حکومت نے اپنی حد تک جناب جسٹس دراب پٹیل کو انتخاب میں کامیاب کرانے کی بیحد کوشش کی۔ حتیٰ کہ بھارت کے وزیراعظم راجیو گاندھی سے بھی استدعا کر ڈالی کہ وہ ہمارے امیدوار کے مقابلے میں اپنے امیدوار کی نامزدگی واپس لے لیں لیکن ہم یہ بھول گئے کہ بھارت کا وزیراعظم اگرچہ ہمہ جہت مقتدر تو ہے تاہم وہ بھارت کی جمہوری رائے کا پابند ہے اس کے برعکس ہمارے سربراہان مملکت کسی ایسی روایت کے پابند نہیں جس کی بنیاد پر وہ اہم ملکی اور قومی معاملات پر رائے عامہ سے مشورہ کرنا ضروری خیال کریں۔ بھارت سے ایسی استدعا کرنے سے پہلے ہم نے HOME TASK ہی نہ کیا تھا۔ ہم نے اس بات پر بھی غور نہ کیا تھا کہ ہمارے پاس خیرسگالی کے جذبات کے سوا بھارت کو دینے کو کچھ نہیں۔ بھارت نے اس نشست کو حاصل کرنے کے لئے بہت پہلے سے اپنی مہم شروع کر رکھی تھی۔ ہمارے خصوصی سفیر اس مہم میں بعد از وقت شامل ہوئے جبکہ بھارت ہم سے کہیں آگے نکل چکا تھا۔ پھر بھارت سے خیرسگالی کی خیرات ہم نے مانگنے میں بھی تاخیر کی اور بھارتی عزائم کا غلط اندازہ لگایا۔

ہمارے ہاں تو میونسپل کمیٹی کے انتخاب میں وہ امیدوار بھی دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتا جس کے اپنے خاندان والے بھی اسے ووٹ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ یہاں تو معاملہ بین الاقوامی انتخاب کا تھا کسی امیدوار ملک سے کیسے یہ توقع کی

جا سکتی تھی کہ وہ کسی کے کہنے پر دستبردار ہو جائے گا۔

ہماری جانب سے اس انتخابی مہم میں وزیراعظم صاحبہ نے روایات کے خلاف براہ راست حصہ لیا اور مختلف سربراہان مملکت کے نام ذاتی خطوط بھی لکھے۔ اس سے ظاہر تھا کہ حکومت پاکستان جناب جسٹس دراب پٹیل کی کتنی قدرومنزلت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ محترمہ وزیراعظم پاکستان اپنا ذاتی اثر و رسوخ ان کے حق میں استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی ہیں۔

اگرچہ اس کوشش کا چند ایک ملکوں میں خاطرخواہ اثر ہوا اور ایک حد تک اچھا نتیجہ برآمد ہوا لیکن میرے خیال میں ہمارے دیرینہ دوست ممالک میں وہ تاثر پیدا نہ ہوا جس کی توقع کی جاتی تھی۔

لائبیریا کے صدر مملکت جناب ڈاکٹر سیموئیل کے ڈو کو میں نے محترمہ وزیراعظم کا خط ذاتی طور پر پیش کیا۔ خط انہوں نے خود ہی کھولا۔ پڑھ کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

صدر۔ ایمبیسڈر علی شیخ۔ آپ میری جانب سے محترمہ وزیراعظم سے کہیں کہ ہمارا ووٹ ان کے امیدوار کے حق میں جائے گا۔

میں۔ ایکسیلنسی یہ آپ کی عنایت اور مہربانی ہے کہ آپ پاکستان کے لئے ہمیشہ خیرخواہی کا اظہار فرماتے ہیں۔ میں عکرہ واپس جاتے ہی آپ کا مثبت جواب محترمہ وزیراعظم کو پہنچا دوں گا۔

صدر۔ ہاں۔ ہم پاکستان کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے۔ اب دیکھئے محترمہ وزیراعظم نے مجھے یہ دوسرا خط ذاتی طور پر لکھا ہے ہم انہیں انکار نہیں کر سکتے۔

میں۔ جی۔ بے حد شکریہ

صدر۔ جب انہوں نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا تھا۔ تو میں نے انہیں تہنیت کا خط بھیجا تھا۔ اس معمول کے خط کا جواب محترمہ وزیراعظم نے

اپنے دستخطوں سے دیا تھا۔ جس سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ ذاتی طور پر میرے خط کی رسید بھیجنے سے اس جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ جو وہ لائبیریا کے لئے رکھتی ہیں۔ آپ انہیں یقین دلائیں کہ ہم ان کی حکومت کے ساتھ تعاون کرتے رہیں گے۔

لیکن یہ تو صرف ایک ملک تھا۔ جہاں محترمہ وزیراعظم کے ذاتی خط کا خاطرخواہ اثر لیا گیا۔ وگرنہ اکثر ممالک جن میں ہمارے دیرینہ۔ روایتی اور تاریخی دوست شامل تھے۔ نے ہمارے امیدوار کو ووٹ نہ دیا۔ اور یوں وہ بھارتی امیدوار کے ۸۴ ووٹوں کے مقابلے میں ۴۲ ووٹ لے کر ہار گئے۔ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں یہ ہماری دوسری شکست تھی۔

دفتر خارجہ کی مجبوریاں ناقابل فہم نہیں۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ خارجہ پالیسی کو یکدم بدلنا یا اچانک بدلنا قطعی طور سے ناممکنات سے ہے۔ ہم نے اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد آج تو نہیں رکھی۔ یہ عمل تو بیالیس سال سے جاری و ساری ہے اور اب اس میں کسی قسم کی تبدیلی ہونا غیر ممکن ہے اور اگر غیر ممکن نہیں تو بیحد مشکل ضرور ہے۔ جس طرح سالہا سال کی لگن اور دیانتدارانہ رہنمائی سے کسی ملک کی خارجہ پالیسی کے خدوخال ابھرتے ہیں اسی طرح سے اس خارجہ پالیسی کو بدلنے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ البتہ اگر کسی ملک میں کوئی انقلاب آ جائے جیسا کہ ماضی قریب میں ایران میں آیا تو اس کے نتیجے میں بیک جنبش قلم سابقہ خارجہ پالیسی کو فی الفور منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ مسٹر جسٹس دراب پٹیل کی کامیابی کے لئے۔

ہم نے ذاتی حد تک بہت کوشش کی کہ ایشیا کے ریجن کی حمایت ہمیں حاصل ہو جائے مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا کیونکہ بھارت بھی تو ایشیاء ہی کے ریجن میں واقع ہے۔ ہماری یہ کوشش رہی کہ ہمیں مسلم ممالک کی تائید و حمایت حاصل ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس کی طرف رجوع کیا۔ مگر یہ ایک المیہ ہے کہ ہم اس تنظیم کی بھی حمایت حاصل نہ کر سکے حتیٰ کہ ہمارے امیدوار

کی نامزدگی کا مسئلہ میٹنگ کے ایجنڈے میں بھی جگہ نہ پا سکا۔

سننے میں آیا ہے کہ مسلمان ملکوں کے مندوبین نے دبی زبان میں احتجاج بھی کیا کہ ایک اسلامی ملک کی نمائندگی کے لئے ایک پارسی کسی طور پر بھی مناسب امیدوار نہیں ہے۔ احتجاج کرنے والے اسلامی ممالک کی بات میں یقیناً وزن تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی مانی ہوئی ہے کہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے جج صاحبان کو منتخب کرتے ہوئے یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے کہ وہ قانون کے کس مکتبہ فکر و خیال کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جناب جسٹس (ریٹائرڈ) دراب پٹیل اگرچہ بیحد لائق' ذہین و فطین اور ایک دیانتدار جج ہیں۔ پھر ان کے تحریر کردہ فیصلے بھی نکتہ چینی سے بالاتر ہیں لیکن ان کا شخصی تاثر بطور انٹرنیشنل جیورسٹ کے بوجوہ چنداں موثر نہ تھا۔ دوسرے ان کی تمامتر مہارت صرف ANGLO SAXON قانون سے متعلق تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور وجوہات بھی ہوں گی مگر شکست کا واحد سبب اسلامی ممالک کی تنظیم کی حمایت حاصل نہ کر سکنا ہی کافی تھا۔ ہم اگر اس نشست کے لئے امیدوار نہ ہوتے اور بھارت پر احسان دھرتے ہوئے انتخاب میں حصہ لینے سے دست بردار ہو جاتے تو خوب ہوتا۔

اگر یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر ہوتی کہ بھارتی نژاد جج کی وفات کے بعد براہ راست انتخاب میں حصہ لینے کی بجائے ہم بھارت سے یہ کہتے کہ جب ڈیڑھ برس کے بعد اس نشست کے لئے جو بھارتی نژاد جج کی وفات کے باعث خالی ہو گئی ہے پر کرنے کے لئے پھر انتخاب ہو تو خیرسگالی کے جذبے سے یہ نشست ہمیں دیدی جائے تو یقین جانیں کہ اس کا نتیجہ سودمند ثابت ہوتا مگر افسوس ہم نے تو عجز و انکسار کے ساتھ راجیو گاندھی وزیراعظم بھارت سے یہ استدعا کر کے بات ہی گنوا دی کہ بھارت کے وزیراعظم صاحب اپنے امیدوار کو پاکستان کے امیدوار کے مقابلے میں دستبردار ہونے کا حکم دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کی طرف سے پاکستان کے لئے آئندہ کے لئے بھی کوئی وعدہ نہ ہو سکا۔ بالفرض محال اگر وہاں کوئی ایسا وعدہ ہوا ہے تو اس کے

بارے میں پیغامبر وزیر نے قوم کو اپنے اعتماد میں نہیں لیا اور نہ ہی حکومت نے کوئی ایسا اعلان کیا۔

لیکن ہم نے اپنی اس شکست سے کوئی سبق نہ سیکھا۔ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے ایک اور انتخاب میں حصہ لینا ہم نے اپنا حق بھی سمجھا اور فرض بھی۔ جلد ہی وہ مرحلہ آگیا۔ اب عالمی عدالت انصاف کی سات نشستوں کو پر کرنے کے لئے انتخاب ہونا تھا۔ ہم نے اس مرتبہ پھر مسٹر جسٹس دراب پٹیل کو اپنی جانب سے امیدوار نامزد کر دیا۔ اسلامی ممالک کی تنظیم کا ردعمل تو پہلے سے مختلف نہ تھا۔ ابھی تقریباً ڈیڑھ سال پہلے انہوں نے مسٹر جسٹس دراب پٹیل کی نامزدگی پر اعتراض کیا تھا کہ وہ اسلامی فقہ اور قوانین کی نمائندگی نہ کرسکنے کی وجہ سے موزوں امیدوار نہ تھے اور یوں ہمارے امیدوار کی حمایت ایجنڈے پر جگہ نہ پا سکی تھی۔ اس وقت پیرزادہ شریف الدین اس تنظیم کے سیکرٹری جنرل بھی تھے۔ وہ بھی اپنے دوست کے لئے موثر ثابت نہ ہو سکے تھے۔ تو اب جب وہ سیکرٹری جنرل نہ رہے تھے۔ اسلامی ممالک کی تنظیم سے یہ امید کہ انہوں نے ڈیڑھ سال ہی میں اپنی رائے تبدیل کر لی ہو گی محض خوش فہمی تھی۔ لیکن محترمہ وزیراعظم نے مسٹر جسٹس دراب پٹیل ہی کو اس عہدے کے لئے دوبارہ نامزد کر دیا۔ شاید ان کا اندازہ یہ ہو کہ اب بھارت اور پاکستان کا براہ راست مقابلہ نہیں ہے۔ اس لئے سات نشستوں میں سے ایک نشست حاصل کر لینے کا امکان زیادہ ہے۔ لیکن افسوس کہ ان کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔

یہ ضروری نہیں تھا کہ ہم انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے انتخاب میں حصہ لیتے۔ ابھی ہماری شکست کو ڈیڑھ برس ہی تو گزرا تھا۔ اور ہم نے اس انتخاب کے لئے تیاری بھی نہیں کر رکھی تھی۔ اس لئے اگر وہ فیصلہ کر لیتے کہ انتخاب کا بھاری پتھر نہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ تو کوئی حرج بھی نہ تھا پھر یہ کہ اگر محترمہ نے فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں ایک نشست حاصل کرنا ان کی حکومت کے لئے ایک کارنامہ ہو گا تو انہیں چاہئے تھا کہ وہ مسٹر جسٹس دراب پٹیل کی بجائے کوئی

دوسرا امیدوار نامزد کر دیتیں۔ لیکن انہیں تو ضد تھی کہ یہ نشست صرف اور صرف ان کی فیملی کے دوست کو انعام کے طور پر دلائی جانا ضروری ہے اس لئے وہی امیدوار نامزد کئے گئے۔

انتخابات سے کچھ دیر پہلے ۶ اگست ۱۹۸۹ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا اس کی جگہ نگران حکومت قائم ہوئی۔ قیاس تھا کہ نئی حکومت شاید اپنی پیشرو حکومت کے نامزد امیدوار کے فیصلے پر نظرثانی کرے گی اور کوئی متبادل امیدوار نامزد کرے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ تھوڑی سی سلسلہ جنبانی اس سمت میں البتہ ہوئی۔ پیرزادہ شریف الدین اسلامی ممالک کی تنظیم سے ریٹائر ہو کر وطن واپس آ چکے تھے۔ ایک مقامی روزنامہ میں خبر لگی جس میں اس امکان کا اظہار کیا گیا تھا کہ حکومت پاکستان انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کی نشست کے لئے انہیں نامزد کرنے پر غور کر رہی ہے اور مسٹر جسٹس دراب پٹیل کی نامزدگی واپس لے لی جائے گی۔ ایک آدھ خبر مزید اس بارے میں شائع ہوئی۔ لیکن پھر خاموشی ہو گئی اور مسٹر جسٹس دراب پٹیل ہی ہمارے امیدوار ٹھہرے اور دوبارہ شکست سے دوچار ہوئے۔ یوں ہم نے انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں اپنی شکست کا ہیٹ ٹرک مکمل کر لیا۔

جنرل ضیاء الحق پر الزام اور مرزا طاہر احمد کا استقبالیہ اور ذرائع ابلاغ

عکرہ میں تین سالہ قیام کے دوران ذرائع ابلاغ کے ساتھ میرا باقاعدہ رابطہ رہا۔ یہاں جرنلزم کی تعلیم کے لئے باقاعدہ فیکلٹی ہے اور ڈگری کورس دو سال پر محیط ہے چونکہ تعلیم مفت ہے اور عام طور پر اس مضمون کو آسان سمجھا جاتا ہے اس لئے ڈگری کورس کے کافی طالب علم امیدوار ہوتے ہیں۔ گھانا میں اخبارات زیادہ تعداد میں نہیں ہیں۔ پھر ان کی سرکولیشن بھی زیادہ نہیں ہے۔ پاکستان کے لحاظ سے مقامی اخبارات کی قیمت کم ہے لیکن خرید کر اخبار پڑھنے کا رواج کچھ زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چاہے مانگے تانگے کا ہو اخبار پڑھنے کا شوق ہر شخص کو ہے۔

ایک روز میرے سیکنڈ سیکرٹری نے مجھے ایک مقامی اخبار میں شائع شدہ ایک خبر دکھائی جو کہ پاکستان کے بارے میں تو نہ تھی لیکن آخری دو فقروں میں صدر جنرل ضیاء الحق کو بلا کسی ربط کے قاتل اور آمر مطلق کہا گیا تھا۔ میں حیران ہوا کہ اس خبر میں جو بھارت کے متعلق تھی' پاکستان کے حکمران کا ذکر کہاں سے آ گیا۔ میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اسی اخبار میں ہی اس بارے میں احتجاجی مراسلہ شائع کرایا جائے۔ سیکنڈ سیکرٹری کی جانب سے ایڈیٹر کے نام خط میں پاکستان میں فوج سے جمہوری نظام کی طرف سفر کا ذکر کرتے ہوئے صدر جنرل ضیاء الحق پر قاتل ہونے کے الزام کی پرزور تردید کی۔ اخبار نے یہ خط نمایاں جگہ پر شائع کیا۔ اس غیر متعلقہ سی خبر سے پہلے اخبارات میں پاکستان کا ذکر تک نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر پاکستانی سفارت خانے سے

کوئی خبر بھیجی بھی گئی تو وہ نہ چھپی۔ ایک بار پھر میری نظر سے ایک اور خبر گزری۔ یہ تھی پاکستان میں حکومت کی جانب سے احمدیوں پر جور و ستم کے بارے میں۔ الزام یہ تھا کہ پاکستان میں احمدیوں کے بارے میں ایسے قوانین نافذ کئے گئے ہیں جن سے ان کے انسانی حقوق پر زد پڑتی ہے۔ انہی دنوں سندھ میں ایک احمدی کا گھر جلا دیا گیا تھا جس کی خبر ہمارے ہاں ایک اخبار میں چھپی تھی۔ چنانچہ ان دو خبروں کو ڈیٹ لائن کراچی کے حوالے سے عکرہ میں ایک مقامی اخبار نے اچک لیا۔ میری اطلاع کے مطابق یہ دونوں خبریں جماعت احمدیہ عکرہ کے امیر نے مہیا کی تھیں۔ عبدالوہاب آدم گھانا کی جماعت احمدیہ کے امیر ہیں فعال نوجوان ہیں انہوں نے پاکستان میں تعلیم حاصل کی تھی۔ گھانا کے شہری ہونے کے ناطے گھانا کی مختلف مقامی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ انگریزی' اردو اور تھوڑی پنجابی جانتے ہیں۔ میرے پیش رو جناب محمد روال وریامانی سے ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ ہوا یوں کہ جناب راول وریامانی ایک مقامی یونیورسٹی میں اسلام کے بارے میں تقریر کر رہے تھے کہ ایک طالب علم نے پاکستان میں احمدیوں کے مقام کے بارے میں سوال داغ دیا۔ جس کا جواب میرے' پیشرو نے اگرچہ عین حقیقت کے مطابق دیا۔ لیکن اس سے تقریر کے دوران ہی ایک ایسی بحث کا آغاز ہوا جو خوشگوار نہ تھی یوں احمدیہ مشن اور پاکستان مشن کے درمیان تعلقات مخالفت کی حد تک جا پہنچے۔ میں نے دونوں خبروں کے بارے میں اخباری طور پر تو کچھ نہ کیا لیکن امیر جماعت احمدیہ کے ساتھ رابطہ کیا۔ وہ میرے دفتر تشریف لے آئے اور تھوڑی سی ابتدائی دقت کے بعد باقی گفتگو خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ بات چیت کے دوران انہیں معلوم ہوا کہ میں لاہور کے امیر جماعت احمدیہ سے بھی مراسم رکھتا ہوں۔ اور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کے سینئر احمدی وکلاء کا بھی دوست ہوں جن سے وہ ہم مسلک ہونے کی بناء پر رابطہ رکھتے تھے' تو باہمی بھروسے کے تعلقات قائم ہو گئے۔ انہوں نے حتمی وعدہ کیا کہ آئندہ پاکستان اور احمدیوں کے بارے میں ان

کے توسط سے مقامی اخبارات میں کچھ نہ چھپوایا جائے گا۔ اور یہی ہوا۔ انہوں نے اپنے وعدے کی پابندی کی اور پاکستان مشن اور احمدیہ مشن کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کا باب ختم ہو گیا۔

مشن میں میرا کمرہ پہلی منزل پر تھا۔ اوپر جانے کے لئے لابی میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ اسی لابی میں ایک طرف یو ڈی سی کا کمرہ تھا ویزا پاسپورٹ وغیرہ کی ڈیوٹی انہی کی تھی۔ میں نے ابتداء میں دیکھا کہ چند ایک لوگ جن میں کچھ پاکستانی بھی ہوتے تھے لابی میں بیٹھے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یو ڈی سی کی نظر کرم کے انتظار میں ہیں۔ یہ صاحب کچھ مست واقع ہوئے تھے۔ میں نے انہیں بلا کر سمجھایا کہ لوگوں کو انتظار کروانا مناسب نہیں ہے ان کا کام کر کے انہیں جلد از جلد فارغ کر دینا بہتر ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی روش نہ بدلی۔ دو ایک ہفتوں کے بعد میں نے ان سے پھر گفتگو کی اور ان کا زاویہ نظر بھی سنا۔ دن کے دن پاسپورٹ جاری کرنے یا اس پر اندراجات نہ کرنے کا عذر انہوں نے یہ دیا کہ پاسپورٹ کے قواعد کے مطابق اگر درخواست پر اسی روز ایکشن لیا جائے تو دگنی فیس لی جانی چاہیئے۔ اگر معمول کی فیس میں کام کیا تو بعد میں آڈٹ کا اعتراض ہو گیا کہ ارجنٹ کام کی فیس کم لی گئی ہے۔ اور انہیں کمی پوری کرنے کے لئے کہا جائے گا۔ دوسرا اعتراض ان کا یہ تھا کہ درخواست دینے والے کاغذات مکمل نہیں لاتے۔ اس لئے انہیں کاغذات مکمل کر کے اگلے روز آنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ اصل میں ہوتا یوں تھا کہ ایک روز وہ درخواست وصول کرتے تھے۔ اگلے روز اس پر اعتراض لگا کر واپس کر دیتے تھے۔ میں نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ ہاتھ کے ہاتھ کام نہ کرنے کے بارے میں ان کے اعتراضات بے معنی ہیں لیکن وہ اپنی بات پر مصر تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں تحریری طور پر احکامات دیئے جائیں۔ عکرہ کے مشن میں دوسرے ممالک سے بھی ویزا لگانے کے لئے پاسپورٹ میں مختلف اندراجات کرانے' نئے پاسپورٹ کے اجرا یا پرانے

پاسپورٹ کی تجدید کے لئے درخواستیں آیا کرتی تھیں حج اور عمرے کے لئے بھی پاکستانی اسی مشن سے رجوع کرتے تھے۔ بیرون گھانا سے جو صاحب عکرہ آتے ان کے لئے ایک یا دو روز ٹھہرنا وقت اور تکلیف کا باعث ہوتا وہ زیر بار بھی ہوتے تھے۔ اس لئے میری رائے میں انہیں دن کے دن فارغ کرنا مشن کا فرض تھا۔ میں نے یہ قاعدہ بنا لیا کہ لابی میں سے گذرتے وقت جو لوگ بھی بیٹھے ہوں ان سے ضرور بات کرتا اور دریافت کرتا کہ کس کام کے انتظار میں ہیں۔ یو ڈی سی کو بھی تاکید کرتا کہ ان لوگوں کو جلد فارغ کر دیا جائے کبھی کوئی پرابلم ہوتی تو اسے حل کرنے کی کوشش کرتا۔ ایک دفعہ بہت سے لوگ لابی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چند ایک کھڑے بھی تھے ابھی یو ڈی سی نہیں آئے تھے میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا لوگ کہ سیرالیون سے آئے ہیں۔ کسی کو پاسپورٹ کی تجدید کرانا تھی کسی کو اس میں اندراج کروانا تھا کسی کو دستاویزات کی تصدیق کروانی تھی غرضیکہ مختلف قسم کے کام تھے' جو یو ڈی سی کے کرنے کے تھے۔ میں نے معلوم کرایا تو پتہ چلا کہ وہ بعارضہ بخار چھٹی پر ہیں یہ صاحب ابھی نئے تھے۔ میں نے پیغام بھیجا تو وہ آ گئے۔ افریقی بخار بڑا ظالم ہوتا ہے۔ اگر مناسب احتیاط نہ کی جائے تو مہلک بھی ثابت ہوتا ہے۔ بہرحال محمد اقبال یو ڈی سی نے بیمار ہونے کے باوجود میری ہدایت کے مطابق تمام کام بسرعت نپٹا دیا۔ بعد دوپہر احمدیہ مشن سے فون پر امیر جماعت احمدیہ نے شکریہ ادا کیا انہوں نے یہ جانا کہ میں نے جذبہ خیرسگالی کے تحت جماعت کے ممبران کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ حالانکہ جو کاروائی بھی کی گئی تھی اس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اور جتنے لوگوں کا کام نپٹایا گیا وہ سب کے سب احمدی بھی نہ تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس معمول کے کام کو بروقت کر دینے کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

عکرہ میں میرے قیام کے دوران جماعت احمدیہ کے خلیفہ مرزا طاہر احمد نے بھی گھانا کا دورہ کیا۔ وہ چند افریقی ممالک کا دورہ کرتے ہوئے عکرہ پہنچنے والے تھے کہ ۳

فروری ۱۹۸۸ء کو مقامی امیر ایک پاکستانی اے آر خالد کے ہمراہ میرے پاس آئے اور انہوں نے ۱۰ فروری کو امبیسڈر ہوٹل عکرہ میں شام کو ہونے والے استقبالیہ میں شمولیت کے لئے مجھے دعوت دی۔ ایک روز پہلے احمدیہ مشن کی طرف سے ۲ فروری کو ایک باقاعدہ دعوت نامہ میرے نام آچکا تھا چنانچہ ۳ فروری کو مشن کے امیر اور احمدی مبلغ اے آر خالد میرے پاس تشریف لائے تو مجھے علم تھا کہ یہ استقبالیہ مرزا طاہر احمد کے اعزاز میں دیا جا رہا ہے میرے لئے مناسب تھا کہ میں اس استقبالیہ میں شمولیت کے لئے اپنے دفتر خارجہ سے استفسار کر لیتا۔ چنانچہ میں نے امیر جماعت احمدیہ کو بتایا کہ میرا بیرون گھانا جانے کا پروگرام ہے۔ اگر میں ۱۰ فروی کو عکرہ میں موجود ہوا تو بالضرور شامل ہوں گا انہوں نے ۱۱ فروری کو کیپ کوسٹ میں ہونے والی سالانہ احمدیہ کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دبھی دی۔ یہ دو روزہ کانفرنس تھی جس کی صدارت مرزا طاہر احمد نے کرنی تھی۔ باتوں باتوں میں میں نے انہیں مشورہ دیا کہ مناسب ہو گا کہ اس استقبالیہ اور کانفرنس میں پاکستان اور احمدیہ کے بارے میں قوانین کے بارے میں کوئی گفتگو نہ کی جائے انہوں نے وعدہ کر لیا کہ ایسا ہی ہو گا میں نے اسلام آباد سے رجوع کیا تو حسب معمول انہوں نے شمولیت یا عدم شمولیت کا معاملہ میری صوابدید پر چھوڑ دیا۔ میں نے استقبالیہ میں خود شرکت کی اور کانفرنس میں شرکت کے لئے کونسلر ماجد خاں سے کہا انہوں نے انکار کر دیا۔ وجہ ناسازی طبع تھی یہ صاحب کلرکی سے کونسلر کے عہدے تک پہنچے تھے جو ایک بہت بڑا کارنامہ تھا اب وہ مزید ترقی پانے کے متمنی تھے انہیں خوف تھا کہ احمدیہ کانفرنس میں ان کی شمولیت ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گی۔ حالانکہ میری دانست میں ایسی کوئی بات نہ تھی وہ کانفرنس میں شرکت کرتے یا نہ کرتے مزید ترقی ان کی نہ ہوتی اور ایک آدھ سال میں وہ ریٹائر ہوتے۔ بہرحال میں نے سیکنڈ سیکرٹری سلطان احمد کو کانفرنس میں شرکت کے لئے کیپ کوسٹ بھیج دیا۔ امبسڈر ہوٹل میں ۱۰ فروری کا استقبالیہ پر ہجوم

تھا گھانا کی حکومت کی جانب سے وزارت خارجہ کے ڈپٹی سیکرٹری (وزیر مملکت) محمد ابن چمباس نے شرکت کی۔ ری پبلک آف بنین کے سفیر کے علاوہ لبنان کے سفیر بھی تھوڑی دیر کے لئے آئے میں نے استقبالیہ میں شروع سے آخر تک شرکت کی اور یہ بات باعث اطمینان تھی کہ نہ تو کسی نے مرزا طاہر احمد صاحب سے پاکستان کے بارے میں کوئی سوال پوچھا نہ موصوف نے ازخود اس بارے میں کوئی ذکر کیا یہ عین اس شرط کے مطابق تھا جس کے تحت میں نے استقبالیہ میں شرکت کی تھی۔ دو روزہ کانفرنس میں بھی یہی ہوا۔ سیکنڈ سیکرٹری نے اپنی رپورٹ میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا۔

پاکستان کے بارے میں احمدیہ مشن کی جانب سے رویہ اب مناسب طور پر خوشگوار ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے ذرائع ابلاغ میں ان کی جانب سے ہر قسم کی مہم جوئی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن ذرائع ابلاغ کا اپنا رویہ اسلام اور پاکستان کے بارے میں دوستانہ نہ تھا عکرہ میں میری تعیناتی کے چند ماہ کے اندر اندر مقامی ٹیلی ویژن پر یونیسکو کی جانب سے بچوں کا پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوا۔ ۸ نومبر ۱۹۸۶ء کو نشر ہونے والے پروگرام میں ایک بھارتی بچی نے بھی حصہ لیا۔ اس کی کمر کے گرد ایک کپڑے کی پٹی پر انڈیا تحریر تھا جس سے ظاہر کرنا مقصود تھا کہ وہ بھارت کی نمائندگی کر رہی ہے اس نے بھارت کا تعارف ان الفاظ میں کروایا۔

INDIA

My love for peace makes me an active member of the Commonwealth and Non-aligned Movement. I played a very significant role in the granting of independence to Bangladesh. I give economic and technical aid to fellow nation in the form of experts in communication.

یہ الفاظ سنے اور میرے تن بدن میں آگ لگ گئی یونیسکو کے پروگرام میں ایک ممبر ملک کے زخموں پر نمک چھڑکنا' ہر طرح سے جذبہ خیر سگالی کے منافی تھا میں نے بھارت کے منہ سے نشر ہونے والے الفاظ کا پرنٹ ٹی وی سے لینے کی کوشش کی تو کار

پردازان نے ٹال دیا بہرحال کچھ وقت کے بعد مجھے اس بچی کی تقریر کا صحیح متن دستیاب ہو گیا۔ میں نے ٹی وی کے ڈائریکٹر جنرل کے نام ۱۷ نومبر کو ایک احتجاجی مراسلہ بھیج دیا اور اس کی نقل حکومت کے سیکرٹری اطلاعات (وزیر) کو بھیج دی۔ مراسلے کے ملنے کے چند روز بعد ڈائریکٹر جنرل خود تشریف لائے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یونیسکو کا پروگرام انہوں نے نشر ہونے سے پہلے نہ دیکھا تھا کیونکہ وہ چھٹی پر تھے یہ ایک عذر لنگ تھا جب میں نے اس بات پر زور دیا کہ ان کے ہاں یہ پروگرام نشر ہونے سے پہلے ان کی غیر حاضری میں کسی نے تو دیکھا ہو گا تو وہ معذرت خواہ ہوئے اور یہ وعدہ کر گئے کہ آئندہ ایسی فروگذاشت نہ ہو گی میں منتظر رہا کہ وہ تحریری طور پر معذرت کریں گے لیکن ایسا نہ ہوا میں نے سیکرٹری اطلاعات سے ایک ملاقات میں اس بارے میں ذکر کیا انہوں نے مجھے باور کرایا کہ انہوں نے خود ڈائریکٹر جنرل کی گوشمالی کی تھی اور دونوں ممالک کے دوستانہ تعلقات کے پیش نظر آئندہ احتیاط برتی جائے گی۔ اس یقین دہانی کے بعد میں نے اس بارے میں اصرار نہ کیا اور یہی سمجھا کہ میرے مراسلے کا خاطر خواہ اثر ہو گیا ہے۔ چنانچہ ٹیلیویژن کی حد تک پاکستان کے خلاف براہ راست یا بالواسطہ طریقے سے کوئی مزید پروگرام نہ دیکھا گیا۔

۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء میں روس نے افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ یہ افغانیوں کے خلاف کھلی جارحیت تھی۔ روس نے ببرک کارمل حکومت کو افغانیوں پر مسلط کر دیا اور عالمی رائے عامہ کی پرواہ کئے بغیر ایک ایسی جنگ کا آغاز کیا جس نے ایک غیر جانب دار' خود مختار' اسلامی ملک کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ پاکستان اس مسئلے کو اپنی قومی سلامتی کے تقاضوں کے مطابق اقوام متحدہ میں لے گیا۔ ابتداء میں تو امریکی حمایت ہمیں حاصل نہیں تھی۔ بلکہ امریکہ کو کم از کم ۱۹۸۱ء تک قطعی احساس ہی نہ تھا کہ جنوب مشرقی ایشیا میں روسی جارحیت کے کیا نتائج مرتب ہوں گے۔ اس جارحیت کے خلاف ہم نے اولین احتجاج کیا اور صدر جنرل ضیاء الحق نے اس مسئلے میں قوم کو

بھی اعتماد میں لئے بغیر روسی جارحیت کو للکارا۔ بعد میں جب امریکہ نے روسی حملے کے خلاف افغانیوں کی امداد شروع کر تو انسانیت کی حفاظت کا جذبہ کار فرما نہ تھا نہ ہی ایک غیر جانب دار، خود مختار ملک کی آزادی بحال کرنے کا مسئلہ تھا۔ بلکہ صرف اور صرف جذبہ رقابت اور اندیشہ ہائے دور و دراز نے امریکہ کو مجاہدین کی امداد پر اکسایا تھا۔ لیکن یہ امداد اس جوش و خروش سے کی گئی کہ اقوام عالم میں یہ تاثر عام ہو گیا کہ امریکہ انسانیت کی حمایت میں جنگ لڑ رہا ہے اور پاکستان جس نے سپر طاقت روس کو ابتدائے جارحیت سے ہی للکارا تھا، محض امریکی پٹھو کہلوایا اور امریکی حواری بھی کہنے لگے کہ پاکستان تو افغانستان میں امریکہ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ پاکستان نے اقوام متحدہ میں جارحیت کی مذمت کے لئے اور افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلاء کے لئے مطالبہ کیا تو پوری دنیا دو گروپوں میں واضح طور پر بٹ کر رہ گئی۔

گھانا نے جارحیت کے خلاف پاکستان کی قرار داد کا ساتھ اس اصول کی بنیاد پر دیا کہ اس کی نظر میں جارحیت جیسی بھی ہو جہاں بھی ہو قابل مذمت ہے محنت شاقہ سے آہستہ آہستہ پاکستان کی قرار داد کے حق میں ووٹوں کی تعداد جنرل اسمبلی کے اجلاس میں بڑھتی گئی۔ اس دوران روس بھی اپنے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کی تگ و دو میں لگا رہا۔ دیگر ممالک کے ساتھ ساتھ گھانا پر بھی اس کی نظر خاص تھی کہ مغربی ابلاغ عامہ اس ملک اور اس کے حکمرانوں کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ مارکسسٹ ہیں۔ لہٰذا قابل گردن زدنی امریکہ اور اس کے حواریوں کے اس رویے کے باوجود گھانا میں روس کی جارحیت کے بارے میں حمایت کرنے والی لابی نہ تھی۔ لیکن روس ہر وہ حربہ استعمال کر رہا تھا جس سے وہ گھانا کا ووٹ توڑ سکے۔ اگرچہ گھانا اقتصادی اور سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے افریقہ کے لیڈر کے طور پر اپنی عظمت کھو چکا تھا لیکن براعظم افریقہ کے بہت سے ممالک اب بھی بین الاقوامی امور پر گھانا کے رویے سے متاثر ہوتے تھے۔ اگر گھانا کے رویئے میں کوئی بھی تبدیلی آتی تو لازم تھا کہ

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے افریقی ممالک بھی افغانستان کے بارے میں اپنے رویے پر نظرثانی کرتے۔ اس لئے روسی سفیر حکومتی حلقوں کے علاوہ گھانا میں رائے عامہ کو ہموار کرنے میں کوشاں رہتا تھا۔ اخبار نویسوں کے ساتھ اس نے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور اس شعبے میں روس، سوشلزم اور کمیونزم کے ہم خیال نوجوانوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ ۱۹۸۷ء میں جشن کابل میں شرکت کے لئے گھانا سے نوجوان جرنلسٹوں کا وفد گیا اس کی سربراہ مس ڈورس اوکانسی تھیں۔ جو کونسل فار ڈیفنس آف ریوولیوشن COUNCIL FOR DEFENCE OF REVOLUTION میں نمبر دو کا درجہ رکھتی تھیں۔

انہوں نے واپسی پر ایرپورٹ پر ہی پریس کانفرنس میں روسی جارحیت کی حمایت میں جو بیان دیا وہ گھانا کی سالہا سال کی پالیسی کے برعکس تھا۔ بلکہ اس میں گھانا کی حکومت کی مذمت کا پہلو نکلتا تھا۔ اس کے فوراً بعد گھانا کے ایک اہم روزنامہ میں مس اوکانسی کے تحریر کردہ آرٹیکل چھپنے شروع ہوئے۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وفد کے تمام ارکان روسی مہمان نوازی سے شاد کام ہو کر لوٹے ہیں اور ابھی تک سرشار ہیں۔ اور شرابور بھی۔ میں نے اس بارے میں نہ تو اخبار والوں سے کوئی احتجاج کیا نہ ہی تردیدی آرٹیکل چھپوانے کی کوشش کی اگرچہ کچھ جرنلسٹ بھی میرے پاس آئے بو تھوڑے سے خرچ سے اخبارات میں ایک تردیدی مہم بھی شروع کر سکتے تھے لیکن میں نے اجتناب کیا اور بعد میں ثابت ہوا کہ میرا رویہ درست تھا۔ ذرائع ابلاغ سے رابطے میں ہمارے ہاں کمی تھی۔

ہم نے حکومتی سطح پر گھانا میں اس شعبے کی طرف کبھی توجہ نہیں دی۔ میزبان ملک کے ذرائع ابلاغ سے رابطہ رکھنا بنیادی طور پر ہمارے محکمہ خارجہ کا فرض ہے۔ اس معاملے میں مقامی طور پر سفیر کی ذمہ داری بھی ہے۔ لیکن سفیر کے ہاتھ

بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسے بیحد احتیاط سے چلنا پڑتا ہے اگر محکمہ خارجہ اس کی اعانت نہیں کرتا تو وہ بے بس ہوتا ہے ہمارے ہاں اس شعبے میں کام کرنے کے لئے کوئی سہولت نہیں دی جاتی اور نہ ہی اسے قابل توجہ سمجھا جاتا ہے وزارت خارجہ کے ساتھ وابستہ بیرون ملک پبلیٹی ونگ بھی عجیب بادشاہ ہے بیحد خود مختار اور قومی تقاضوں سے بے بہرہ پاکستانی وزارت اطلاعات نے بھی تیسری دنیا میں اپنی سطح پر کوئی رابطہ نہیں رکھا ہوا۔ اس بے اعتنائی اور عدم توجہی سے سفیر کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ گھانا نے ۱۹۸۷ء کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں افغانستان پر ہماری قرار داد کے حق میں ووٹ تو دیا لیکن روس اور گھانا کے ذرائع ابلاغ نے گھانا کی حکومت کی رائے پر اثر انداز ہونے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا تھا کہنے کو تو تیسری دنیا کا پریس ہیڈیا بالکل آزاد ہے لیکن عملی طور پر یہ صورت نہیں ہے مجھے اندازہ تھا کہ مس اوکانسی کے آرٹیکل چھپنے کے پیچھے کوئی دوسرا ہاتھ بھی ہے لیکن اس کا سدباب کرنے کے لئے ذرائع ابلاغ سے مسلسل رابطے کی ضرورت ہوتی ہے جو سالہا سال سے گھانا میں مفقود تھا۔

عکرہ کی مکولا مارکیٹ MAKOLA MARKET میں ایک مسجد تھی کوئی ایک سو بیس برس پرانی اس سکوئیر میں سے ناجائز تجاوزات کو ہٹا کر ایک کار پارک تعمیر کرنے کے لئے عکرہ لوکل کونسل نے نوٹس دینے کے بعد بلڈوزر بھیج دیئے۔ ناجائز تجاوزات تو ایک روز پہلے ہی ہٹائے جا چکے تھے۔ موقع پر اب یہ مسجد ہی کھڑی تھی۔ بلڈوزر اس کی طرف بڑھے تو مسلمانوں نے شور مچا دیا۔ صدر مملکت تک نوبت پہنچی۔ اخبارات نے اس مسئلے پر نمایاں طور پر خبریں شائع کیں اور بتایا کہ کافی عرصہ پہلے مسلمانوں کی مقتدر انجمنوں نے اس مسجد کے گرائے جانے کے بارے میں معاوضہ بھی وصول کر لیا تھا اور نئی مسجد کے لئے متبادل جگہ لینے کے لئے بھی رضا مندی دے دی تھی ان حالات میں مسجد کو گرائے جانے کے بارے میں رائے عامہ کو اخبارات نے

ہموار کیا اور مسلمانوں کو مطعون کیا کہ وہ خود ہی تو مسجد کو بیچ چکے ہیں اس لئے اب تمام احتجاج بے معنی ہے یہ واقعہ تو درست تھا اور یہ بھی کہ کم از کم دس بارہ سال پہلے سے ہی اس مسجد کو گرانے کے بارے میں نہ صرف فیصلہ ہو چکا تھا۔ بلکہ تحریری معاہدہ بھی ہو چکا تھا ایک آدھ فتویٰ بھی حاصل کر لیا گیا تھا کہ اگر متبادل مسجد تعمیر کرنا مقصود ہو تو پرانی مسجد کو گرایا جا سکتا ہے لیکن جس طریقے سے اس تمام واقعے کو اخبارات میں اچھالا گیا تھا اس سے مقامی مسلمانوں کی تضحیک ہوئی اور اسلام کی توہین بھی جس وقت مسجد گرائی جا رہی تھی غیر مسلم لوگ اکٹھے تھے اور وہ انگلیوں سے فتح کا نشان بنا رہے تھے ہنس رہے تھے اخباری فوٹوگرافوں اور ٹی وی کے کیمرے نے یہ منظر محفوظ کر لیا۔ اسی شام یہ تمام منظر ٹی وی پر بالتفصیل دکھایا گیا اگلے روز اخبارات نے تصاویر نمایاں صفحوں پر شائع کیں۔ ساتھ ہی جو سٹوری دی گئی اس سے ٹی وی اور اخبارات کی اسلام سے بیزاری واضح تھی مقامی مسلمان تو خیر کیا کرتے ہم مسلمان ممالک کے سفیروں کے ایک وفد نے سیکرٹری اطلاعات (وزیر) ڈاکٹر محمد بن عبد اللہ سے ملاقات کر کے احتجاج کیا اور یہی کچھ کیا جا سکتا تھا مسجد کی بے حرمتی کی بازگشت پاکستان میں بھی سنی گئی ۔ پارلیمنٹ میں اس کے بارے میں سوال پوچھا گیا کہ پاکستان کیا کر رہا ہے جس کے جواب میں وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان نے بتایا کہ پاکستانی سفیر مسلمان ممالک کے سفیروں اور گھانا کی حکومت سے رابطہ کئے ہوئے ہے۔

۱۹۸۸ء کے اواخر میں ٹی وی رویے کے بارے میں ایک بار پھر گھانا کی وزارت اطلاعات کے ہاں احتجاج کرنا پڑا۔ گھانا براڈکاسٹنگ کارپوریشن کی جانب سے ۳ دسمبر کو موسیقی کا ایک پروگرام نشر ہوا۔ اس پروگرام کے آخر میں ایک ایسا گانا اور ناچ شامل تھا جس سے اسلام کے بنیادی رکن اذان و صلوٰۃ کی تضحیک پائی جاتی تھی اس ڈانس میں ۲ مردوں اور ۲ عورتوں نے حصہ لیا۔ ایک مرد نے عربی لباس پہن رکھا تھا۔ عورتیں تقریباً بے لباس تھیں لیکن یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ مسلمان ہیں سروں پر

حجاب تھا ان کا گانا اور ناچ رکوع و سجود اور چند ایک آیات کے ابتدائی الفاظ پر مشتمل تھا اگلے روز اتوار تھا میں نے فون پر مسلمان سفیروں سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ پروگرام دیکھا تک نہ تھا دو ایک نے میرے ردعمل کی شدت کو محسوس کرنے کے باوجود مجھے مشورہ دیا کہ پروگرام اب نشر ہو ہی چکا ہے اس لئے خاموشی ہی بہتر ہے۔ میں نے ۵ دسمبر کو سیکرٹری اطلاعات (وزیر) ڈاکٹر محمد بن عبد اللہ کو احتجاجی مراسلہ لکھا اور اس کی نقول حکومت کے ڈپٹی سیکرٹری (وزیر مملکت) ڈاکٹر محمد ابن چمباس اور ٹی وی ایکٹنگ ڈائریکٹر جنرل کو بھی بھیج دی۔ ایک نقل وزارت اطلاعات کے آپریشنل اسسٹنٹ کو بھی بھیجی۔

دس روز بعد گھانا براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے ایکٹنگ ڈائریکٹر جنرل کی جانب سے ۱۴ دسمبر کا تحریر کردہ خط موصول ہوا۔ جس میں انہوں نے میرے موقف سے اتفاق کیا اور تمام مسلمان سے معذرت کی تھی اور یہ بھی یقین دلایا تھا کہ آئندہ ایسے پروگرام نشر کرنے پر مکمل پابندی لگا دی گئی ہے۔ پھر بیس دسمبر کو ڈاکٹر محمد بن عبد اللہ نے بھی تقریباً اسی قسم کی یقین دہانی کرائی۔

گھانا میں میرے قیام کے دوران یہی چند ناخوشگوار واقعات تھے جن کی طرف حکومت کی توجہ دلانا مقصود ہے۔ ہمارا ایکسٹرنل پبلسٹی ونگ بیحد کمزور ہے۔ مغربی افریقہ کے ذرائع ابلاغ سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ نہ ہی خبروں کے ایکسچینج کے لئے کوئی معاہدہ ہے۔ ہمارے ہاں سے جرنلسٹ اس علاقے میں نہیں جاتے۔ نہ ہی ہم وہاں سے کسی کو بلاتے ہیں ہمارے ہاں سے کوئی ایسا لٹریچر بھی ان ممالک میں نہیں بھیجا جاتا جس سے ان لوگوں کو ہمارے بارے میں علم ہو سکے ہمارا رابطہ ان ممالک سے صرف اتنا ہے کہ عید شبرات' نئے سال کی آمد یا ان کے آزادی کے ایام پر تہنیتی کارڈ بھجوا دیئے جائیں اور بس۔

ہمارے سفارت خانے بلا استثنا اس الزام کی تردید نہیں کر سکتے کہ انہوں نے

اپنے دائرہ کار میں پاکستان کیوں اور کیسے کا تعارف کرانے کی زحمت نہیں کی ہے بے توجہی اور لاپرواہی کی مثالیں تو کافی ہیں۔ لیکن یہ دیکھئے کہ ہمارے دفتر خارجہ کو بخوبی علم ہے کہ گھانا کی سرکاری زبان انگریزی ہے لیکن وہ یہ اطلاع ابھی تک بیرون ملک پبلسٹی ونگ کو نہیں دے سکا۔ میرے پیشرو کے زمانے میں پاکستان کے یوم آزادی کے موقع پر ایک ویڈیو ٹیپ بھیجی گئی تاکہ ۱۴ اگست کو گھانا ٹی وی سے یہ نشر ہو سکے۔ انہوں نے یہ کیسٹ گھانا براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو بھیج دی۔ لیکن کارپوریشن اسے اپنے پروگرام میں شامل نہ کر سکی۔ انہوں نے وجہ دریافت کی تو پتہ چلا کہ وڈیو ٹیپ فرانسیسی زبان میں ہے اس لئے نشر نہیں کی جا سکی۔ میرے پیشرو محمد راول دریامانی نے اس بارے میں اسلام آباد کو اطلاع دی اور احتجاج بھی کیا لیکن یہاں تو ایسے مراسلات پڑھے ہی نہیں جاتے میرے قیام کے دوران بھی جو وڈیو ٹیپ اسلام آباد سے بھیجی گئی تھی وہ بھی فرانسیسی زبان میں تھی۔ میں نے گھانا براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو دینے کی بجائے وزارت خارجہ کو واپس بھجوا دی کہ وہ کسی اور ملک میں استعمال کر سکیں۔ اور کیسٹ ضائع نہ ہو۔

مغربی افریقہ کے ممالک میں بھارتی نژاد لوگ کافی ہیں اردو وہ پڑھ نہیں سکتے لیکن اردو فلموں کے بہت شیدائی ہیں پاکستان ڈراموں کے شوقین ہیں ہمارے ہاں کے موسیقی کے پروگرام بالخصوص غزلوں پر مشتمل پروگرام وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان سے جاتے ہوئے میں ایکسٹرنل پبلسٹی ونگ والوں سے چند پاکستانی فلموں اور ٹی وی ڈراموں کی وڈیو کیسٹ لے گیا تھا ذاتی طور پر میں نے جدہ سے بھی موسیقی کی چند وڈیو کیسٹ خرید لی تھیں۔ پورے مغربی افریقہ کے ریجن میں کوئی ہی بھارتی یا پاکستانی ہو گا جس نے یہ تمام وڈیو پروگرام نہ دیکھے ہوں اس ریجن میں دیگر زبانوں میں بھی وڈیو کیسٹ دستیاب ہوتی ہیں۔ لیکن انہیں انگریزی میں ڈب کیا جاتا ہے۔ میرے خطوط اور یاد دہانیوں کے باوجود اس طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی اور نہ ہی پاکستانی فلم سازوں

نے اس طرف کوئی توجہ دی ہے نہ ہی وزارت خارجہ و وزارت اطلاعات نے ان کی اس بارے میں حوصلہ افزائی کی ہے۔ معلوم نہیں ہم کب اپنی ترجیحات کا درست تعین کریں گے۔ کر سکیں گے یا نہیں۔

وہ بھی تو اپنے بھائی بند ہی ہیں۔

براعظم افریقہ کے تمام ممالک میں سے لائبیریا وہ واحد ملک ہے جس نے غلامی کا مزا نہیں چکھا اور یہاں کے باشندے اس تاریخی حقیقت پر فخر کرتے ہیں۔ مغربی افریقہ کے سب ریجن میں یہ سیرالیون اور آیوری کوسٹ کے درمیان چھوٹا سا ملک ہے جہاں اٹھارویں صدی کے آخری عشرے میں امریکہ سے مفرور ہونے والے افریقی نژاد کالے غلام آباد ہونا شروع ہوئے۔ یہ وہ غلام تھے۔ جنہیں امریکی آبادکاروں نے افریقہ سے ہی بحری قزاقوں اور تاجروں کے ذریعے درآمد کیا تھا۔ ظلم و تشدد سے تنگ آکر ان میں سے جو بھاگ نکلے اور اٹلانٹک عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے برطانوی ساحل کا رخ کیا۔ ایک برطانوی قانون کے تحت جو غلام برطانوی ساحل پر اتر جاتے اسے آزاد گنا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ مفرور غلام قانونی طور پر آزاد شمار ہوئے۔ برطانوی حکومت کے لئے ان نوآزاد لوگوں کی آبادکاری ایک مسئلہ تھا۔ جلد ہی ان کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ انہیں افریقہ بھیجا جائے کہ برطانوی سوسائٹی ان کے لئے مناسب مقام کا تعین نہ کر سکے گی۔ انہیں جہازوں میں لاد کر افریقہ کے مغربی ساحل کی جانب روانہ کیا گیا۔ اس وقت اس ساحل پر صرف چھوٹی سی پٹی سیرالیون اور آیوری کوسٹ کے درمیان خالی تھی۔ چنانچہ سہولت اور آسانی کے پیش نظر برطانوی اہلکاروں نے اس خالی پٹی پر نوآزاد غلاموں کو اتار دیا۔ ان کے ساتھ پادری بھی تشریف لائے' ابتدائی ۱۶۶ لوگوں میں سے بیشتر افریقہ کی بیماریوں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گئے۔ صرف ۳۰ کے قریب لوگ' بچے' پادری حضرات کا بھی ایسا ہی حشر ہوا۔ لیکن اس نوآبادی کی

آبادی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ یہ نوآبادی ہر لحاظ سے آزاد تھی۔ اس کے ایک جانب آیوری کوسٹ اس وقت فرانسیسی نوآبادیات کا حصہ تھا۔ دوسری جانب سیرالیون برطانوی کالونی تھا۔ درمیان میں یہ آزاد نوآبادی دونوں استعماری طاقتوں کے لئے خلش کا باعث تھی۔ ابتدا میں تو دونوں ممالک نے اس پر اپنا حق نہ جتلایا۔ لیکن اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ افریقہ کا یہ حصہ بھی غلاموں کی تجارت کے لئے مناسب نظر آیا تو دونوں کی رال ٹپک پڑی۔ ہوا یوں کہ نوآبادکاروں نے قدیم افریقی باشندوں کی برآمد کا نفع بخش کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ اس سے فرانس اور برطانیہ کی برآمدی تجارت پر برا اثر پڑتا تھا۔ انفرادی طور پر دونوں ممالک اب اس نوآبادی پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ جس کی بھنک آبادکاروں کے کانوں میں پڑی۔ یہ بہت نازک وقت تھا۔ خدشہ یہ تھا کہ امریکی غلامی کے بعد اب یہ لوگ برطانیہ یا فرانس کے غلام بن جائیں گے۔ ان نوآزاد امریکی غلاموں نے ممکنہ حملے کا سدباب یوں کیا کہ ۲۶ جولائی ۱۸۴۷ء کو آزادی کا اعلان کر دیا۔ راتوں رات دستور بھی بن گیا۔ جو امریکی دستور کی مناسب ترامیم کے ساتھ نقل تھا۔ جھنڈا بھی لہرا دیا گیا۔ جو امریکی جھنڈے کی نقل تھا۔ البتہ فرق یوں نمایاں کیا گیا تھا کہ امریکی جھنڈا اٹھا کر اس کے اوپر والے بائیں کونے میں ایک ستارہ لگا دیا گیا۔ امریکہ نے فوری طور پر لائبیریا کو تسلیم کر لیا اور یوں یہ ملک دنیا کے نقشے پر ۱۸۴۷ء سے چلا آ رہا ہے۔ پچیس تیس لاکھ آبادی والے اس ملک میں ۱۹۸۰ء تک جمہوریت کا دور دورہ رہا۔

اس سال ۱۲ اپریل کو ماسٹر سارجنٹ سیموئل کے ڈو نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس نے ۲۵ اپریل کو مارشل لاء نافذ کرتے ہوئے دستور منسوخ کر دیا۔ نیا دستور ۱۹۸۱ء میں مرتب کر کے نئی جمہوریت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ مجوزہ دستور کی منظوری صدر سیموئل کے ڈو نے ریفرنڈم کے ذریعے حاصل کی اور پھر ۱۹۸۵ء میں اس نے انتخابات منعقد کرائے جس کے نتیجے کے طور پر وہ خود صدر منتخب ہو گیا اور لائبیریا جمہوریت کی راہ پر دوبارہ چل پڑا۔ لیکن بعد میں ایسے معاملات درپیش آئے کہ ملک خانہ جنگی کی

نذر ہو گیا۔ جو آج بھی جاری ہے۔ سیموئل کے ڈو کی حکومت کو ایک فوجی انقلاب کے ذریعے الٹ دیا گیا ہے۔ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو فائرنگ سکواڈ کا سامنا کرنا پڑا اور وہ قتل کر دیئے گئے۔

لائبیریا کے ذرا شمال میں سیرالیون اس کا ہمسایہ ہے۔ یہ ابتدا میں برطانوی کالونی تھا۔ اس ملک کو دریافت کرنے کا سہرا برطانوی نژاد بحری قزاق جان ہاکنز کے سر جاتا ہے۔ جس نے ۱۵۶۴ء میں افریقہ کے مغربی ساحل پر اس ملک کو اپنے غلاموں کی تجارت کا اڈہ بنا لیا۔ آہستہ آہستہ ساحلی پٹی سے برطانوی اقتدار اندرون ملک پھیل گیا اور تقریباً ۳۵ لاکھ افراد پر مشتمل یہ ملک مکمل طور پر برطانوی سلطنت میں داخل ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ سلطنت برطانیہ کا تانا بانا بکھر رہا تھا۔ ۱۹۴۵ء کے بعد ایک عالمگیر پالیسی کے تحت سیرالیون کو بھی سیلف گورنمنٹ کا راستہ دکھایا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں دستور ترتیب دیا گیا۔ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات ہوئے تو ڈاکٹر سر ملٹن مارگئی کی سیرالیون پیپلز پارٹی برسراقتدار آ گئی۔ وہ پہلے تو چیف منسٹر تھے بعد میں ۱۹۵۸ء میں پرائم منسٹر بنا دیئے گئے۔ ۲۷ اپریل ۱۹۶۱ء کو سیرالیون کو آزادی مل گئی اور اس نے کامن ویلتھ کا ممبر رہنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے انتخابات میں جو مئی ۱۹۶۲ء میں منعقد ہوئے ڈاکٹر سر ملٹن مارگئی پھر برسراقتدار آ گئے وہ اپریل ۱۹۶۴ء میں فوت ہوئے تو ان کے سوتیلے بھائی ڈاکٹر سر البرٹ مارگئی نے عنان حکومت سنبھال لی۔ ۱۹۶۷ء میں ملک میں عام انتخابات ہوئے تو انہیں متنازعہ قرار دیتے ہوئے فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ فوج نے بریگیڈیئر اینڈریو جیکسان سمتھ ANDREW JUXON SMITH BRIGADIER کی سربراہی میں گورنر جنرل کو بھی ملک بدر کر دیا۔ لیکن یہ فوجی حکومت ایک سال ہی نکال سکی۔ خود فوج کے اندر ایک انقلاب آیا اور اپریل ۱۹۶۹ء میں ملک میں سول حکومت کو بحال کر دیا گیا۔ اس کا سربراہ ۱۹۶۷ء میں منتخب ہونے والے سیاکا سٹونیز کو بنایا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں عام انتخابات میں انہوں نے صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے حکومت بنائی تھی۔ انقلاب برپا ہوا تو وہ پڑوس کے ملک گنی

میں پناہ گیر ہوئے ان کی پارٹی کا نام آل پیپلز کانگرس تھا۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں دستور میں ترمیم کی گئی' سیرالیون کو ری پبلک قرار دیا گیا اور سیاکا سٹیونیز اس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ حکومت نے ۱۹۷۲ء میں نئے دستور کے تحت عام انتخابات کا اعلان کیا تو سیرالیون پیپلز پارٹی نے انتخابات میں حصہ نہ لیا کیونکہ اس کے ایک درجن نامزد امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے گئے تھے۔ انتخابات ہوئے اور آل پیپلز کانگرس تمام نشستوں پر قابض ہو گئی۔ ۱۹۷۶ء میں صدر سیاکا سٹیونز کو دوبارہ پانچ سال کی مدت کے لئے صدر منتخب کیا گیا۔ مئی ۱۹۷۷ء میں عام انتخابات ہوئے تو آل پیپلز کانگرس نے پھر اکثریت حاصل کر لی۔ اس دفعہ انتخابات کے دوران وسیع پیمانے پر فسادات ہوئے۔ دھاندلی اور تشدد کے واقعات بھی ہوئے۔ لیکن آل پیپلز کانگرس نے اپنی بے تحاشہ اکثریت کے پیش نظر ان الزامات کی کوئی پرواہ نہ کی اور پارلیمنٹ نے ایک بل کے ذریعے ملک میں ایک پارٹی کے نظام کی منظوری دیدی۔ اس کے ساتھ ہی سیرالیون پیپلز پارٹی کو سیاست سے باہر نکال دیا گیا۔ ایک پارٹی نظام کے نفاذ کیلئے ایک نیا دستور وضع کیا گیا۔ ۱۴ جون ۱۹۷۸ء کو صدر بنا کا سٹیونز کو سات سال کے لئے صدر منتخب کیا گیا۔ یہ مقصد حل کرنے کے بعد صدر سیاکا سٹیونز نے سیرالیون پیپلز پارٹی کے ارکان کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس کے اہم ارکان کو اہم حکومتی عہدوں پر فائز کر دیا۔ ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی۔ بے کاری۔ رشوت ستانی کے نتیجے میں عوام کی تکالیف میں اضافہ ہوا۔ تو لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا۔ ان حالات میں مئی ۱۹۸۲ء میں عام انتخابات کرائے گئے۔ اب پھر انتخابات میں وسیع پیمانے پر تشدد کے واقعات ہوئے۔ رشوت اور دھاندلی نے انتخابات کا جلسہ بگاڑ دیا۔ صدارتی انتخابات ۱۹۸۵ء میں ہوئے تو صدر سیاکا سٹونیز نے اس وقت ۸۰ سال کے ہو چکے تھے۔ میجر جنرل جوزف سیدو موموح کو اپنی پارٹی کی جانب سے امیدوار نامزد کر دیا۔ جنرل جوزف ۱۹۷۱ء سے افواج کے کمانڈر انچیف کے عہدے پر فائز چلے آ رہے تھے اور ۱۹۷۸ء سے وزارت دفاع کا عہدہ بھی اس کے پاس تھا۔ انہیں ۹۰ % ووٹ

ملے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ صدارت کے لئے واحد امیدوار تھے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۸۶ء سے وہی صدر چلے آ رہے ہیں۔ (۱۹۹۲ء میں ایک فوجی انقلاب کے نتیجے میں وہ معزول کر دیئے گئے۔ اور وہ ملک سے فرار ہو گئے۔ اب ملک میں فوجی حکومت قائم ہے۔)

عکرہ میں پاکستان مشن کے دائرہ کار میں ٹوگو بھی شامل ہے یہ ۵۰ کلومیٹر چوڑا اور ۵۴۰ کلومیٹر لمبا ملک گھانا کا مشرقی ہمسایہ ہے۔ گھانا کے ساتھ ان کا ۵۴۰ کلومیٹر بارڈر ہے۔ جبکہ ۳۵ کلومیٹر کی چوڑائی ساحلی پٹی ہے۔ ابتدا میں یہ ملک اتنا چھوٹا نہ تھا۔ ۱۹۰۲ء میں اس ملک کا نام ٹوگولینڈ تھا۔ جب جرمنی نے اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ ملک ۱۹۱۴ء تک جرمن نوآبادی تھا۔ جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست ہوئی تو یہ نوآبادی لیگ آف نیشنز کی ولایت میں دے دی گئی۔ لیگ کے مینڈیٹ کے تحت ٹوگولینڈ کو تقسیم کر کے برطانوی اور فرانسیسی علاقوں میں بانٹ دیا۔ گھانا سے ملحق مشرقی حصے کو برطانوی ٹوگو کا نام دیا گیا اور اس کے مشرق والا حصہ فرانسیسی ٹوگو کہلایا۔ برطانیہ اور فرانس اپنے اپنے علاقوں پر قابض رہے۔ تاآنکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد منقسم علاقے اقوام متحدہ کی تولیت میں چلے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ برطانوی نظام گھانا سے ملحق حصے میں مستحکم ہو گیا اور دوسرے حصے میں فرانسیسی نظام محکم ہوا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن اس مصنوعی تقسیم کے نتیجے کے طور پر ایک مکمل خودمختار قوم WE E یو۔ ای تقسیم ہو کر رہ گئی۔ سفید جلد والی استعماری قوتوں کا یہ خاصہ ہے کہ انہوں نے تاریخی اور روائتی نسلوں کو تہہ و بالا کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ قدیم تہذیب و تمدن کو بتدریج سوچی سمجھی سکیم کے تحت صفحہ ہستی سے مٹا دیا جانا ان کا مقصود ہوتا ہے۔ یو۔ ای قبیلہ افریقہ کے بیشتر ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن افریقہ کے مختلف حصوں پر قابض برطانیہ۔ فرانس۔ اٹلی۔ جرمنی۔ سپین۔ پرتگال وغیرہ نے اس عظیم براعظم کو آپس میں بانٹا تو مقامی رسم و رواج۔ تہذیب و تمدن رشتے ناطے تمام تباہ کر دیئے اور MANS BURDEN WHITE سفید فام قوتوں کی ذمہ داری کی تھیوری کے تحت ازمنہ قدیم سے یہاں

آباد باشندوں کو جدید دنیا سے روشناس کرنے کے بہانے صدیوں سے ان کا ناطہ توڑ دیا۔ یہاں یہی فارمولا اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے استعمال کیا گیا۔ ٹوگو لینڈ کو آزاد کرنے کی حامی بھر لی گئی۔ تو ٹوگولینڈ برطانوی ٹوگو اور فرانسیسی ٹوگو میں بٹا ہوا تھا۔ دونوں حصوں میں مختلف انتظامیہ کام کر رہی تھی۔ ہمسایہ ملک گولڈ کوسٹ بھی آزاد ہو رہا تھا۔ لیکن ابھی آزاد نہ ہوا تھا۔ حکومت برطانیہ آسانی سے برطانوی ٹوگو کو اپنے ہاتھ سے نہ کھونا چاہتی تھی۔ دوسرے یو ای قبیلہ کی طاقت کو تقسیم رکھنا بھی مقصود تھا۔ چنانچہ برطانوی ٹوگو میں مئی ۱۹۵۶ء میں ایک ریفرنڈم کرایا گیا۔ اور برطانوی انتظامیہ کے زیر اثر عوام سے کہا گیا کہ وہ فیصلہ کریں کہ جب ہمسایہ ملک گولڈ کوسٹ آزاد ہو تو وہ اس کے ساتھ شامل ہونا پسند کریں گے یا فرانسیسی ٹوگو میں۔ ریفرنڈم کا نتیجہ وہی ہوا۔ جو نظر آ رہا تھا۔ برطانوی کنٹرول والے ٹوگو نے فیصلہ کیا کہ جب گولڈ کوسٹ آزاد ہو تو وہ اس کا حصہ بننا پسند کریں گے۔ اگلے سال جب گولڈ کوسٹ آزاد ہوا تو اس میں برطانوی ٹوگو کو شامل کر لیا گیا۔ اب گولڈ کوسٹ اور برطانوی ٹوگو کا علاقہ گھانا کہلاتا ہے۔ فرانسیس ٹوگو ابھی آزاد نہیں تھا۔ اب اسے ٹوگو کا نام دیا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں ملک میں دو اہم سیاسی پارٹیاں تھیں۔ ٹوگو اتحاد پارٹی UNITE TOGOLAISE کا سربراہ سلوانس اولمپیو SYLVANUSOLYMPIO تھا۔ اور ٹوگو پراگریس پارٹی PARTI TOGOLAISE PROGRES کا لیڈر نکولس گرنزسکی NICOLAS GRUNITZKY تھا۔ جو اولمپیو کا برادر نسبتی تھا۔ ۱۹۵۶ء میں نکولس گرنزسکی وزیراعظم بنا۔ لیکن اقوام متحدہ کے زیراہتمام ہونے والے انتخابات میں سلوالس اولمپیو کی پارٹی کامیاب ہوئی اور وہ برسراقتدار آ گیا۔ اس کا نعرہ عظیم ٹوگولینڈ تھا۔ عوام نے ایسے ہی نکولاس گرنیزسکی کو رد نہ کیا تھا۔ ان کی نظر میں وہ فرانسیسی استعمار کا مظہر تھا۔ جس نے یو۔ ای قبیلے کی تقسیم پر مہر ثبت کر رکھی تھی۔ اولمپیو کی صورت میں انہیں ایک ایسا لیڈر مل گیا۔ جو اس قبیلے اور برطانوی و فرانسیسی ٹوگو کو اکٹھا کر سکے گا۔ اس کی وزارت عظمیٰ کے دور میں ٹوگو کو آزادی نصیب ہوئی۔ اسی

سال اولمپیو کو سات سال کے لئے بلامقابلہ ٹوگو کا صدر منتخب کیا گیا۔ اسی اثنا میں پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے تو اس کی پارٹی نے اکاون کی اکاون نشستیں جیت لیں۔ کیونکہ ایک صدارتی حکم کے تحت برسراقتدار پارٹی کے خلاف کسی دیگر پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ اس مکمل اکثریت والی پارٹی کے تحت نیشنل اسمبلی نے ایک نیا دستور مرتب کیا۔ حزب اختلاف کے رہنما ملک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ گرینلزسکی نے بھی جلاوطنی اختیار کر لی۔ ۱۳ جنوری ۱۹۶۳ء کو ایک فوجی انقلاب کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ صدر اولمپیو اور اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ فوجی حکمرانوں نے گرینلزسکی کو واپس بلایا اور اسے عبوری دور کے لئے صدر بنا دیا گیا۔ اس کی نگرانی میں ایک نیا دستور مرتب ہوا۔ جس کی منظوری ریفرنڈم کے ذریعے مئی ۱۹۶۳ء میں حاصل کی گئی۔ گرنیزسکی کو پانچ سال کے لئے صدر منتخب کر لیا گیا۔ نئی قومی اسمبلی کے لئے انتخاب بھی ہوا۔ یہ نام کے انتخابات تھے۔ حکومت کی جانب سے ایک متفقہ فہرست جاری کی گئی جس میں تمام اہم مکتبہ فکر کے نمائندے شامل تھے اور وہی قومی اسمبلی کے ممبر ٹھہرے۔ لیکن ۱۳ جنوری ۱۹۶۷ء میں اس حکومت کا تختہ بھی الٹ دیا گیا۔ دستور کو منسوخ کر دیا گیا۔ قومی اسمبلی کو برطرف کر دیا گیا۔ اس فوجی انقلاب کے سربراہ جنرل آئڈما تھے۔ متحکم ہونے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو ترقی دیدی تھی۔ ایک روایت کے مطابق گرنیزسکی کے مقابلے میں سلوانو اولمپیو کو وہی برسراقتدار لائے تھے لیکن بعد میں ان کے درمیان اختلافات رونما ہوئے۔ چنانچہ ۱۳ جنوری ۱۹۶۳ء کا انقلاب بھی جنرل آئڈما کی سربراہی میں ہی برپا ہوا۔ جس کے نتیجے کے طور پر سلوانو اولمپیو مارا گیا۔ اس مرتبہ بھی جنرل آئیڈما خود صدر نہ بنے بلکہ گرنیزسکی کو وطن واپس بلا کر اسے صدر بنا دیا تھا۔ چار سال بعد آنے والا انقلاب بھی جنرل آئڈما ہی کی سوچ و بچار کا نتیجہ تھا۔ اس دفعہ انہوں نے خود صدر کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔

کہا جاتا ہے کہ پہلے فوجی انقلاب کے موقع پر لیفٹیننٹ کرنل آئڈما کا یہ خیال تھا

کہ ملک کی صدارت ایک مشکل کام ہے اور وہ بار حکومت اٹھانے کے لئے موزوں نہیں ہیں

ٹوگو میں دوسرا انقلاب بھی انہی کی حمایت سے بروئے کار آیا تھا۔ اس مرتبہ انہوں نے اولمپیو کو قصرصدارت سے باہر نکالا اور اسے خود گولی مار دی۔ بیرون ملک سے گرنیزسکی کو بلا کر کرسی صدارت پر متمکن کر دیا اور خود صدر بننے سے اس لئے انکار کر دیا کہ انہیں اب بھی یقین تھا کہ صدارت پر ان کا حق نہیں ہے۔ وہ اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے خاطر خواہ تجربہ نہیں رکھتے۔ اب جو تیسری مرتبہ وہ انقلاب لائے تو ان کے حمائتیوں نے ان کے سابق رویئے کے مطابق ایک ریٹائرڈ سیاسی لیڈر کو صدارت کے لئے تجویز کیا اس پر کرنل آئڈما بھڑک اٹھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ دوسرے لوگوں کو صدر بناتے بناتے تھک گئے ہیں۔ اب وہ آرام کرنا چاہتے ہیں اور صدارت کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے صدارت کا عہدہ خود سنبھال لیا۔ وہ صاحب جو انقلابی کونسل میں صدر کے طور پر بیٹھے تھے۔ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ صدر جنرل آئڈما کی حکومت کے خلاف سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔ عوام میں وہ ہردلعزیز ہیں۔ سابق صدر اولمپیو کے اہل خاندان ٹوگو سے فرار ہو کر گھانا میں پناہ گزین ہیں۔ ہر مرتبہ جب ٹوگو میں کوئی سازش بے نقاب ہوتی ہے اس کا الزام گھانا کی حکومت پر لگایا جاتا ہے۔

یہ امر باعث دلچسپی ہو گا کہ ۱۳ جنوری ۱۹۶۳ء کو برپا ہونے والا فوجی انقلاب براعظم افریقہ میں ہونے والے تمام فوجی انقلابات کا پیشرو ثابت ہوا تھا۔ یہ پہلا فوجی انقلاب تھا۔ جس کے ذریعے ایک سول حکومت کو برطرف کیا گیا تھا۔ بعد میں دوسرے افریقی ملکوں نے اس کی پیروی کی۔

گھانا اور ٹوگو کے درمیان تعلقات کبھی بھی خوشگوار نہیں رہے۔ یہ ناخوشگوار ہوتے ہیں' یا تلخ۔ ہوا یوں کہ ۱۹۷۹ء کے وسط میں گھانا میں فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں انہوں نے عام انتخابات منعقد کرائے اور

حکومت منتخب نمائندوں کے حوالے کر دی اور خود علیحدہ ہو گئے۔ لیکن سول حکومت نے ان کے انداز فکر کو اپنے لئے مستقل خطرہ جانا۔ انہوں نے انہیں پاکستان بھجوا دیا تاکہ کوئٹہ میں ہمارے ڈیفنس کالج میں ۹ ماہ کے کورس میں حصہ لے سکیں۔ اب ہوا یہ کہ فلائٹ لیفٹیننٹ جیری جے رالنگ پاکستان آئے کوئٹہ پہنچے۔ لیکن کورس شروع ہو چکا تھا۔ کالج کے کارپردازان نے انہیں کالج میں گھسنے نہ دیا۔ وہ کوئٹہ اور کراچی کے درمیان گھومتے رہے۔ بالاخر وہ کرنل قذافی کی دعوت پر لیبیا چلے گئے۔ چند روز قیام کے بعد وہ گھانا کے لئے روانہ ہوئے۔ ہوائی جہاز راستے میں ٹوگو کے ہوائی اڈے لومے پر اترا تو صدر آئڈما کے حکم پر انہیں جہاز سے اتار لیا گیا۔ لومے میں وہ حکومت کے زیر حراست تھے۔ جنرل آئڈما نے گھانا کے صدر ہل لیمان LIMANN HILL سے رابطہ کیا اور چاہا کہ وہ جیری جے رالنگ کو زیر حراست گھانا بھیج دے۔ لیکن صدر ہل لیمان نے جنرل آئڈما کو جیری جے رالنگ کو آزاد کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس واقعے نے جیری جے رالنگ اور جنرل آئڈما کے درمیان ایک ایسی ذاتی کشمکش کو جنم دیا۔ جس کے اثرات دونوں ہمسایہ ممالک کے تعلقات پر دائمی ہیں۔ تلخی کی اول وجہ ۱۹۵۶ء کا وہ ریفرنڈم ہے۔ جو برطانوی سازشوں کا شاہکار ہے جس کے نتیجے کے طور پر ٹوگولینڈ کے برطانوی حصے نے گولڈ کوسٹ میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا۔ اور ایک قوم مستقل طور پر بٹ کر رہ گئی ہے۔

ٹوگو کے عین شمال میں برکینافاسو واقع ہے۔ یہ ملک دو دفعہ معرض وجود میں آیا۔ ۵ اگست ۱۹۶۰ء میں آزاد ہونے والا یہ چھوٹا سا ملک مغربی افریقہ کا غریب ترین ملک ہے۔ ماریس یامنگو MAURICE YAMENGO اس کا پہلا صدر تھا۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں فوجی انقلاب نے اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اس انقلاب کا سربراہ کرنل منگولی لیمیزانا تھا۔ جو برکینا فاسو کی افواج کا سربراہ تھا۔ اب اس نے صدر مملکت اوز وزیراعظم کے عہدے یکجا کر لئے پھر جنرل بھی بن گیا۔ اس نے قومی اسمبلی کو برطرف کر دیا۔ آئین کو معطل کر دیا۔ سیاسی سرگرمیاں بند کر دی گئیں۔ نیا دستور ۱۹ ستمبر

۱۹۷۰ء میں ترتیب دیا گیا۔ بعد میں انتخابات کرائے گئے۔ جن میں جیرارڈ اوڈراگو GENERAL OUEDRAOGO کی پارٹی کامیاب ہوئی۔ اسے وزیراعظم نامزد کر دیا گیا۔ فروری ۱۹۷۱ء میں اس کی قیادت میں مخلوط حکومت قائم ہوئی جس میں سول اور فوج سے وزرا نامزد کئے گئے۔ ایک نیا دستور نافذ کیا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں حکومت اور قومی اسمبلی کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے فروری ۱۹۷۴ء میں صدر نے اعلان کیا کہ فوج نے اقتدار سنبھال لیا ہے۔ ایک صدارتی حکم کے تحت وزیراعظم کو برطرف کر دیا گیا اور قومی اسمبلی توڑ دی گئی۔ اس اسمبلی کہ جگہ ایک مجلس شوریٰ CONSULTATIVE نے لے لی۔ جس کے تمام ممبر صدر نے نامزد کئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں مجلس شوریٰ نے ایک نئے دستور کو جنم دیا۔ جو نومبر میں نافذ کیا گیا۔ سیاسی پارٹیوں اور سرگرمیوں سے پابندی اٹھا لی گئی۔ جس کے تحت نئی نیشنل اسمبلی کے لئے نومبر ۱۹۷۸ء میں انتخابات منعقد ہوئے۔ ان انتخابات میں صدر جنرل لانیزانا کی پارٹی کامیاب ہوئی۔ چنانچہ پھر وہ دوبارہ صدر منتخب ہوئے۔ اسمبلی کے اندر سات سیاسی پارٹیوں کا اتحاد قائم ہوا۔ صدر جنرل لانیزانا نے اتحاد کے لیڈر ڈاکٹر جوزف کونومبو DR. JOSEPH CONOMBO کو وزیراعظم نامزد کیا۔ اس نے مخلوط حکومت میں تمام سیاسی پارٹیوں کو جگہ دی لیکن یہ اتحاد فیل ہو گیا۔ ملک کی اقتصاری صورت حال بگڑتی جا رہی تھی۔ ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء کے دوران ملک میں بے چینی اور بدامنی کا راج تھا۔ صدر لانیزانا کی حکومت ناکام ہوئی نومبر ۱۹۸۰ء میں فوج نے کرنل سائی زربو SAYE ZERBO کی قیادت میں اسکی حکومت کو معزول کر دیا۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں کرنل سائی زربو کی سربراہی میں خالص فوجی حکومت قائم کی گئی اب پھر دستور کو معطل کر دیا گیا اور نیشنل اسمبلی کو بھی ختم کر دیا گیا۔ کرنل زربو کی حکومت بھی نومبر ۱۹۸۲ء میں معزول ہوئی۔ یہ انقلاب فوج کے جونیئر افسروں نے برپا کیا تھا۔ نئی فوجی حکومت میں MAJOR JEAN - BAPTIST کو انقلاب کے رہنما کے طور پر شناخت کیا گیا۔ اس نے حکومت کرنے کے لئے ایک کونسل کی تشکیل کی۔ اس نے

کیپٹن ٹامس سنکارا کو وزیر اعظم نامزد کر دیا۔ اور خود فوج کو بیرکوں میں واپس لے گیا۔ جلد ہی ملک میں ایک اور انقلابی قدم اٹھایا گیا۔ فوجی ایکشن کے ذریعے جوابی انقلاب لایا گیا اور حکومت اور اسکے اداروں میں سے چن چن کر لیفٹ کے حامی لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ وزیر اعظم کیپٹن ٹامس سنکارا کو بھی معزول کر کے۔ جیل میں ڈال دیا گیا۔ لیکن جلد ہی میجر جین بیپٹسٹ نے حالات پر قابو پا لیا۔ اس نے کیپٹن کمپاری کی مدد سے کیپٹن ٹامس سنکارا کو جیل سے رہا کر دیا۔ کیپٹن سنکارا نے اگست ۱۹۸۳ء میں اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ حکومت نے مخالف لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ اہم شہروں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ اس انقلاب کے نتیجے کے طور پر میجر جین بیپٹسٹ کیپٹن کمپاری اور کیپٹن سنکارا برسر اقتدار آ گئے۔ اب رولنگ کونسل کی سربراہی کیپٹن سنکارا کے پاس تھی۔ اس نے ملک کا نام اپر وولٹا سے برکینا فاسو میں تبدیل کر دیا۔ جھنڈا بھی نیا بنایا گیا۔ کیپٹن سنکارا کی حکومت کا تختہ کیپٹن کمپاری نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو الٹ دیا۔ جس میں کیپٹن سنکارا اور تقریباً دو سو ساتھی مارے گئے۔

برکینا فاسو گھانا سے زیادہ دور تو نہیں ہے لیکن براہ راست سڑک اس قابل نہیں کہ اس سے سفر کیا جا سکے۔ براہ راست کوئی پرواز گھانا سے برکینا فاسو بھی نہیں جاتی۔ چنانچہ برکینا فاسو جانے کے لئے پہلے آدمی آیوری کوسٹ پہنچے اور وہاں سے ایر برکینا یا ایرایوار سے سفر کرے۔ دوسرا روٹ براستہ ٹوگو ہے۔

براعظم افریقہ میں آزادی کی لہر چلی تو سب سے پہلے گھانا ہی آزاد ہوا۔ آزادی سے پہلے اس کا نام گولڈ کوسٹ تھا۔ اس وقت کوامے نکرومہ ملک کا وزیر اعظم تھا۔ موجودہ گھانا میں وہ علاقہ جو گولڈ کوسٹ کہلاتا تھا۔ اور وہ علاقہ جو برطانوی ٹوگو کہلاتا تھا شامل ہیں۔ کوامے نکرومہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک برسر اقتدار رہے۔ اول دور میں وہ وزیر اعظم تھے۔ بعد میں گھانا کو ری پبلک بنا دیا گیا۔ تو وہ اسکے صدر بھی بن گئے۔ ۲۴ فروری ۱۹۶۶ کو انکا دور حکومت ختم ہوا۔ وہ اس وقت چین کے دورے پر تھے۔ کہ جنرل جوزف انکراہ GEN. JOSEPH ANKARAH نے فوج اور پولیس کی مدد

سے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اپریل ۱۹۶۹ء میں جنرل انکراہ کی جگہ جنرل اکواسی افریفا GENERAL AKWASI AFRIFA برسر اقتدار آگئے۔ انکی سربراہی میں ایک نیا دستور بنایا گیا۔ جسکے تحت نئی قومی اسمبلی کے لئے اگست ۱۹۶۹ء میں انتخابات ہوئے اسمبلی کی ۱۴۰ نشستوں میں سے ۱۰۵ پروگریس پارٹی کے حصے میں آئیں۔ اسکے سربراہ کوفی بسیا KOFI BUSIA کو وزیر اعظم نامزد کیا گیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء کو اسنے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ ۳۱ اگست ۱۹۷۰ء کو ایک سویلین صدر ایڈورڈ اکوفو آڈو EDWARD AKUFO ADDO نے عہدۂ صدارت کا حلف اٹھایا لیکن یہ سویلین حکومت زیادہ دیر نہ چل سکی۔ فوج نے جنوری ۱۹۷۲ء میں اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ دستور منسوخ کر دیا گیا۔ منتخب ادارے ختم کر دیئے گئے اور کرنل اچیمپونگ IGONOTIUS ACHEAMPONG نے حکومت سنبھال لی۔ ۱۹۷۶ء میں اچیمپونگ نے جو اب جنرل بن چکے تھے۔ سویلین حکومت کا فارمولا دیا۔ جس میں فوج کو بھی اپنا مخصوص کردار ادا کرنے کی گنجائش رکھی گئی۔ مارچ ۱۹۷۸ء میں اس تجویز پر ریفرنڈم ہوا۔ جس میں اس تجویز کے حق میں ۵۴ فیصد ووٹ ڈالے گئے۔ جنرل اچیمپونگ نے اعلان کیا کہ ملک میں عام انتخابات جولائی ۱۹۷۹ء میں منعقد ہوں گے۔ لیکن اس سے پہلے ہی جولائی ۱۹۷۸ء میں جنرل فریڈرک اکوفو AKUFFO GEN. FREDERIK نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اس نے اقتدار سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ انتخابات جولائی ۱۹۷۹ء میں ہی ہونگے اور ملک سویلین حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس نے سیاسی سرگرمیوں اور پارٹیوں پر سے پابندی ہٹا لی۔ گو گھانا اب عام انتخابات کے لئے تیار تھا۔ لیکن انتخابات سے پندرہ روز پہلے فلائٹ لیفٹننٹ جیری جے رالنگ کی سربراہی میں جنرل فریڈرک اکوفو کی حکومت کو ختم کر دیا گیا۔ نئی حکومت نے احتساب کا عمل شروع کیا۔ لیکن انتخابات کو ملتوی نہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ احتساب کا عمل بھی چلتا رہا۔ انقلابی عدالت REVOTIONARY COURT میں اچیمپونگ۔ اکوفو۔ افریفا اور چھ دیگر افسران پر مقدمہ چلا اور ان پر کرپشن کے

الزامات ثابت ہو گئے۔ انقلابی عدالت نے ان کے لئے موت کی سزا تجویز کی اور راتوں رات اس سزا پر عمل بھی ہو گیا۔ انتخابات وقت مقررہ پر ہوئے۔ ان انتخابات میں پیپلز نیشنل پارٹی P N P کو اکثریت حاصل ہوئی اور اس کے سربراہ ڈاکٹر ہل لیمین DR. HILL LIMANN کو حکومت سونپ دی گئی۔ اس نے ۲۴ ستمبر ۱۹۷۹ء کو اپنے عہدے کا حلف اٹھا۔ ان کے تحت ایک سویلین مخلوط حکومت بنائی گئی۔

لیکن جلد ہی اتحادی جماعت یونائیٹڈ نیشنل کنونشن CONVENTION UNITED NATIONAL نے حکومت کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب صدر ہل لیمن کی پارٹی کو صرف ایک ووٹ کی اکثریت باقی رہ گئی۔ اپوزیشن کی تین دوسری پارٹیوں نے اتحاد کر لیا اور اتحاد کو آل پیپلز پارٹی کا نام دیا گیا۔ ملک میں صورت حال دگرگوں ہوتی گئی۔ پارلیمنٹ کام کرنے کے قابل نہ رہی اور سول حکومت ناکام ہو گئی۔ دسمبر ۱۹۸۱ء کی آخری شب کو فلائٹ لیفٹننٹ جیری جے رالنگ نے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے پھر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ کونسل آف سٹیٹ منسٹرز کو برطرف کر دیا گیا۔ دستور معطل ہو گیا' پارلیمنٹ ختم کر دی گئی۔ سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ لوکل کونسلوں کو بھی مارچ ۱۹۸۲ء میں ختم کر دیا گیا۔ اور ان کی جگہ DEFENCE REVOLUTION COUNCIL FOR انقلاب کی دفاعی کونسلوں نے لے لی۔ عام انتخابات کے لئے ۱۹۸۵ء کا سال مقرر کیا گیا۔ لیکن انتخابات نہ ہو سکے اور ابھی بھی معلوم نہیں کہ کب ہوں۔ اس دوران لوکل کونسلوں کے لئے انتخابات البتہ ہو چکے ہیں۔

ہر ملکے را ہر رسمے

گھانا کے صدر مقام عکرہ ACCRA سے بذریعہ سڑک ٹوگو کے صدر مقام لومے LOME جانے کے لئے تمام کا تمام سفر گھانا میں ہی طے کرنا ہوتا ہے۔ گھانا کی جانب سے چیک پوسٹ سے گزریں تو پہلا قدم ہی لومے میں پڑتا ہے۔ یعنی ٹوگو کی چیک پوسٹ عین لومے میں واقع ہے۔ یہاں بارڈر پر صرف غیرملکیوں کو ہی پاسپورٹ اور ویزا دکھانا پڑتا ہے۔ افریقی باشندے اس پابندی سے مستثنا ہیں۔ گھانا کی جانب سے ٹوگو جانے والے افریقی ایک لمبی قطار میں لگ جاتے ہیں۔ ٹوگو کی چیک پوسٹ پر انہیں صرف اپنا نام پتہ درج کرانا ہوتا ہے۔ اسی طرح ٹوگو کی جانب سے گھانا میں داخل ہونے والے افریقی شہری صرف نام پتہ لکھوا کر سرحد عبور کر جاتے ہیں۔

آرگنائزیشن آف افریقن یونٹی OF AFRICAN UNITY ORGANISATION کے ایک فیصلے کے مطابق تمام افریقی اگرچہ مختلف ممالک میں بٹے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک ہی قوم ہیں اور براعظم افریقہ پر تمام افریقیوں کا حق ہے۔ اس لئے اندرون افریقہ سفر کرتے ہوئے انہیں پاسپورٹ یا ویزے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں البتہ اس طرح سفر کرنے والوں کے پاس ان کے افریقی ہونے کا کوئی دستاویزی ثبوت ہونا ضروری ہے۔ گھانا اور ٹوگو کے درمیان سفر کرنے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے۔ جو روزگار' مزدوری اور رزق کی تلاش میں سرحد عبور کرتے ہیں۔ ان میں بعض تو ہمسایہ ملک میں باقاعدہ ملازمت بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ روزمرہ کا معاملہ ہے اور ورک پرمٹ کے حصول کی پابندی نہ ہونے کی وجہ

سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ گھانا میں تعلیم مفت ہے۔ جبکہ ٹوگو میں ایسا نہیں ہے۔ چنانچہ یہ منظر بھی عام ہے کہ ٹوگو کے شہری بچے صبح سرحد عبور کر کے گھانا کی سرحد کے اندر واقع کسی سکول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور شام کو واپس ٹوگو چلے جاتے ہیں۔ چونکہ سکول میں انگریزی اور فرانسیسی لازمی مضامین ہیں اس لئے گھانا کے سکولوں میں ٹوگو کے طلباء کو تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ سرحد کے دونوں طرف ایک ہی قبیلے کے لوگ بستے ہیں۔ اکثر اوقات وہ آپس میں نزدیکی رشتہ دار بھی ہوتے ہیں۔ وسیع تر خاندانی رابطوں کے تصور پر شدت سے عمل کیا جاتا ہے۔ EXTENDED FAMILY کی اس تھیوری پر پورے افریقہ میں عمل ہوتا ہے۔ اگر ایک افریقی کو رزق میسر آ جائے تو یہ اس کا فرض بن جاتا ہے کہ وہ اپنے تمام عزیز و اقارب کو اس میں حصہ دار بنائے۔ اس طرح اس کے عزیز و اقارب دوستوں اور جاننے والوں کا حق ہے کہ وہ اس کے رزق میں سے اپنا حصہ وصول کریں اس تھیوری میں چوں و چراں کی گنجائش نہیں ہے اور رزق کمانے والا اگرچہ خود غربت میں مبتلا رہے لیکن وہ اس رسم پر سختی سے عمل کرتا ہے۔ اسی طرح جہیز کی رسم پر بھی سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو بچپن ہی سے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ انہیں اپنے لئے جہیز خود تیار کرنا ہے والدین بھی لڑکی کے لئے جہیز تیار کرتے ہیں۔ لیکن پورا جہیز تیار کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا ہر لڑکی اپنا جہیز خود کماتی ہے۔ روز افزوں مہنگائی کے پیش نظر خاطر خواہ جہیز تک پہنچنے کا فاصلہ اگرچہ دور ہوتا جا رہا ہے لیکن شادی بیاہ کے معاملے میں ملوث تمام فریقین جہیز کے بغیر شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس قبیح رسم کو نبھانے کا ایک واضح اثر یہ ہے کہ ابتدا میں لڑکی اپنے جہیز کے لئے محنت' مزدوری' ملازمت اختیار کرتی ہے۔ شادی کے بعد اپنے خاوند کا بوجھ بھی اٹھاتی ہے اور پھر بچوں کی پرورش بھی اسی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ خاوند برسر روزگار ہے۔ یا بیکار ہے کنبے کی پرورش عورت ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اب البتہ تعلیم یافتہ طبقے میں یہ رواج بتدریج ختم ہو رہا ہے۔

لیکن نچلا طبقہ اس رواج میں مکمل طور پر جکڑا ہوا ہے۔ خاوند کی آمدنی پر انحصار نہ کرنے کی رسم پرانی ہے۔ غلامی کے زمانے میں براعظم افریقہ کے ہر خطے سے مردوں کو غلام بنا کر لے جایا جاتا تھا۔ اس لئے عورتوں کو جسم و جاں کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے اپنے وسائل پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اب اگرچہ وہ دور تو ختم ہو چکا ہے لیکن اپنے لئے کمانا برا نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ ہر خاندان میں عام طور پر شادی شدہ عورتیں بھی کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی ہیں۔ سلائی کڑھائی کا کام کرنے والی عورتیں سروں پر سلائی کی مشینیں اٹھائے، گلی محلے میں اپنی خدمات پیش کرتی ہیں۔ پولٹری کے کاروبار پر عورتوں کی اجارہ داری ہے۔ بڑے بڑے فارم تو خیر لبنانی اور بھارتیوں کے قبضے میں ہیں۔ لیکن گھریلو پولٹری فارم ہر گھر میں موجود ہیں۔ حکومت کے اہلکار اور عہدیداروں کی بیویاں اس کاروبار کے ذریعے اپنی آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں اور گھر گھر جا کر آرڈر حاصل کرنے میں عار محسوس نہیں کرتیں۔ چھوٹے پیمانے پر درآمد برآمد کا کام بھی خواتین کے ہاتھ میں ہے۔ بیرون ملک کی مصنوعات کچھ تو باقاعدہ قانونی طور پر درآمد کی جاتی ہیں۔ کچھ ذاتی سامان PERSONAL BAGGAGE میں بھی لایا جاتا ہے۔ تعلقات اور بساط کے مطابق یہ کاروبار بھی چلتا رہتا ہے۔ تعلیم یافتہ خواتین کی بہت قدر و منزلت ہے اور انہیں ملازمت کے مواقع بھی مردوں سے زیادہ میسر ہیں۔

عام طور پر لوگ سیکنڈ ہینڈ کپڑوں سے گزارا کرتے ہیں۔ لنڈے کا مال چلتا ہے۔ نئے کپڑے عید شبرات پر ضرور بنائے جاتے ہیں لیکن ان پر خرچ بہت اٹھتا ہے۔ مردانہ روایتی لباس میں ایک پاجامہ۔ ایک لمبا کرتا اور ایک لبادہ شامل ہوتا ہے۔ اس پر دس میٹر کے قریب کپڑا استعمال ہوتا ہے خواتین کا روایتی لباس لنگی۔ فراک اور پگڑی پر مشتمل ہوتا ہے کپڑا تقریباً چھ سے آٹھ میٹر استعمال ہوتا ہے اور قیمتی ہوتا ہے۔ اس لئے عام طور پر اسے استعمال میں نہیں لایا جاتا۔ تقریبات اور تہواروں پر اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ شادی بیاہ خوشی کے موقعوں کے علاوہ یہی لباس تعزیت کے موقعوں پر بھی پہنا جاتا ہے تعزیت کی رسومات پر شادی بیاہ کی رسومات سے زیادہ خرچہ اٹھتا ہے۔

فوت ہونے والا پسماندگان کے لئے بہت سے مسائل تو چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ جو اس کے وارثوں کو فوری طور پر درپیش ہوتا ہے۔ وہ کفن دفن کے بعد مہمانوں کے لئے طعام و قیام کا مسئلہ ہوتا ہے۔ یہاں وسیع تر خاندان FAMILY EXTENDED کا اصول پوری طرح کارفرما ہوتا ہے۔ دور و نزدیک سے اہل خاندان کے علاوہ قبائلی رشتہ دار بھی فوتیدگی والے گھر میں مہمان ہوتے ہیں۔ یہ اصول عیسائی' مسلمان اور بلامذہب خاندانوں میں بھی روا ہے۔ عام طور پر متوفی کے پسماندگان ان رسومات کو پورا کرنے کے بعد دیوالیہ ہو جاتے ہیں یا بالکل کنگال۔ قدیم روایات کے ساتھ وابستگی اور ان کی پابندی دل و دماغ میں اتنی راسخ ہے کہ انفرادی مذہب' تعلیم' اور خواہش اس کے مقابلے میں بروئے کار نہیں آتی۔ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی گھر میں بیک وقت ایک لڑکا عیسائی ہے۔ دوسرا مسلمان ہے۔ ماں باپ ابھی بھی قدیم قبائلی ایمان پر قائم ہیں۔ فوتیدگی کے موقع پر مرنے والے کی روح کے ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی بھی ہو رہی ہے۔ عیسائی حمد و نعت بھی پڑھی جا رہی ہے اور قبائلی جنتر منتر کا سہارا بھی لیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان شادی بیاہ بھی عام ہیں۔ میاں بیوی اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہیں۔ عکرہ میں ایک بھارتی نژاد ہندو مسٹر خوب چندانی بہت وسیع کاروبار کا مالک ہے۔ اس کے ماں باپ بھارت سے آ کر عکرہ میں آباد ہوئے تھے۔ یہیں یہ پیدا ہوا تھا۔ اس نے تعلیم بھی یہیں پائی اور محنت لگن سے اس کا کاروبار پڑوس کے ملکوں میں بھی پھیلا ہوا ہے اس کی بیوی لبنانی عیسائی ہے اس کی بیٹی عیسائی مذہب کی ہیرو ہے جس کی شادی لبنانی شیعہ مسلمان سے ہوئی ہے۔ بیٹے نے بنگلور بھارت جا کر ایک ہندو لڑکی سے شادی کی اور اسے عکرہ لے آیا ہے۔ مسٹر خوب چندانی کا چچا بھارت میں فوت ہو گیا تو پورا خاندان اس کا کریاکرم کرنے بھارت گیا۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو اس ہندو چچا کی روح کی نجات کے لئے عکرہ میں خوب چندانی کے ہاں تین روز رسومات ہوتی رہیں۔ ایک روز ہندوانہ رسوم ہوئیں۔ دوسرے روز عیسائی دعاؤں کے لئے پادری

صاحبان آئے اور تیسرے روز مسلمان فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی کے لئے آئے۔ مذہب کے بارے میں مغربی افریقہ میں عام طور پر رواداری کا رویہ رکھا جاتا ہے۔ مثلاً آیوری کوسٹ کے سربراہ فلیکس ہمفٹ بوانی HOUMPHET-BOIGNEE FELIX کی ایک عزیزہ فوت ہوئیں تو ان کی مغفرت کے لئے عیسائی اور اسلامی رسومات ادا کی گئیں۔ اور ٹی وی پر تمام کاروائی دکھائی گئی۔ عکرہ میں سرکاری تقریبات پر پہلے عیسائی پادری خدا اور خداوند کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرتا ہے اور HYMN پڑھتا ہے تو حاضرین اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مسلمان امام قرآن کریم میں سے موقع محل کی مناسبت سے کسی آیت کی تلاوت کرتا ہے تو ساتھ ہی اس کا انگریزی میں ترجمہ کرتا ہے اس کے بعد خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں دعا عربی اور انگریزی میں پڑھتا ہے۔ تو حاضرین مودب بیٹھے رہتے ہیں۔ اب باری آتی ہے۔ مقامی رسم و رواج کی۔ مقامی جادوگر اس موقع پر قبائلی جنتر منتر بیان کرتے ہیں۔ اس دوران بھی حاضرین خاموشی سے مودب بیٹھتے ہیں اور ذرا بدمزہ نہیں ہوتے۔ برکینا فاسو کے صدر مملکت کے قتل پر عکرہ میں سات روز سوگ منایا گیا تو ان کی مغفرت کے لئے عیسائی' اسلامی اور قبائلی روایات اور رسومات کی پابندی کی گئی۔ مذہبی رواداری کے ساتھ ساتھ عام طور پر سماجی رواداری پر بھی عمل کیا جاتا ہے قومی اور قبائلی سطح پر مشکلات اس سب ریجن میں سب کے لئے کیا امیر کیا غریب ایک جیسی ہی ہیں۔

استعماری قوتوں کی نوآبادیات میں عموماً اور برطانوی نوآبادیات میں خصوصاً جہاں قبائلی' مقامی اور نسلی تعصبات کو ہوا دی گئی۔ وہاں محکوم و مظلوم لوگوں کے درمیان مذہبی منافرت کو بھی فروغ دیا گیا۔ براعظم افریقہ میں اسلام اور عیسائیت کا تصادم عرصہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ مغربی افریقہ کے ممالک میں عیسائیت کا تعارف پادریوں نے کرایا جو غلاموں کے تاجروں کے ہمراہ حضرت عیسیٰؑ کی بھیڑوں کی تلاش میں تھے۔ ان پادریوں نے حتی الامکان حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی تعلیمات کو فروغ دینے کے

لئے دھن اور دھونس کے تمام حربے استعمال کئے لیکن اسلام کی تبلیغ کرنے والے بھی ان کے پیچھے پیچھے یہاں آ نکلے انہوں نے اپنے آپ کو اسلامی اقدار و روایات کا نمونہ بنا کے پیش کیا اور محنت لگن اور خلوص کو بروئے کار لا کر کامیاب ہوئے۔ یہ ان ہی بے لوث اور باہمت مبلغان اسلام کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس علاقے میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ لیکن چونکہ عیسائی مبلغین کو استعماری طاقتوں کی حمایت حاصل رہی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی تعداد کو ہمیشہ کم دکھایا جاتا ہے۔ عام طور پر یہاں مسلمان اکثریت والے ممالک میں بھی حکمران عیسائی ہیں۔ مثلاً برکینا فاسو اور سیرالیون میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے۔ یہ ممالک اسی اکثریت کے بل بوتے پر اسلامی ممالک کی تنظیم کے ممبر بھی ہیں اور یہ آج کی بات نہیں۔ عیسائی مبلغین کے زیراثر اس پورے علاقے میں عیسائی حکومتوں نے مسلمانوں کو تعلیم سے محروم رکھا۔ اس حد تک پابندی تھی کہ کسی مسلمان افریقی کو کسی تعلیمی ادارے میں اس وقت تک داخلہ نہ ملتا تھا۔ جب تک وہ اپنا اسلامی نام چھوڑ کر عیسائی نام اختیار نہ کرلے۔ روایت ہے کہ گھانا کے آخری منتخب صدر کا نام HILL LEMAN ہل لیمان دراصل IMAN HILAL ہلال ایمان کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سیرالیون کے صدر جوزف سیدو موموح کا اصل نام یوسف سعید محمد تھا۔ لیکن تعلیم کی خاطر ان کا نام جوزف سیدو موموح لکھایا گیا۔ مخلوط نام رکھنے کا رواج بھی ہے۔ جو تعلیمی ضرورت تو نہیں تجارتی مصلحت کے تحت رکھا جاتا ہے۔ ٹوگو میں نوادرات اور زیورات کا ایک تاجر گاہک سے تعارف کے لئے مختلف نام بتاتا ہے۔ اگر اس کے اندازے کے مطابق گاہک مسلمان ہے تو وہ اپنا نام حبیب بتاتا ہے۔ اگر اسے احساس ہو جائے کہ گاہک مسلمان نہیں ہے بلکہ عیسائی ہے تو وہ اپنا نام فلپ بتائے گا۔ وہ لبنانی عیسائی ہے اور عرصہ دراز سے ٹوگو میں مقیم ہے۔ اس کا پورا نام حبیب فلپ کروما HABIB PHILLP KAROMA ہے۔ کروما اس کے نام کا مقامی لاحقہ ہے۔ اس کی ایک بہن شیعہ مسلمان ہے۔ جو گھانا میں فوج کے کپتان سے بیاہی ہوئی

ہے۔ جب میں نے اس کپتان کے مسلک کے بارے میں پوچھا تو جواب گول کر دیا گیا۔ اس قسم کے معاشرے میں عیسائیت اسلام اور قبائلی روایات کے درمیان تقابل جاری رہتا ہے۔ جو لوگ تمام روایات توڑ کر اسلام قبول کر چکے ہیں۔ انہیں باآسانی دوسرے لوگوں میں سے شناخت کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً وہ عام طور پر پاجامہ پہنتے ہیں۔ سر پہ ٹوپی ہوتی ہے اور کھلی آستینوں کے کرتے سے تن ڈھانپتے ہیں۔ عام طور پر پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ قرآن شریف باقاعدہ پڑھتے ہیں۔ نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔ حلال و حرام کی تمیز رکھتے ہیں۔ اس سارے سب ریجن میں قصاب مسلمان ہیں۔ اس لئے ذبیحہ کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا۔ لیکن غربت اتنی ہے کہ عام لوگ ہر جاندار شے کھا جاتے ہیں۔ سڑک کے راستے سفر کرتے ہوئے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے لڑکے خرگوش نما ایک جانور برائے فروخت پیش کرتے ہیں۔ شکل صورت اور جسامت کے لحاظ سے یہ خرگوش ہی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ جنگلی چوہے کی نسل میں سے ہے۔ اس لئے حرام ہے اور مسلمان نہیں کھاتے۔ آیوری کوسٹ کے صدر مقام یاماسوکرو میں پریذیڈنٹ ہوٹل میں اس جانور کی ایک خاص ڈش بنتی ہے۔ اسے مقامی زبان میں اگوتی AGOUTE کہتے ہیں۔ مہمان اسے بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ لیکن انتظامیہ کی جانب سے اہتمام کیا جاتا ہے کہ کوئی مسلمان نادانستہ طور پر بھی یہ ڈش نہ کھائے۔

وہ یوں کہ اس ڈش کے ساتھ ہی ایک بیرا ہر مہمان کو بتاتا ہے کہ ٹرے میں اگوتی AGOUTE کا گوشت ہے۔ سور کا گوشت بھی دعوتوں میں پیش کیا جاتا ہے لیکن اگر مہمان مسلمان ہے تو اسے اس سے خبردار کر دیا جاتا ہے۔ خود میں ایک مرتبہ سور کی کلیجی کھاتے کھاتے بچ گیا۔ سیرالیون کے صدر کی جانب سے سال نو کی تقریب میں مدعو تھا۔ بیرے معمول کی خورد و نوش کی اشیا ٹرے میں رکھ کر پیش کر رہے تھے کہ ایک ٹرے میں فرائی کی ہوئی کلیجی پیش ہوئی۔ خوشبو اشتہا انگیز تھی۔ بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور قریب تھا کہ ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لوں کہ

میرے شانے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو مصر کے سفیر مجھ سے مخاطب تھے۔

سفیر مصر ۔ ایمبیسڈر علی آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ تو خنزیر کی کلیجی ہے۔

میں ۔ آپ کا بے حد شکریہ۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کرسکوں۔ آپ نے بروقت مجھے ٹوک دیا۔ ورنہ میں تو کھا ہی جاتا۔

سفیر مصر ۔ نہیں۔ نہیں شکریئے کی کوئی بات نہیں ہے آپکا یہاں کسی دعوت میں شامل ہونے کا یہ پہلا موقع ہے۔ اس لئے غلطی ہو جانے کا احتمال تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ مداخلت کروں۔ امید ہے آپ نے برا نہیں مانا۔

میں ۔ آپ نے مجھ پر بے حد احسان کیا ہے کہ ایک حرام شے کے کھانے سے مجھے منع فرمایا۔ لیکن یہ کیسے ہے کہ ایک مسلم اکثریت کے ملک میں جو خیر سے اسلامی ممالک کی تنظیم کا ممبر ہے۔ ایک ایسی دعوت میں جہاں مسلمان بھی مدعو ہیں۔ خنزیر کی ڈش پیش کی جا رہی ہے۔

سفیر مصر ۔ یہ تعجب خیز بات نہیں ہے بلکہ یہ میزبانی کے آداب کے عین مطابق ہے کہ مہمانوں میں ایسے لوگ بھی تو شامل ہیں جنہیں خنزیر کا گوشت مرغوب ہے۔

میں ۔ ایکسیلنسی۔ آپ کا فرمانا بجا ہے۔ لیکن یہ بھی تو آداب مہمان نوازی کے خلاف ہے کہ کسی مہمان کو ایسی چیز پیش کی جائے جو اس کے مذہب اور مسلک کے لحاظ سے حرام ہو۔

سفیر مصر۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن ہر ملکے راہر رسمے

میرے ذہن میں اضطراب تھا کہ نادانستگی میں ہی سہی۔ اگر میں وہ تازہ فرائی ہوئی اشتہا انگیز کلیجی کھا لیتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر

پاتا۔ میں ایک گنہگار انسان ہوں۔ مجھے متقی اور پرہیزگار ہونے کا دعویٰ بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ میں حرام شے کھانے سے بچ گیا تھا۔ اتنی دیر میں چیف آف پروٹوکول نے میرا نام پکارا اور مجھے صدر مملکت کے روبرو پیش کر دیا۔ میں اگر پرانا تجربہ کار سفارت کار ہوتا یا کیریئر ڈپلومیٹ CARRIER DIPLOMAT ہوتا تو شاید میں صدر مملکت سے وہ بات نہ کرتا جو میں نے کی۔

مجھے احساس تھا کہ صدر مملکت کو ابھی بہت سے مہمانوں کو ملنا ہے اور وقت کم ہے۔ چنانچہ میں نے انکی۔ ان کے ملک کی اور انتظام و انصرام کی تعریف کرنے کے بعد عرض کیا۔

میں ۔ ایکسیلنسی آپ کا دسترخوان بے حد وسیع ہے اور آپ نے جو اشیائے خورد و نوش پیش کیں وہ بے حد لذیز تھیں۔ لیکن افسوس کہ میں ان میں سے ایک ڈش نہ چکھ سکا۔

صدر مملکت کا منہ استعجاب سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کچھ توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

صدر مملکت ۔ امبیسڈر مجھے بے حد افسوس ہے۔ کیا وہ ڈش اتنی ہی بری تھی کہ آپ نے اسے چکھنا مناسب نہ سمجھا۔

میں ۔ نہیں ایکسیلنسی ایسی کوئی بات نہ تھی۔ دراصل یہ خنزیر کی فرائی کی ہوئی کلیجی تھی جو بے انتہا اچھی بنی ہوئی نظر آتی تھی۔ لیکن چونکہ مسلمان ہوں اس لئے محروم رہا۔

صدر مملکت ۔ ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ شے مسلمانوں کے لئے حرام ہے۔

اس گفتگو کے بارے میں میں شک میں مبتلا رہا کہ آیا مجھے صدر مملکت سے ایسی بات کرنی مناسب تھی یا بطور سفیر ایسی بات کی جا سکتی ہے۔ بہرحال بعد میں سیرالیون کے وزیر خارجہ الحاجی عبدالکریم کروما نے بتایا کہ صدر مملکت نے ان کے ہمراہ اس بات کا ذکر کیا اور فیصلہ یہ کیا کہ ایسی دعوتوں میں جب خنزیر کا گوشت پیش کیا جائے یا ایسے ڈش پیش کی جائے جس میں اس جانور کا گوشت استعمال کیا گیا ہو تو مسلمان مہمانوں کے احترام کے پیش نظر اس میں ایک کارڈ لگا ہونا ضروری ہے۔ جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ ان کے استعمال کے لئے نہیں ہے۔ یہاں تو مصر کے سفیر نے بروقت انتباہ کر دیا تھا۔ تو حرام شے منہ کو نہ لگی۔ لیکن عام طور پر خود ہی احتیاط کرنا ہوتی ہے۔ ہر ملک میں کم از کم ایک فائیو سٹار ہوٹل موجود ہے۔ یہاں قیام کے دوران آپ اگر ہدایت بھی دے دیں کہ آپ مسلمان ہیں اور آپ کو کھانے میں خنزیر سے پرہیز ہے تو اس کا کیا علاج کہ انڈے فرائی کرنے' آملیٹ بنانے میں تو اسی جانور کی چربی استعمال ہوتی ہے۔ پھر مکھن کے نام پر جو مارجرین پیش کی جاتی ہے۔ وہ بھی حرام ہی ہے۔ چائنیز ریستوران میں جائیں تو وہ حرام و حلال کے بارے میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتے۔ اس بارے میں سیرالیون کے وزیر خارجہ الحامی عبدالکریم کروما سے بات ہوئی تو مجھے بہت تعجب ہوا انہوں نے گوشت کا استعمال مکمل طور پر چھوڑ رکھا ہے۔ شراب کو بھی نہیں چھوتے اور چونکہ مخلوط معاشرے میں ذبیحہ۔ غیر ذبیحہ' حرام' حلال کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی جاتی اس لئے وہ اتنی شدت سے سبزی خور ہیں کہ مسلمان گھروں میں بھی وہ گوشت کی بنی ہوئی ڈش کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ میں نے انہیں اس احتیاط پر ہمیشہ کاربند پایا۔

ویسے تو دنیا بھر میں ہر خطے میں مختلف تہذیب و تمدن آپس میں متصادم رہتے ہیں۔ لیکن مغربی افریقہ کے اس سب ریجن میں یہ تصادم بہت نمایاں ہے۔ مسلمان ہو جانے والے یا عیسائیت قبول کرنے والے مقامی افریقی ابھی بھی اپنے قبائلی اور مقامی اوہام سے نجات حاصل نہیں کر سکے۔ نہ ہی ان رسموں کو مکمل طور پر چھوڑ سکے ہیں

جن پر ان کے آبا و اجداد عمل کرتے تھے۔ عیسائی بالاہتمام ہر اتوار کو اپنے بہترین کپڑے SUNDAY BEST پہن کر گرجے جاتے ہیں۔ پادری کا وعظ سنتے ہیں اور حسب توفیق چندہ دیتے ہیں۔ مسلمان عام طور پر پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں۔ مسجدیں آباد ہیں۔ ہر شخص قرآن مجید کی تلاوت عین سعادت سمجھتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ باترجمہ قرآن مجید بھی اپنے پاس رکھے۔ چاہے اسے چرانا ہی پڑے۔ اس سب ریجن میں مسلمان ممالک کے سفارت خانوں پر اسلام کے بارے میں کتابوں کی بہت مانگ رہتی ہے۔ ہماری وزارت مذہبی امور اس بارے میں بہت تعاون کرتی ہے۔ تبلیغی جماعت کے وفود بھی ہر سال اس سب ریجن کا دورہ کرتے ہیں اور ان کے دوروں کے مثبت نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ عیسائیت کی اشاعت و ترویج کافی حد تک رک چکی ہے۔ افریقی مسلمانوں میں اسلام کی روشنی پھیل رہی ہے اور مسلمانوں کا تشخص اجاگر ہو رہا ہے۔ حکومت بھی ان کے مذہبی معاملات میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ لیکن افریقی رسم و رواج جو جنتر منتر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ابھی بھی مروج ہیں۔ افریقی جوحو کے ذریعے اب بھی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ نیک روحوں کو عالم بالا سے بلا کر بدروحوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی کالا بکرا۔ کالا مرغ۔ دال۔ کالا کپڑا۔ صدقے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ گنڈے تعویذ بھی صحت۔ روزگار۔ محبت۔ شادی اور اولاد کے لئے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ مستورات ناف سے ذرا اوپر مختلف رنگوں سے بنی ہوئی موتیوں کی لڑیاں پہنتی ہیں جنہیں FERTILITY BEADS کہا جاتا ہے۔ شاید یہ ان فرٹیلٹی بیڈ کا اعجاز ہے کہ اس سب ریجن میں کوئی خاتون بھی بے اولاد نہیں رہتی۔ شادی کے بغیر بچے پیدا کرنا یا کسی مرد کے ساتھ رہنا معیوب خیال نہیں کیا جاتا۔ لیکن اسلام نے اخلاقی اور جنسی بے راہروی پر مسلمانوں کی حد تک کنٹرول کر لیا ہے۔ مردوں میں البتہ کثرت ازدواج کا رواج ہے۔ اور اس بارے میں اسلامی رعایت کا بخوبی فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ یہ اجازت اس سوسائٹی میں قدیم رواج کے عین مطابق ہے۔ غلاموں کی تجارت کے زمانے میں افریقی باشندوں کی برآمد

زوروں پر تھی۔ جس کے نتیجے کے طور پر اس معاشرے میں مردوں کی کمی واقع ہو گئی تھی۔ فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ بہت سی خواتین مل جل کر ایک ہی مرد سے استفادہ کریں۔ مردوں کی کمی نے ایک ایسی سوسائٹی کو جنم دیا۔ جہاں سوتن کا تصور ہی نہیں ہے۔ لیکن اسلامی تعلیمات کا اتنا اثر ضرور ہوا ہے کہ بغیر شادی کے مرد و عورت کا اختلاط ختم ہو چکا ہے۔ سوسائٹی میں شادی شدہ عورت کا احترام بڑھ گیا ہے۔ شادی کے بغیر اولاد پیدا کرنا معیوب خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن اب مسلمان مستورات اس رسم سے پرہیز کرتی ہیں۔ موسم کے تقاضوں کے پیش نظر۔ غربت کپڑے کی کم یابی اور قدیم افریقی سماج کے رسم و رواج کے باعث ستر ڈھانپنے کی جانب توجہ کم ہی دی جاتی تھی۔ لیکن اسلام نے مسلمان افریقیوں میں باقاعدہ ترغیب و تربیت سے قدیم قبائلی رسم کو ختم کر دیا ہے۔ ویسے اب بھی یہ منظر عام نظر آتا ہے کہ ریڑھی یا چھابہ لگائے ہوئے کھوکھے پر بیٹھی خاتون گاہکوں کو بھی بھگتا رہی ہے اور پوری چھاتیاں کھولے بچے کو دودھ بھی پلا رہی ہے۔ نہ تو وہ خود اس میں حجاب محسوس کرتی ہیں' نہ دیکھنے والے اسے معیوب سمجھتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ مغرب کے برعکس یہاں چھاتیوں کو جنسی خوبصورتی کا سمبل (SYMBAL) تصور نہیں کیا جاتا۔ بلکہ جسم کا یہ حصہ تو بچوں کو غذا مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ سفر کرتے ہوئے بھی اکثر تو نہیں بعض اوقات ایسی خواتین بھی نظر آ جاتی ہیں جنہوں نے جسم کا اوپر کا حصہ ڈھانپنے کا تکلف نہیں کیا ہوتا۔ شہروں کے نزدیک کے علاقوں میں یہ رواج اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں کیا شہر اور کیا دیہات ایک منظر عام طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں کہیں بھی کسی شخص کو پیشاب کرنے کی حاجت محسوس ہوتی۔ وہ بلاتکلف اپنی حاجت کو پورا کر لیتا ہے۔ یہ بھی تکلف نہیں کیا جاتا کہ حاجتمند شخص کسی اوٹ میں۔ درخت کے پیچھے یا جھاڑیوں میں اتر کر پیشاب کرلے۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر بے حجاب پیشاب کر لیا جاتا ہے۔ افریقیوں کی اس عادت کی طرف میری توجہ گھانا کے وزیر خارجہ عبید اساموا نے دلائی تھی۔ یہ میری ان

سے دوسری یا تیسری ملاقات تھی۔

عبیدا ساموا۔ ایمبیسڈر علی شیخ آپ کو ہمارا ملک کیسا لگا۔

میں ۔ ایکسلنسی کھانا بھی پاکستان ہی کی طرح ہے۔ یہاں کے لوگ ملنسار ہیں۔ جلد دوست بن جاتے ہیں اور خوش تمیز ہیں۔

عبید اساموا ۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپکو ہمارا ملک اچھا لگا ہے اب بتائیے آپکا دل بھی یہاں لگا یا نہیں۔ عام طور پر سفیر صاحبان یہاں کے ماحول میں جلد ایٹ ہوم At Home محسوس نہیں کرپاتے۔

میں ۔ ایکسلنسی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں آنے سے پہلے جو تصور مغربی افریقہ کے بارے میں دیا گیا تھا۔ یہ سب ریجن اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ میں اور میری اہلیہ At Home محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں لوگوں کے ساتھ رابطہ کرنے میں بھی کوئی مشکل یا دشواری پیش نہیں آئی۔

عبید اساموا ۔ ہمارے ہاں کی کچھ رسمیں آپ کو ضرور عجیب و غریب لگیں گی۔ لیکن ہمارے ہاں کچھ لوگ بہت ناپسندیدہ حرکتیں بھی کرتے ہیں؟

میں ۔ ایکسلنسی۔ ہر ملک میں اپنے اپنے رسم و رواج ہوتے ہیں۔ مجھے تو کوئی ایسی حرکت نظر نہیں آئی جسے ناپسندیدہ قرار دیا جائے۔

عبید اساموا ۔ ایمبیسڈر۔ کیا آپ کے ہاں لوگ سرعام پیشاب کرتے ہیں۔

میں ۔ جی ہاں۔ کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں اور دیہات میں تو یہ رواج عام ہے۔ سرعام تو نہیں البتہ اوٹ میں ہو جاتے ہیں۔

عبید اساموا ۔ اگرچہ میں یہیں کا شہری ہوں اور ابتدائی تعلیم و پرورش بھی اسی ماحول میں ہوئی ہے۔ لیکن میں ابھی تک اس لوگوں کی اس

عادت سے سمجھوتہ نہیں کر سکا کہ سڑکوں کے کنارے یا گلی کوچوں میں سرعام پیشاب کیا جائے۔ کیا آپ کو یہ منظر دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا۔ مجھے تو سخت گھن آتی ہے اور میں بہت کڑھتا بھی ہوں لیکن نہ تو حکومت لوگوں کی اس عادت کو ختم کرنے کے لئے کچھ کر سکی ہے۔ نہ سوسائٹی۔

میں ۔ لیکن ایکسلنسی۔ لوگوں کی اس عادت کو ختم کرنے کے لئے مناسب اقدام کئے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ لوگ ایسا نہ کریں۔

عبیدا ساموا ۔ مثلاً

میں ۔ مثلاً یہ کہ سڑکوں کے کنارے۔ مارکیٹ وغیرہ کے نزدیک ایسے ٹوائلٹ روم بنا دیئے جائیں۔ جہاں لوگ اپنی حاجت کو پورا کر سکیں۔

عبیدا ساموا ۔ ہم نے حکومتی سطح پر اس بات کا جائزہ لیا تھا۔ لیکن ہم اس تجویز پر عمل نہیں کر سکے۔ وزارت خزانہ کا اعتراض یہ تھا کہ ابتدا میں تو ہم زرکثیر خرچ کر کے ٹوائلٹ روم TOILET ROOM بنا دیں گے۔ لیکن اصل مسئلہ تو انہیں MAINTAIN کرنے کا ہو گا اور ملک کی اقتصادی حالت ایسی نہیں ہے۔ کہ ٹائلٹ روم بھی بنیں اور ان کے روزانہ کے اخراجات بھی اٹھائے جا سکیں۔

میں ۔ ایکسیلنسی۔ یہ تو ہر ملک کی وزارت خزانہ کا مسلمہ اصول ہے کہ رقم مہیا کرنے میں جائز ناجائز اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ اس لئے وزارت خزانہ پر الزام دینا مناسب نہیں ہے۔ وہ لوگ اپنی عادت سے مجبور ہیں۔

عبیدا ساموا ۔ ہاں ایمبیسڈر علی شیخ آپ درست کہتے ہیں۔ میں نے تو یہ دلیل بھی دی تھی کہ مردوں کا عام جگہوں پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنا ہی کچھ کم قابل اعتراض نہیں ہے اور اس کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس بات کا کیا علاج کہ ہمارے ہاں خواتین بھی یہی حرکت روا

رکھتی ہیں۔ ایمبیسڈر علی شیخ! کیا آپ نے یہ نوٹ کیا ہے کہ ہمارے ہاں مستورات بھی سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر وہی حرکت کر رہی ہوتی ہیں۔ جو مرد کرتے ہیں۔

میں نے وزیر خارجہ کے منہ سے یہ بات سنی تو میرا سر گھوم گیا۔ مجھے کوئی سمجھ نہ آ رہی تھی کہ میں اس انکشاف پر کس ردعمل کا اظہار کروں۔ خواتین کا سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا میرے لئے بے حد تعجب کی بات تھی۔ اور ناقابل یقین بھی۔ لیکن عبیدا ساموا بے حد متین اور سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بہت کم گفتگو کرتے ہیں اور فضول گفتگو کرنا ان کی عادت میں داخل نہیں ہے۔ میرے پاس ان کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بعد میں میں نے خود بھی دیکھا کہ عیدا ساموا ٹھیک کہتے تھے۔

میں ۔ ایکسیلنسی۔ آہستہ آہستہ عادتیں تبدیل ہو جائیں گی۔ اس وقت افریقی شہری قدیم روایات سے ناطہ توڑنا مشکل سمجھتے ہیں' لیکن جلد ہی ایسی ناگوار عادات معدوم ہو جائیں گی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید ناگوار رسوم کا بھی پتہ چلا۔ مثلاً بچپن ہی سے لڑکیوں کے ہونٹوں میں سوراخ کر دیئے جاتے ہیں اور ان زخموں کے بھرنے پر ان میں بانس کی پتلی کھپچیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ بعض قبائل میں خواتین کو زیادہ باتیں کرنے سے باز رکھنے کے لئے ان کے ہونٹوں کو بانس کی کھپچیوں سے مہربلب کر دیا جاتا ہے۔ اس کا انتظام بچپن سے کر دیا جاتا ہے۔

افریقی قبائل میں ایک رسم یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں بلالحاظ جنس بچوں کے ختنے کئے جاتے ہیں۔ ۸۸-۱۹۸۷ء کے دوران تقریباً چھ ماہ تک ذرائع ابلاغ اخبارات۔ ریڈیو۔ ٹی وی کے ذریعے لڑکیوں کی حد تک اس قبیح رسم کے نقصانات اور اس کے خاتمے کے لئے وسیع پیانے پر حکومت کی جانب سے پبلسٹی کی گئی۔ مسلمان علما' عیسائی پادری اور قبائلی رہنماؤں نے بھی اس مہم میں حکومت کا ساتھ دیا لیکن اس قدیم رسم کو ختم

کرنے میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔

اس سب ریجن میں یو ای EWE قبیلہ پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ مختلف ممالک میں بٹ جانے کی وجہ سے اس کی اجتماعی طاقت کم ہو گئی ہے لیکن ان کی اصل طاقت تو ان کے باہمی قریبی رابطے کی وجہ سے ہے۔ اگرچہ اس قبیلے کے لوگ ٹوگو آیوری کوسٹ اور برکینافاسو میں فرانسیسی انتظامیہ کے ماتحت تھے اور گھانا اور سیرالیون میں برطانوی کنٹرول میں تھے۔ لائبیریا میں اس قبیلے کے لوگوں نے غلامی کا مزا نہ چکھا لیکن امریکی تہذیب سے متاثر ہیں۔ چنانچہ مختلف جدید زبانیں بولتے ہیں۔ لیکن قبائلی رشتوں ناطوں کا اثر قائم ہے۔ جس کی وجہ سے EWE یو۔ ای قبیلہ ایک قوم کہلاتا ہے۔ اس کے مقامی چیفس CHEIFS کا اثر مقامی سیاست پر بھی ہوتا ہے اور شہروں سے دور کے علاقوں میں ملکی حکومت کا دائرہ اثر اس قبیلے کے عمائدین کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔ اس سب ریجن کے ممالک میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسانی قربانی قانوناً منع ہے اور اسے بمنزلہ قتل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن افریقی قبائلیوں کو اس غیر انسانی رسم سے باز رکھنا صرف اسی وقت ممکن ہو سکا تھا جب یو ای EWE قبیلے کے چیفس نے حکومتوں کی مدد کی۔ یہ رسم اب بھی کبھی کبھار ادا کی جاتی ہے۔ میرے تین سالہ قیام کے دوران صرف ایک ایسا واقع ہوا۔ جب گیارہ اشخاص نے مل کر دیوتاؤں کے حضور ایک کم سن بچے کی قربانی پیش کی۔ جرم کا انکشاف ہوتے ہی صدر مملکت جیری جے رالنگ کی ہدایات پر قبائلی جرگہ تشکیل ہوا۔ مقدمہ چلایا گیا۔ اور اگلے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر گیارہ کے گیارہ مجرمان کو موت کی سزا دیدی گئی۔ اس جرم اور سزا کی وسیع پیمانے پر پبلسٹی کی گئی۔ ریڈیو۔ ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے دور و نزدیک بار بار اس واقعے کی نشر و اشاعت کا انتظام کیا گیا۔

اس سب ریجن میں واقعہ ممالک کے درمیان تجارتی رابطے بھی مضبوط ہیں۔ سرکاری سطح پر بھی اور غیر سرکاری سطح پر بھی۔ غیر سرکاری رابطے مصنوعی اور غیر فطری سرحدی لکیروں اور قبائلی تعلقات کی وجہ سے بے حد آسان ہیں اور منافع بخش

بھی- سیرالیون قیمتی پتھروں کی دولت سے مالا مال ہے- ہیرا بافراط پیدا ہوتا ہے- اس قیمتی پتھر کی تجارت پر حکومت کی اجارہ داری ہے- سرکاری طور پر ہیرا اور دوسرے قیمتی پتھر سرکاری ایجنسی کے ذریعے برآمد ہوتے ہیں- سیرالیون کی حکومت کو اس تجارت سے قیمتی زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے- لیکن سیرالیون کی جنوبی سرحد پر بارڈر کے بالکل ساتھ تقریباً نو مین لینڈ NO MANS LAND میں خام ہیرے کے لائبیرین تاجر کھوکھوں میں بیٹھے ہوئے سیرالیون کے ہیروں کا سودا کر رہے ہوتے ہیں- اور یہ کاروبار کھلم کھلا ہوتا ہے- سیرالیون کی حکومت نے کئی بار لائبیریا کی حکومت سے اس بارے میں احتجاج کیا ہے- لیکن یہ غیر سرکاری تجارت چل رہی ہے- آیوری کوسٹ اپنی ضرورت سے زیادہ چاول پیدا کرتا ہے- ساتھ ہی ساتھ یہاں باہر سے چاول درآمد کیا جاتا ہے- جو عابد جان بندرگاہ میں گوداموں میں پڑا رہتا ہے اور ہمسایہ ملکوں کو بھیجا جاتا ہے کچھ سرکاری ذرائع اور اجازت سے اور زیادہ غیر سرکاری ذرائع اور راستوں سے برکینا فاسو کو سالانہ ساٹھ ہزار ٹن چاول درکار ہوتا ہے- لیکن اس بارے میں یہ ملک کبھی بھی خودکفیل نہیں رہا- غریب ملک ہے اس لئے حکومت چاول درآمد کرنے سے اکثر قاصر رہتی ہے- لیکن لوگوں کو چاول تو بہرحال کھانا ہے- یہ کمی آیوری کوسٹ کے گوداموں سے پوری ہوتی ہے- برکینا فاسو کی حکومت کو علم ہوتا ہے کہ کہاں سے یہ کمی پوری ہو رہی ہے- لیکن اس نے کبھی اس کا برا نہیں مانا- برکینافاسو میں بھیڑ بکری مقامی ضروریات سے زیادہ ہے اور عام لوگوں کی اکثریت کا پیشہ مویشی پالنا ہے یا دوسرے ممالک میں جا کر ملازمت حاصل کرنا- ہر روز برکینافاسو سے کم ازکم پانچ ہزار لوگ آیوری کوسٹ جاتے ہیں اور شام کو اپنے گھروں میں واپس آ جاتے ہیں- مویشی اور جانور پالنے والے لوگ عام طور پر خانہ بدوش زندگی بسر کرتے ہیں- اپنے ریوڑ ہانکتے ہوئے چارے کی تلاش میں یہ پڑوس کے ملکوں میں چلے جاتے ہیں اور انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ سرحد عبور کر چکے ہیں- ٹوگو اور گھانا کی وجہ شہرت ہاتھی دانت نہیں ہے- یہاں تو ہاتھی ہوتے ہی نہیں ہیں، لیکن ہاتھی دانت کی

اشیا دونوں ممالک میں باآسانی مل جاتی ہیں۔ گھانا کی وجہ شہرت سونا ہے۔ لیکن جتنا سونا یہاں پیدا ہوتا ہے اس کا ایک بڑا حصہ ٹوگو کو برآمد ہو جاتا ہے۔ گھانا کا سونا خالص ہونے کی شہرت رکھنے کی وجہ سے بہت مقبول ہے۔ گھانا میں اس کی برآمد پر حکومت کی اجارہ داری ہے اور کانیں بھی حکومت کے کنٹرول میں لیکن اس کی غیرسرکاری تجارت پر ٹوگو کے تاجروں کی اجارہ داری ہے۔ وہ ٹوگو حکومت کو اڑھائی فیصد ٹیکس ادا کرتے ہیں اور سونے کی ڈیلوری پر ٹوگو حکومت کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ ٹوگو ایک کپڑا درآمد کرتا ہے جسے افریقن پرنٹ کہتے ہیں۔ لیکن یہ اپنی ضرورت سے زیادہ درآمد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ٹوگو سے سفر کرتا ہوا شمال میں سینگال تک پہنچ جاتا ہے اور یوں باہمی غیر سرکاری تعاون کے ساتھ مغربی افریقہ کا یہ سب ریجن اپنی ضروریات پوری کرلیتا ہے۔ امداد باہمی کا فلسفہ مکمل طور پر جاری و ساری رہتا ہے۔

حرف سپاس

یہ ناسپاس گذاری ہو گی۔ اگر میں ان احباب کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے میری سفارت کے دوران میری اعانت کی۔ جناب مسٹر جسٹس محبوب احمد چیف جسٹس، جناب مسٹر جسٹس ارشاد حسن خاں، جناب اکرم ذکی سیکرٹری جنرل وزارت خارجہ، جناب شہریار ایم خاں سیکرٹری وزارت خارجہ بالخصوص میرے شکریئے کے مستحق ہیں۔ میں اپنے بیٹے ڈاکٹر اشتر اوصاف علی ایڈووکیٹ کا بھی معترف ہوں کہ اس نے ایک اچھے بیٹے کی طرح پاکستان سے میری غیر حاضری کے دوران میرے معاملات پر ذاتی توجہ دی اور گھانا میں مجھے اپنے فرائض پورے کرنے کے لئے مناسب لٹریچر بروقت مہیا کیا۔ اور میرے ذاتی معاملات میں بھی بے فکر رکھا۔ اللہ اسے جزا دے۔

میں جناب مسٹر جسٹس اے ایس سلام جج سپریم کورٹ کا بھی شکرگزار ہوں کہ مجھے فارغ دیکھ کر انہوں نے مجھے افریقہ میں اپنے مشاہدات تحریر کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اگر آپ اس کتاب سے بور ہوئے ہیں تو یہ ان کی ذمہ داری ہے۔

آخر میں جنگ پبلشرز کے جناب مظفر محمد علی اور طاہر اصغر کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی تدوین و اشاعت میں ذاتی دلچسپی لی۔

افتخار علی شیخ

20 - 5 - 92

لاہور

3/5 Vol.8

REPUBLIC OF GHANA

Ministry of Information
P.O. Box M.41
Accra

20th December, 1988

Excellency,

Thank you for your letter of 5th December, 1988, AMB.1/88 in which you protest against the denigration of Islam in a GBC television programme telecast on December 3, 1988.

I have ordered a full investigation into the issue and the Director-General of GBC has assured me that GBC will take the necessary corrective measures to avoid such occurrences in the future.

Please accept, Excellency the assurance of our highest esteem.

PNDC SECRETARY FOR INFORMATION
(DR. MOHAMMED BEN ABDALLAH)

H.E. THE AMBASSADOR,
EMBASSY OF PAKISTAN,
ACCRA.

ٹی وی پروگرام کے خلاف احتجاجی مراسلے پر متعلقہ منسٹر کی جانب سے تحقیقات کی یقین دہانی اور آئندہ کے لئے احتیاط کا خط۔

REPUBLIC OF GHANA

OFFICE OF THE
PROVISIONAL NATIONAL
DEFENCE COUNCIL
P.O. BOX 1627
ACCRA

6

17th March, 1987.

PAKISTAN PAVILION GIFEX '87

Thank you for your letter No. Pol.I/6/86-Gen, dated I2th February, 1987, relating to my visit to your national pavilion during the opening ceremony of Gifex '87.

2. I highly appreciate your generous present of two beautiful vases which you presented to me to commemorate my visit and I am very grateful to you for them. Let me say again how pleased I was to view the beautiful handicraft originating from your country. I hope, as indicated during the visit, that you will succeed in establishing an outlet for those goods in Ghana.

3. Please accept, your Excellency, the assurances of my highest consideration.

(P.V. OBENG)
PNDC MEMBER & CHAIRMAN OF THE
COMMITTEE OF SECRETARIES.

HIS EXCELLENCY,
AMBASSADOR OF PAKISTAN,
EMBASSY OF PAKISTAN,
P O. BOX III4,
ACCRA.

ں - وی - اوبنگ کی جانب سے عکرہ میں منعقدہ نمائش کے دوران پاکستان پویلین کی عمدہ کارکردگی پر سفیر
کستان کے نام ایک توصیفی خط

ADDITIONAL FOREIGN SECRETARY
PAKISTAN

Personal

ISLAMABAD

26/4

My dear Iftikhar Sheikh Sahib,

Your reports and letters regarding the Afghanistan resolution have been read with great interest, as also your very constructive suggestions regarding future actions to be taken.

Congratulations to you on your efforts & the happy results, — do keep up the good work.

With warm regards,

Yours sincerely

Ahmad Kamal

احمد کمال ایڈیشنل سیکرٹری دفتر خارجہ کی جانب سے افغانستان ریزرویشن پر سفیر پاکستان کے نام توصیفی خط

The Ambassador & Madam,

I wish to thank you for the curtesy call and on behalf of my husband and myself to say thank you for everything.

Yours Sincerely

Nana Rawlings

28-July/88

بیگم جے جے رالنگ کی جانب سے تحائف وصول کرنے پر شکریے کا خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

BY BAG

Ministry of Foreign Affairs
Islamabad

From: Mr. Sultan Hayat Khan,
Director General (S&F).

No. EQ (1) 24/5/86 29 May 1988.

My dear Ambassador,

I am desired to refer to your letter No.Misc.1/I/84, dated 11 May 1988, regarding your decision to defer purchase of a new car for your Mission and to convey appreciation of the Ministry for this thoughtfulness.

with regards.

Yours sincerely,

(Sultan Hayat Khan)

H.E. Mr. Iftikhar Ali Sheikh,
Ambassador of Pakistan,
Accra.

ڈائریکٹر جنرل دفتر خارجہ کی طرف سے نئی کار خریدنے سے انکار پر سفیر پاکستان کے نام ایک تعریفی خط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ADDITIONAL FOREIGN SECRETARY

PAKISTAN

115

ISLAMABAD

5- As(GA...)/18

December 31, 1987

My dear Ambassador,

Kindly refer to your letter No.F.8/4/84-Pol dated November 17, 1987.

2. I would like to take this opportunity to express the Ministry's appreciation for your efforts in ensuring the successful passage of the Resolution on Afghanistan at the United Nations. The position taken by Ghana and Burkina Faso was critical to the Resolution.

3. Please accept my very good wishes and regards.

Yours sincerely,

(M. Bashir Babar)

H.E. Mr.Iftikhar Ali Sheikh
Ambassador of Pakistan,
Accra

ایڈیشنل سیکرٹری دفتر خارجہ کی جانب سے افغانستان ریزرویشن پر سفیر پاکستان کے نام ایک تعریفی خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

From :

BY BAG

1280

Mr. Aftab Husain Syed,
Director General (Africa)

Ministry of Foreign Affairs
Islamabad

No.D.1100-DG(Africa)/88 March 30, 1988.

My dear Ambassador,

Kindly refer to your letter No.Com.15/86-Pt.I dated March 21, 1988 with which a report has been enclosed on Pakistan's participation at the INDUTECH 88 in Ghana.

2. I would like to congratulate you on your initiative and personal efforts which have resulted in a highly successful projection of Pakistan in West Africa.

With best regards

Yours sincerely,

(Aftab Husain Syed)

H.E.Mr.Iftikhar Ali Sheikh,
Ambassador of Pakistan,
Accra.

ڈائریکٹر جنرل دفتر خارجہ افریقہ کی جانب سے سفیر پاکستان کے نام بین الاقوامی نمائش میں شرکت پر تعریفی خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

No. 41(1)/88-Tr.III
GOVERNMENT OF PAKISTAN
MINISTRY OF COMMERCE

TELEGRAMS : "COMDIVIS"
TELEPHONE NO. :

Islamabad, the 10th May, 1988

ABID JAVED AKBAR
DEPUTY SECRETARY

My dear Ambassador,

Kindly refer to your letter No.Com-15/86-Vo.I, dated 8.4.1988 regarding Pakistan's participation in the Industrial and Technology Fair (INDUTECH 88) held at Accra.

2. We are grateful for a very comprehensive and useful account of the exhibition. A copy of the same is being passed on to EPB for taking necessary action on the recommendations contained in the report.

With regards,

Yours sincerly,

(Abid Javed Akbar)

ڈپٹی سیکرٹری آف کامرس کی جانب سے بین الاقوامی میلے میں شمولیت پر ایک توصیفی خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

PIA

Air Marshal
M. A. DAUDPOTA
HI (M), SJ
MANAGING DIRECTOR

Ref: MDS/ 261
October 26, 1986

H.E. Mr. Iftikhar Ali Sheikh,
Ambassador of Pakistan,
Accra
(Ghana)

Dear Excellency,

السلام علیکم

Thank you for your letter dated September 22, 1986 that I received recently.

Your letter of August 12, 1986, was acknowledged through my letter dated September 08, 1986 (copy attached).

While appreciating your interest in PIA's operation to Ghana, I had stated, in my reply, PIA's position vis-a-vis your proposal, and our plans to study the market potential in the African region. The possibility of establishing an air link between Pakistan and Ghana can only be determined after the outcome of our market study of the region.

Thank you for your keen interest in PIA.

With kind regards,

Yours sincerely,

Daudpota

PAKISTAN INTERNATIONAL AIRLINES, KARACHI AIRPORT, PAKISTAN

پی آئی اے کی جانب سے مغربی افریقہ میں روٹ بنانے سے انکار کا خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ADDITIONAL FOREIGN SECRETARY
PAKISTAN

ISLAMABAD

No. 434-ASL/NA/86 21 October 1986

My dear Ambassador,

Thank you very much for your Report No.1/6/86 dated 5 October,1986. We greatly appreciate the analysis contained in your report. We are taking up the issues raised in your letter with Ministries concerned.

With warm regards

Yours sincerely,

Shaharyar M. Khan

(Shaharyar M. Khan)

H.E.Mr.Iftikhar Ali Sheikh,
Ambassador of Pakistan,
ACCRA

ایڈیشنل سیکرٹری دفتر خارجہ کی جانب سے سفیر پاکستان کے نام ایک مراسلہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

From: Mr. Aftab Husain Syed,
Director General (Africa)

Ministry of Foreign Affairs
Islamabad

No GHA-6/5/86-AFR II 27 November 1986

My dear Ambassador,

1531/6/12/86

Kindly refer to your letter No.Pol.1/6/86 dated 17 November, 1986 regarding the presence of Israel in Africa.

2. I would like to acknowledge this report on behalf of the Addl. Secretary and on my own behalf. It was an interesting and useful report. In fact, we read all your despatches with great interest as they contain useful and upto date information about the happenings in your part of the world.

With warm regards

Yours sincerely,

(Aftab Husain Syed)

H.E.Mr. Iftikhar Ali Sheikh,
Ambassador of Pakistan,
ACCRA

ڈائریکٹر جنرل دفتر خارجہ کی طرف سے ایک اور خط

BY BAG

بسم الله الرحمن الرحيم

ADDITIONAL FOREIGN SECRETARY
PAKISTAN

ISLAMABAD

No. 4956-A.S.(UN&A)/86 3 December,1986

My dear Ambassador

I have been reading your reports with great interest and I would thank you for keeping us fully informed of various issues relating to Ghana's internal and external problems. I would like, particularly, to thank you for your Report No.Pol.1/6/86, dated 17 November,1986.

With warm regards

Yours sincerely,

(Shaharyar M.Khan)

H.E. Mr.Iftikhar Ali Sheikh,
Ambassador of Pakistan,
ACCRA

سفیر پاکستان کی جانب سے اسرائیل کے بارے رپورٹ بنانے پر ایڈیشنل سیکرٹری دفتر خارجہ کا ایک توصیفی خط

Accra-Ghana.

No.Amb.1/86. November 17, 1986.

My dear Director-General,

I shall be failing in my duty towards Ghana, if I do not bring to your notice unsavoury remarks contained in a speech made on Saturday, the 8th November, 1986 in the children programme broadcast on Ghana Television under auspices of UNESCO.

2. The little girl wearing a band round her waist carrying "INDIA" written on it, made controversial remarks regarding Bangladesh and India's contribution towards its liberation. I believe the author of those remarks is unaware of the brotherly relationship existing between Pakistan and Ghana. I protest strongly in this behalf.

3. Please let me know when it shall be convenient to you to receive me.

Yours sincerely,

(Iftikhar Ali Sheikh)
Ambassador of Pakistan

یونیسکو ڈے پر بھارتی لڑکی کی طرف سے پاکستان کے خلاف اور بنگلہ دیش بنانے کے حق میں تقریر کا متن اور سفیر پاکستان کا احتجاجی مراسلہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

BY DIPLOMATIC BAG

Bashir Ahmad
Secretary

No. MCB-2(7)/80-XIX

GOVERNMENT OF PAKISTAN
MINISTRY OF PETROLEUM AND NATURAL RESOURCES

Tele { Grams : PETROMINERAL
Phone : 821220

Islamabad, the 16th September, 1987

My dear Ambassador,

Thank you for your letter of 31st August, 1987 regarding exploitation of copper and gold deposits in Burkina Faso.

2. The mineral sector in Pakistan is still in its infancy and presently neither the public nor the private sector has any experience of large scale mining, particularly of metallic minerals. We therefore, do not have any sizeable mineral based industry. In the public sector, we have been investigating copper and gold deposits at Saindak, in Chagai district since the last 13 years and have not been able to develop the deposit due to lack of funds and local expertise.

3. Under these circumstances I do not think we can make any visible impact by our presence in Burkina Faso. I would however, like to thank you for bringing this to our notice.

With best wishes,

Yours sincerely,

(Bashir Ahmad)

محکمہ معدنیات و پٹرولیم پاکستان کی جانب سے معدنیات کے ضمن میں برکینافاسو کی امداد کرنے پر معذرت

REPUBLIC OF GHANA

OFFICE OF THE PROVISIONAL NATIONAL DEFENCE COUNCIL
P.O. BOX 1627
ACCRA

8th October, 1987

Dear

I wish on behalf of my wife and I and also on behalf of the other couples, to express my sincerest thanks for affording us the opportunity to share the beauty of your family's warmth and benefaction on Saturday, 3rd October 1987.

The atmosphere was friendly and enabled us to share many important and useful ideas. The food was excellent and served to project another important Pakistani characteristic. In spite of all this, I believe the one important benefit derived from the gathering was the deepening of understanding on both side over very crucial matters that bear on some international and bi-lateral issues.

We thank you once more for the invitation.

P V OBENG
PNDC MEMBER AND CHAIRMAN OF
COMMITTEE OF SECRETARIES

H.E. MR. IFTIKHAR ALI SHEIKH,
AMBASSADOR EXTRA-ORDINARY
AND PLENIPONTENTIARY OF
PAKISTAN,
P. O. BOX 1114,
A C C R A.

سفیر پاکستان کی طرف سے دی گئی دعوت کے شکریے کے طور پر پی وی اوبنگ کا ایک توصیفی خط

Embassy of Pakistan
Accra

No.Amb.1/88.   5 December 1988.

Excellency,

It so happened that on Saturday, December 3, 1988, I got the shock of my life, while watching a music and dance number of Ghana T.V. between 20.50 PM - 20.55 PM.

2. I am referring to the item, wherein 4 artists, 2 men, and 2 ladies participated. The item was to say the least directly sacrilegious of Islam in general and one of its five important pillars, Salat in particular.

3. In order to represent the Arab Muslims, one of the male artists was wearing a typical Arab dress with headgear. The other male artist was supporting a bit modern dress. Both were wearing shoes.

4. But regarding the dress of female artists even modicum of decency was thrown to wind.

The above description is only to point out the particular item.

5. As a Muslim, I believe that the item was profane, exhibiting complete disregard for Muslim sentiments, and maliciously insulting. The Azan, Rakoo, Sajood of Salat were all put to use, which at least in my life I have never heard of or seen.

6. My duty towards Islam as well as the Republic of Ghana, have prompted me to address you in protest. In my opinion the wrong has been done, and cannot be remedied, unless you come out with a solution.

(Iftikhar Ali Sheikh)

اذان اور صلوٰۃ کا مذاق اڑانے کے بارے میں ایک ٹی وی پروگرام کے متعلق سفیر پاکستان کا احتجاجی مراسلہ

Cable

ST, ACCRA

Tel

Telex

GHANA BROADCASTING CORPORATION

DG. 20/V.2/329

Broadcasting House, P.O. Box 1633
Accra Ghana

No.........................

PPI

14th Dec

PA

Your Excellency,

I acknowledge, with many thanks, indeed, your letter dated 5th December, 1988 on our Musical Rendez-vous programme telecast from 8.00 to 9.00 p.m. on 3rd December, 1988.

I quite agree that the segment you particiuliarise is offensive and that we owe all our moslem audiences unqualified apologies.

I should like to assure you, nevertheless, that I have taken prompt action to prevent a recurrence. Indeed, our standing code of ethics unreservedly decries such offensive productions and we are having to retrain our producers and supervisors anew.

Once again, Your Excellency, I wish to thank you most sincerely for drawing our attention to the harm done which should never be repeated.

Yours faithfully,

(DAVID GHARTEY-TAGOE)
AG. DIRECTOR GENERAL

THE AMBASSADOR,
EMBASSY OF PAKISTAN,
A C C R A.

cc: THE PNDC SECRETARY,
MINISTRY OF INFORMATION,
A C C R A.

DIRECTOR OF TELEVISION,
BROADCASTING HOUSE,
A C C R A.

احتجاجی مراسلے متعلقہ ٹی۔ وی پروگرام کے جواب میں منسٹری آف انفارمیشن گھانا کی معذرت